جولائی 2025
ماہنامہ
کرن
www.pklibrary.net

کرن

MEMBER
APNS
CPNE

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

واٹس اپ
03172266944

حمد — حافظ لدھیانوی — 7
نعت — نسیم سواتی — 7

انٹرویو

بہو سے ساس تک — ثمینہ طاہر بٹ — 8
میری بھی سنیے — سیدہ آریز احمد — 15

ناول

تاش گھر — ایمل رضا — 18

مکمل ناول

کارپ ڈائم — آمنہ بانو — 40

بانی ——— محمود بابر فیصل
نگران ——— محمود ریاض
مدیرہ ——— نادرہ خاتون
مدیرِ اعلیٰ ——— عامر محمود
نائب مدیرہ ——— شعاع عمیر
مدیرہ خصوصی ——— امت الصبوح
قانونی مشیر ——— نور الدین سرکی اینڈ کمپنی
ایڈووکیٹس اینڈ لیگل کونسلرز

ادھورے رشتے — ثنا صادق — 132
گنوا کر دل و جاں ہم — ام طیفور — 100

ناولٹ

نخلِ وفا — فرح بخاری — 76
قیس جنگل میں اکیلا ہے — منشا محسن علی — 176

افسانے

ہائے یہ بارشیں — شازیہ ستار نایاب — 35
دھند چھٹ گئی آخر — مونا نقوی — 124
انمول — طیبہ ہاشمی — 97
بھروسا — عقیلہ ہاشمی — 71

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے پرچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پہ ڈراما، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ——— 1,800 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور یورپ ——— 25000 روپے

subscriptions@khawateendigest.com

ایک چمچہ محبت، صباحت رفیق 192

مشورہ، شازیہ الطاف ہاشمی 196

کرن کتاب

بیوٹی باکس، ادارہ 199

کرن کا دسترخوان، ادارہ 200

صحت، ادارہ 201

مستقل سلسلے

کرن کرن خوشبو، شعاع عمیر 202

یادوں کے دریچے سے، بشریٰ محمود 205

موتی بکھرتے ہیں، ادارہ 206

نامے میرے نام، مدیرہ کرن 207

جولائی 2025

جلد 47 شمارہ 04

قیمت 150 روپے

کرن

37-اردو بازار کراچی

مدیرہ

اداریہ

حال ہی میں سوات میں پیش آنے والا سانحہ جس پندرہ انسانی جانیں سیلاب کی نذر ہوئیں ہماری اجتماعی بے حسی کا نوحہ ہے۔

سیلاب میں پھنسے پندرہ افراد بے بسی کی تصویر بنے مایوسی سے آسمان کو دیکھتے رہے، صوبائی حکومت کی جانب سے کوئی ہیلی کاپٹر کوئی ریسکیو ٹیم مدد کو نہ پہنچی، بڑے بڑے عہدوں پر فائز بھاری تنخواہیں اور مراعات لینے والے سرکاری افسران ایئر کنڈیشنڈ آفسوں میں آرام کرتے رہے۔

سرکاری اداروں اور بیوروکریسی نے جس کارکردگی کا مظاہرہ کیا، وہ تو اب عمومی رویہ بن چکا ہے۔ لوگ بھی اب اس کے عادی ہو چکے ہیں، دو چار احتجاج کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ وقتی طور پر کچھ افسران معطل ہوتے ہیں جو کچھ عرصہ بعد بحال ہو جاتے ہیں۔

حیران کن تو میڈیا کی بے حسی ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر آسمان سر پر اٹھا لینے والے میڈیا نے پندرہ انسانی جانوں جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے سرسری سی اہمیت دی اور پھر خاموشی۔

لوگ بھی اپنے طور پر بہت کچھ کر سکتے تھے لیکن افسوس کہ وہ بھی خاموش تماشائی بنے رہے، ویڈیو بناتے رہے ان کی آنکھوں کے سامنے پندرہ افراد دریا برد ہو گئے اور وہ تماشا دیکھتے رہے۔

یہ پہلا سانحہ نہیں، اس سے پہلے مری میں برف کے طوفان میں پھنسنے والوں کی بھی کسی نے کوئی مدد نہیں کی تھی۔ یہ بے حسی اب ہمارا اجتماعی رویہ بنتی جا رہی ہے۔

ہر سال بارشوں کے موسم میں ہزاروں افراد سیلاب کی نذر ہو جاتے ہیں لیکن تا حال حکومت اور اداروں کی طرف سے کوئی جامع پالیسی سامنے نہیں آئی۔ البتہ ٹیکس بڑی ذمہ داری سے وصول کیے جاتے ہیں اور گیس، بجلی اور پٹرول کی قیمتوں میں بھی بڑی باقاعدگی سے اضافہ ہوتا رہا ہے۔

اس شمارے میں

☆ مشہور ڈرامہ نگار "ثمینہ طاہر بٹ" کا بہو سے ساس تک کا سفر
☆ اداکار "سید آریز احمد" کہتے ہیں "میری بھی سنیے"
☆ "تاش گھر" ایمل رضا کا سلسلہ وار ناول
☆ آمنہ بانو کا مکمل ناول "کارپ ڈائم"
☆ "ادھورے رشتے" ثنا صادق کا مکمل ناول
☆ فریح بخاری کا ناولٹ "نخلِ وفا"
☆ "قیس جنگل میں اکیلا ہے" منشا محسن علی کا ناولٹ

شازیہ ستار نایاب، طیبہ ہاشمی، عقیلہ ہاشمی، صباحت رفیق، مونا نقوی اور شازیہ الطاف ہاشمی کے افسانے اور مستقل سلسلے شامل ہیں

حمد باری تعالیٰ

چمک دمک ہے ساری تیری، سب نظارے تیرے ہیں
ارض وسما میں جتنے ہیں آئینے سارے تیرے ہیں

موج ہوا میں تیری خوشبو، نغمہ نغمہ حسن تیرا
ہرے بھرے سب کھیت ہیں تیرے، سبز کنارے تیرے ہیں

گلشن گلشن، صحرا صحرا تو نے رنگ بکھیرے ہیں
تجھ سے سطح فلک ہے روشن، چاند ستارے تیرے ہیں

تیرا در ہی وجہ سکوں ہے، تو سب کا رکھوالا ہے
ہم دکھیارے، ہم بنجارے، غم کے مارے تیرے ہیں

حیرت میں عالم ہے سارا دیکھ کرشمے قدرت کے
تیرتے پھرتے ہیں جو فضا میں سب سیارے تیرے ہیں

تیرا لطف نہ ہو جو شامل سانس بھی لینا مشکل ہے
سارے کام بنائے تو نے، سارے سہارے تیرے ہیں

حمد و نعت میں تو نے ہی اس کو مضمون نئے سمجھائے ہیں
حافظ کے اشعار ہیں جتنے سب شہ پارے تیرے ہیں

حافظ لدھیانوی

نعت رسول مقبول ﷺ

کرے گی سرخرو ہمیں محبت آپ ﷺ کی
خلد میں لے جائے گی نسبت آپ ﷺ کی

پابند ہیں ہم سب اسی کی غلامی کے
جو حکم خدا ہے اور شریعت آپ ﷺ کی

معراجِ پہ بلا کے خدا نے آپ ﷺ کو
دکھائی ہے دنیا کو یوں عظمت آپ ﷺ کی

خیر البشر امام الانبیاء ورحمت دو عالم
ہے سب انبیاء سے جدا رفعت آپ ﷺ کی

ہیں سب حور و قصور جنت کے طلب گار
مجھے تو سدا رہے. چاہت آپ ﷺ کی

لاؤں وہ پاکیزہ لفظ، وہ بیاں کہاں سے
لکھوں تو بن جائے جو مدحت آپ ﷺ کی

لحد اس کی بھی منور ہو جائے گی
مل جائے نسیم کو گر شفاعت. آپ ﷺ کی

نسیم سواتی

بہو سے ساس تک کا سفر

ثمینہ طاہر بٹ

شاہین رشید

digest library.com

ثمینہ طاہر بٹ

ثمینہ طاہر بٹ کا نام رائٹرز خواتین میں نیا نہیں ہے۔ان کے لکھنے کا عمل بچپن سے جاری ہے۔ بچپن میں بچوں کی کہانیاں لکھیں۔کالج لائف میں کالم نگاری شروع کی۔شادی کے بعد گیپ آیا اور پھر باقاعدہ طور پر لکھنے کا آغاز 2012ء سے کیا اور ہر اچھے میگزین میں ان کی تحریریں شائع ہوتی ہیں۔

"2013ء میں ہی الیکٹرونک میڈیا والوں نے رابطہ کیا۔مصباح نوشین صاحبہ نے مجھے لکھنے کے لیے کہا۔پاکیزہ کی انجم انصار آپا نے بھی مجھے ڈرامہ لکھنے کے لیے کہا اور کہا کہ تم میں لکھنے کی بہت زیادہ صلاحیت ہے اور چونکہ آپ کی منظر نگاری بہت خوب صورت ہوتی ہے تو اس لیے تم کو ڈرامے کی طرف آنا چاہیے۔مصباح نوشین نے مجھے انگلی پکڑ کر ڈرامہ لکھنا سکھایا اس نے ون لائنر لکھنا سکھایا۔اسکرین پلے لکھنا سکھایا۔غرض یہ کہ میرا بہت ساتھ دیا اور یوں میں ڈراموں کی دنیا میں آ گئی۔"

یہ بات ثمینہ صاحبہ نے ایک سوال کے جواب میں بتائی۔اور انہیں اس مقام تک آنے میں کن کن مراحل سے گزرنا پڑا۔ان شاء اللہ ایک تفصیلی انٹرویو میں ان سے باتیں کریں گے۔

آج تو آپ ان کی اس سفر کی روداد سنیں جو ہر لڑکی کی زندگی میں آتا ہے۔

"کیسے مزاج ہیں؟"

"الحمدللہ۔"

"پہلے تو آپ اپنا اور اپنے میاں صاحب کا فیملی بیک گراؤنڈ بتائیں؟"

"کرن کے تمام پڑھنے والوں کو آپ کو اور باقی تمام لوگوں کو سلامتی اور بہت ساری دعائیں۔ فیملی بیک گراؤنڈ کی بات کروں تو ہم دونوں کی فیملیز ایک طرح سے مشرق اور مغرب کا فرق رکھتی ہیں۔

میرے ابو کا اپنا بزنس تھا۔ہمارے ابو کا "ڈیزل" انجن بنانے کا کارخانہ تھا بلکہ ابو ہی نہیں بلکہ ہماری پوری فیملی کا یہی بزنس تھا اور ہے۔ہمارے گھر میں سکون بہت تھا۔70 کی دہائی تھی اس زمانے میں جس کے گھر میں ٹی وی، فریج اور ٹیلی فون ہوتا تھا وہ پرتعیش گھرانہ کہلاتا تھا اور الحمدللہ جب ہم نے ہوش سنبھالا تو ہمارے گھر میں یہ سب چیزیں تھیں اور ہمارے گھر میں AC بھی لگا ہوا تھا۔

ہم پانچ بہن بھائی ہیں۔میں بڑی ہوں۔پھر مجھ سے چھوٹی ایک بہن ہے اور پھر تین بھائی ہیں۔

بہت پیار محبت کے ساتھ رہتے تھے۔ہماری امی بہت خاموش طبع تھیں بہت کم بولتی تھیں اور جتنا بھی بولتی تھیں بہت اچھا بولتی تھیں۔میری امی کا نام فہمیدہ ہے اور خاندان میں بہترین کھانا پکانے میں مشہور تھیں۔اور گھر میں کوئی آ جائے تو بغیر کھائے پیے نہیں جانے دیتے تھے۔امی ابو دونوں ہی کتابیں اور اخبارات پڑھنے کے شوقین تھیں اور ہمارے گھر میں سب اخبارات آیا کرتے تھے اور ابو ان کی ایک ایک سطر پڑھا کرتے تھے۔اور انہی کی وجہ سے ہمیں بھی پڑھنے لکھنے کا شوق ہوا۔

میاں کی سائیڈ پر آئیں تو ان کی فیملی ماشاءاللہ

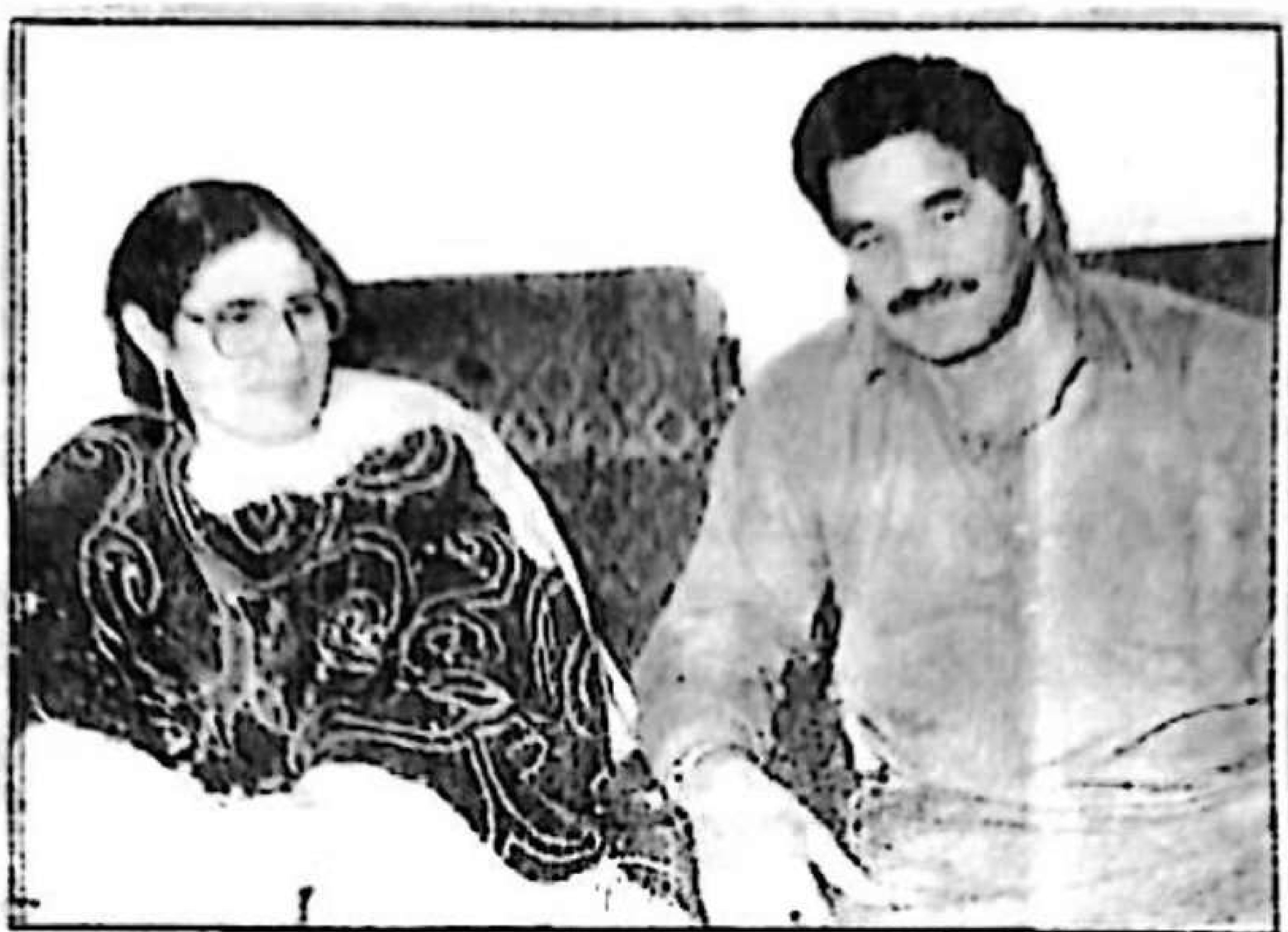

کافی بڑی ہے۔ میری ماشاء اللہ چھ نندیں ہیں اور پانچ دیور ہیں۔ ان میں ایک دیور کا انتقال ہو چکا ہے باقی ماشاء اللہ سب حیات ہیں اور بال بچے دار ہیں۔

ہم لوگ شادباغ میں رہتے تھے جو کہ لاہور کا بہترین ایریا کہلاتا تھا اور کہلاتا ہے جبکہ سسرال والے فاروق گنج میں رہتے تھے میرے سسر کا "تندور" تھا سسر کے بعد بڑا چھوٹا دیور وہاں بیٹھتا ہے اور میاں صاحب کا بزنس تھا۔ بہن بھائیوں میں میرے میاں صاحب کا دوسرا نمبر ہے اور پہلے نمبر پر بڑی نند (باجی ہیں) میاں صاحب کے بعد پانچ بہنیں اور پھر پانچ بھائی ہیں۔ پھر آپ سوچ لیں کہ کتنا فرق تھا۔ ان کی فیملی میں پڑھنے لکھنے کا بھی زیادہ رجحان نہیں تھا۔ زیادہ سے زیادہ لڑکیوں کو ایف اے کروا دیا اور پھر شادی کر دی اور میرا ایک دیور جس کا انتقال ہوا اس نے "بی کام" کیا۔ باقی بھی سب کی تعلیم واجبی ہے ہاں پانچویں نمبر کا دیور ماشاء اللہ وکیل بنا ہے وہ ہائی کورٹ کا سینئر وکیل ہے۔ آنے والی نسل میں ماشاء اللہ سارے ہی بچے بہت اچھا پڑھے۔

میری شادی کو تقریباً پینتیس سال ہو گئے ہیں ماشاء اللہ۔ اور ان پینتیس سالوں میں بہت کچھ دیکھا۔ بہت کچھ بدلا۔ اپ اینڈ ڈاؤن سیٹ آئے بہت زیادہ۔ ایک دم آسمان پر بھی گئے اور ایک دم زمین پر بھی آئے۔

میری پسند کا کوئی خاص عمل دخل نہیں تھا کیونکہ اس زمانے میں ایسا کوئی ماحول نہیں تھا۔ ہوا یہ تھا کہ میری چھوٹی بہن کی شادی بہت جلدی ہو گئی تھی۔ ہمارا گھرانہ ماشاء اللہ بہت اچھا تھا اور ہم دونوں بہنیں میٹرک میں تھیں تو ہمارے رشتے بہت آ رہے تھے۔ چھوٹی بہن ایک سال چھوٹی ہے لیکن ہماری اسکولنگ ایک ساتھ شروع ہوئی تھی۔ اور ہم میٹرک کے پیپرز دے ہی رہے تھے کہ ہمارے رشتے آنے شروع ہو گئے۔ میں نے اپنی امی کو صاف طور پر کہہ دیا تھا کہ میں نے ابھی شادی نہیں کرنی کیونکہ مجھے ابھی پڑھنا ہے۔ مجھے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ ہماری فیملی میں ایسی کوئی زور زبردستی نہیں تھی کہ لڑکیوں کو پڑھانا نہیں ہے اور بس ان کی شادی کر دینی ہے۔ اب بہن کے نصیب کو شاید زیادہ جلدی تھی کہ وہ رشتہ دیکھنے آئے تو چھوٹی بہن ایک دم سامنے آ گئی بس ان کو تو میری بہن، ہمارا گھر اتنا پسند آیا کہ انہوں نے رشتے کی بات ڈال دی اور دہلیز ہی پکڑ لی کہ ہم نے تو "ہاں" کروا کے ہی جانا ہے۔ میری بہن تھی بھی لا ابالی سی۔ پڑھنے کا شوق تھا پر جنون نہیں تھا۔ اس نے

بھی کہہ دیا کہ ہاں ثمینہ شادی نہیں کر رہی تو میری کر دو۔ بس اس کے نصیب نے اسے دھکا دیا ابو نے بھی "ہاں" کر دی۔

میٹرک کے پیپر دیتے ہی اس کی شادی ہو گئی۔ اس کے بعد اپنی شادی کے بعد پانچ سال جو اس نے گزارے ہیں وہ اللہ جانتا ہے۔ ہم جانتے ہیں یا وہ خود جانتی ہے...... اور جب میرے رشتے آتے تھے تو امی ابو شادی کا نام نہیں لیتے تھے کہ ہماری ایک بیٹی اتنی مشکل میں ہے تو ہمارا حوصلہ نہیں ہو رہا کہ ہم دوسری کی شادی کریں۔ امی تو رشتہ آنے پر رونے لگ جاتی تھیں۔

"مجھے پڑھنے کا شوق تھا۔ سو میں نے اپنی پڑھائی جاری رکھی۔ امی کا تو ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا کہ میری شادی جلدی کر دیں۔ مگر میری تعلیم بھی مکمل ہو رہی تھی۔ میں بی اے میں تھی اور پیپرز کی تیاری کر رہی تھی۔ انٹر میں نے شاد باغ کالج سے کیا کیونکہ وہ تھا ہی انٹر تک۔ گریجویشن کے لیے میں نے "دھمن آباد" کالج میں داخلہ لے لیا۔ اور جب میں تھرڈ ایئر میں تھی تو میری "آئی سائیڈ" کا کچھ مسئلہ ہو گیا اور آپریشن کروانا پڑ گیا۔ تو کالج گھر سے دور تھا تو میں نے سوچا کہ میں پرائیویٹ ہی گریجویشن کر لوں گی۔ امی نے مجھے ٹیوشن رکھوا دی ٹیوشن کے لیے بھی ابو کے دوست تھے اور گلی میں ہی ان کا گھر تھا۔ تایا جی کے بیٹے اور ان کی بہو نے گھر میں ہی ٹیوشن سینٹر کھولا ہوا تھا اس وقت اکیڈمیز تو ہوتی نہیں تھیں تو میں بھائی جان سے ٹیوشن پڑھنے جایا کرتی تھی اور ماشاء اللہ بہت اچھا ٹیوشن سینٹر تھا۔ میں تو سارے کام اپنی دھن میں کیا کرتی تھی۔

باجی کے سسر (نند) میرے ابو کے دوست تھے۔ ایک ہی مسجد میں جاتے تھے ابو مسجد کے منتظم تھے اور دوست منتظم اعلیٰ میں سے تھے۔ ان کے بیٹے کی شادی تھی اور ہم بھی اس شادی میں مدعو تھے۔ وہاں پہ امی نے (ساس) مجھے دیکھا۔ میری چھوٹی (نند) جو کہ میرے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی اس کے سسر بھی ہماری فیملی فرینڈز میں تھے۔ تو ان کے گھر کے فنکشن میں میں باقاعدہ گئی تھی تو وہاں مجھے امی نے (ساس) اور باجی (نند) نے مجھے دیکھا اور میں انہیں بہت پسند آئی تو باجی نے امی سے کہا کہ "چاچے سودے دی دھی کسی ویکھی نہئی سی" (میرے ابو کا نام مقصود احمد بٹ تھا اور سب انہیں سودہ کہتے تھے) تو انہوں نے کہا کہ ہاں دیکھی تھی، پیاری ہے مجھے ان کے گھر لے چلو...... اور جب وہ ہمارے گھر آئیں تو میں ٹیوشن جا رہی تھی۔ تو وہ جب ہمارے گھر آئے تو امی یہی سمجھیں ایسے ہی آئی ہوں گی ملنے۔

میں تو سلام کر کے ٹیوشن کے لیے چلی گئی۔ رشتے تو آتے رہتے تھے، امی زیادہ بتاتی نہیں تھیں کہ وہ چھوٹی بہن کی وجہ سے ڈری ہوئی تھیں۔ تو انہوں نے رشتے کی بات ڈالی کیونکہ انہیں ہم ہر لحاظ سے بہت پسند آئے تھے اور میں تو شادی کے لیے ذہنی طور پر تیار ہی نہیں تھی اور امی بھی بڑی فیملی کی وجہ سے رشتہ کرنے سے گھبرا رہی تھیں۔ مگر ابو کہتے تھے کہ لڑکے کی اپنی مل ہے کی" تو ابو کہتے تھے کہ کوئی برائی نہیں ہے رشتہ کرنے میں۔ جیسا کہ میں نے بتایا امی بڑی فیملی سے گھبرا رہی تھیں کہ چھ نندیں چھ دیور، امی ابو اور پھر ہر وقت رشتے داروں کا آنا جانا...... ابو اس لیے اس رشتے پر راضی تھے کہ میرے ابو کے دوستوں کے گھر بڑی باجی (نند) بیاہی ہوئی تھیں اور دوسری دو نندیں بھی ہمارے رشتے داروں کے گھر بیاہی ہوئی تھیں۔ تو خاندان میں ان کی شادیوں کی وجہ سے بھی ابو کو بڑا حوصلہ تھا کہ اگر خدانخواستہ کوئی مسئلہ ہوا تو ان کی بیٹیاں بھی تو ہماری طرف ہیں نا ...... تو۔

تو بس پھر اللہ کا نام لے کر منگنی ہو گئی میری۔ اور میں نے اپنی شادی کی کسی شاپنگ میں حصہ نہیں لیا۔ کسی چیز میں میری کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ مجھے پڑھنے کا شوق تھا کتابیں ہوتی تھیں اور میں ہوتی تھی اور گھر کے کسی کونے میں بیٹھ کر پڑھ رہی ہوتی تھی۔ سب کہتے کہ تم حصہ کیوں نہیں لیتیں۔ پر کیا کرتی ہر

وقت ڈری ڈری سی رہتی تھی۔
منگنی اور شادی کے دوران سال ڈیڑھ سال کا وقفہ رہا۔ اور وہ بھی اس لیے کہ امی کا دل نہیں مان رہا تھا لیکن ابو نے اور خاندان والوں نے بہت پریشر ڈالا کہ تم راضی ہو جاؤ۔ ہر لحاظ سے سب پرفیکٹ ہے۔ تو امی بھی مان گئیں۔ لیکن میں یہاں ایک بات ضرور کہنا چاہوں گی کہ بیٹیاں بیاہیں یا بیٹے، گھر کا ماحول اور عادات و اطوار اور وسائل کو بہت زیادہ اہمیت دینی چاہیے۔ اگر آپ بیٹی بیاہ رہے ہیں تو آپ کو پتا ہونا چاہیے کہ جہاں آپ بیٹی دے رہے ہیں ان کے گھر کا ماحول کیسا ہے۔ بے شک آپ کے لیول کا نہ ہو لیکن اتنا بھی مختلف نہ ہو کہ بچیاں سہم جائیں اور ان کے ہنسنے بولنے اور چہکنے کی حس ہی ختم ہو جائے۔

میری منگنی کے بعد میرے سسرال والے آتے تھے اور امی لوگ بھی جاتے تھے۔ میرے سسرال کا تین منزلہ گھر تھا اور نیچے والے پورشن میں ڈرائنگ روم تھا۔ تو امی لوگ میں یہ عادت تھی کہ وہ ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھتے تھے اور ڈرائنگ روم سے ہی اٹھ کر آ جاتے تھے۔ نہ انہوں نے اوپر جا کر گھر دیکھا نہ نیچے کا گھر دیکھا۔ کچھ بھی نہ دیکھا۔ جبکہ ہمارا گھر ڈبل اسٹوری تھا اور زیادہ ایریا نیچے کور تھا۔ میری امی کا گھر تیرہ (13) مرلے کا تھا اور بہت بڑا تھا۔ ہمارے ڈرائنگ روم کا ایک دروازہ گلی میں کھلتا تھا جہاں سے ابو کے دوست وغیرہ آتے تھے اور دوسرے دروازے سے بہت ہی خاص لوگ آتے تھے۔ تو جب یہ لوگ آتے تو سارا گھر دیکھتے تھے۔
ہمارے گھر میں بیک وقت چار میڈز ہوتی تھیں جو امی کی مددگار ہوتی تھیں۔ امی کو کوکنگ کا بھی بہت شوق تھا تو یہ ہماری بچپن کی میڈز (خالائیں) امی کی ہیلپ کرتی تھیں اور ماشاء اللہ گھر میں کافی رونق رہتی تھی جبکہ میرے سسرال میں ایسا کچھ نہیں تھا۔ اور امی لوگوں نے اس بات کو بھی نوٹ نہیں کیا۔ تو شاید اس لیے کہ جہاں چھ بہنیں ہوں گی (جوان) وہاں میڈ کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔ تو سارا کام ساری بہنیں مل کر کیا کرتی تھیں۔ میڈ کی طرف انہوں نے بھی توجہ ہی نہیں دی۔ لیکن میرے میاں صاحب بتاتے تھے کہ جب امی لوگ آپ کے گھر سے آئی تھیں تو سب کو بتاتی تھیں کہ "میری نوں دے گھر تے چار چار کم والیاں لگیاں ہوئی نے تے لگدا اے کہ میری نوں نے کدی خود پانی دا گلاس وی نئیں چکیا ہوئے گا (میری بہو کے گھر تو چار چار کام والی ماسیاں ہیں اور مجھے لگتا ہے کہ میری بہو نے تو کبھی خود سے پانی کا گلاس بھی نہیں اٹھایا ہوگا)۔
تو میاں صاحب بتاتے ہیں کہ میں نے ایک دن گھبرا کے کہا کہ "امی ہمارے گھر میں تو ایک بھی کام والی نہیں ہے اور آپ ایسی لڑکی لے کر آ رہی ہیں جس نے خود ہل کر پانی بھی نہیں پیا ہوگا۔ تو کیسے گزارا ہوگا۔ تو امی نے کہا" لے کی ہو گیا میں آپ اودے کام کراں گیں اور انہوں وکھری کم والی رکھا دیاں گیں" (تو کیا ہو گیا میں خود اس کے کام کیا کروں گی اور اسے علیحدہ سے کام والی بھی رکھوا دوں گی) تو کہنے لگے کہ میں چپ ہو گیا کہ کہہ رہی ہیں تو کر بھی دیں گی خیر یہ سب زبانی کلامی باتیں تھیں۔
اور پھر جب ہماری شادی کے دن قریب آئے تو میری اور میری چوتھے نمبر والی نند کی شادی ایک ساتھ طے ہونے پائی۔ وہ کالج میں میرے ساتھ تھی اور مجھ سے ایک سال سینئر تھی۔ اور پانچویں نمبر والی بھی ایک سال سینئر تھی۔ خیر میرے بی اے کے امتحانات کی ڈیٹ شیٹ آ گئی تھی یا شاید آنے والی تھی اور میں پیپرز کی تیاری کر رہی تھی تو میرا دیور (جس کا انتقال ہوا) وہ مٹھائی لے کر آیا اور کہنے لگا کہ "پوما "باجی (ویسے نام شائلہ ہے) کی شادی کی ڈیٹ فکس ہو گئی ہے اور دس نومبر ان کی بارات کا دن ہے اور امی کہہ رہی ہیں کہ نو نومبر کو آپ کی شادی ہے۔
اب میری امی بھی ہکا بکا اور میں بھی پریشان...... اور میرے گھر والوں نے مان بھی لیا۔ میں حیران کہ کوئی مشورہ بھی نہیں لیا اور خود ہی خود ڈیٹ فکس کر لی۔ پھر

امی ابو گئے اور بات کی کہ آپ ہمیں بھی بلا لیتے تو کہنے لگیں میری ساس کہ وہ لوگ اچانک آ گئے تھے۔ ابو نے کہا کہ ہماری بھی بیٹی ہے ہم سے بھی مشورہ کر لیتے۔ اس پر میرے سسر نے (جو کہ بہت ہی اچھے انسان تھے) کہا کہ میں نے کہا تھا لیکن چلیں کوئی بات نہیں اب تو جو ہونا تھا ہو گیا۔ اس سے پہلے میرے دیور جو کہ مٹھائی دینے آیا تھا اس نے کہا کہ امی کہہ رہی تھیں کہ ہم "دن رکھنے" آئیں گے اپنے پورے خاندان کے ساتھ۔ اور پھر جس دن یہ دن رکھنے آئے میرے ابو نے دیگیں پکوائیں۔ جوڑے (سوٹ) بنوائے، ساری رسمیں کیں اور بڑے اچھے سے دن مقرر ہو گیا۔

پانچ سال قبل میری بہن کی شادی دھوم دھام سے ہوئی تھی اور اب پانچ سال بعد میری بھی اسی دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ میرا جہیز بہت زیادہ تھا اور تین بڑی ٹرالیاں بھر کے میرا جہیز گیا تھا اور پورا محلہ بھی اور میرا سسرال بھی حیران و پریشان کہ اتنا جہیز ہے! ماشاء اللہ۔ میں سمجھتی ہوں کہ بیٹیوں کے نصیب جہیز سے نہیں جڑے ہوئے ہوتے بلکہ قسمت اچھی ہونی چاہیے اور ماں باپ کو بھی اچھے نصیب کی دعا کرنی چاہیے اور میری دعا ہے کہ سب بچیوں کے نصیب اچھے ہوں۔

بہر حال شادی ہو گئی۔ بہت دھوم دھام سے ہو گئی ادھر کے بعد اور ادھر کے بھی ارمان پورے ہوئے۔ ہمارا ولیمہ تھا اور نند کی بارات تھی۔

منگنی اور شادی کے دوران میری کبھی طاہر صاحب سے بات نہیں ہوئی اور نہ ہی ملاقات ہوئی۔ بس میری نندیں آتی تھیں تو اپنے بھائی کی ہی باتیں کرتی تھیں اور مجھے ڈراتی ہی رہتی تھیں کہ بھائی کو غصہ بہت آتا ہے۔ بھائی جان کو یہ نہیں پسند، وہ نہیں پسند، ان کے کپڑے پہلے سے استری کر کے رکھنے ہوتے ہیں، انہوں نے کبھی مجھ سے نہیں پوچھا تھا کہ آپ کو کیا پسند ہے اور کیا نہیں پسند...... بھائی جان کی پسند ناپسند اور ان کی باتیں کر کے چلی جایا کرتی تھیں۔

شادی کے وقت بہت لڑکیاں بلکہ سب ہی لڑکیاں بہت ارمان لے کر جاتی ہیں۔ اور میرے دل میں ارمان سے زیادہ خوف تھا۔ ایک تو بڑی فیملی پھر ہر وقت بھائی جان کے ڈراوے۔ تو سچ میں میں بہت ڈری ہوئی تھی۔ اور میاں صاحب نے میرے ڈر میں مزید اضافہ اس طرح کیا کہ وہ رات کے تقریباً دو یا تین بجے کمرے میں آئے۔ نیچے ڈرائنگ روم کے صوفے پر وہ سو چکے تھے اور میں اوپر تیسری منزل میں اپنے کمرے میں ان کا انتظار کر رہی تھی۔ بڑی باجی نے ہی ان کو اٹھایا کہ جاؤ اپنے کمرے میں تم یہاں نیچے کیا کر رہے ہو۔ باجی بس کسی کام سے نیچے آئی تھیں تو انہوں نے میاں صاحب کو سوتے دیکھا۔ کہ "طاری سو رہا تھا اور مجھے بڑا غصہ آیا کہ یہ یہاں کیوں سو رہا ہے جبکہ دلہن اوپر اکیلی بیٹھی ہے۔"

اور جب یہ اوپر آئے...... تو کیا بتاؤں......! کوئی ایکسائیٹمنٹ نہیں اور افسانوں اور ناولوں میں پڑھتے تھے کہ "حسن کے قلابے ملانا، تم بہت حسین ہو، زندگی بھر کا ساتھ نبھانے کے لیے وعدے وعید کرنا۔ ایسا کچھ نہیں تھا، "ٹوٹل ڈیفرنٹ" میں نے کہا کہ میری زندگی میں بڑے بڑے چھیے (زخم) آئے ہوئے ہیں۔ ان پر سے "کھرنٹ" اتر رہے ہیں۔ انہوں نے آتے ہی جو پہلی بات کی وہ یہ کہ میری ماں کا خیال رکھنا میری بہنوں کا خیال رکھنا۔ میں نے زندگی میں عورت کا کوئی تیسرا روپ نہیں دیکھا صرف ماں اور بہن کا روپ دیکھا ہے۔ میں گھر کا بڑا ہوں اور میری ماں نے مجھے یہ سکھایا ہے کہ جس طرح یہ تمہاری چھ بہنیں ہیں اسی طرح دنیا کی ہر لڑکی تمہاری بہن ہے اور ہر عورت تمہاری "ماں" ہے۔

ویسے اس میں کوئی شک نہیں کہ میرے میاں بہت شریف انسان ہیں۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ان میں کوئی غلط عادت نہیں ہے۔ کوئی بری

عادت نہیں۔ اخلاقی طور پر بہت بلند انسان ہیں۔ الحمد للہ میرے دیور بھی ایسے ہی ہیں اور الحمد للہ میرے بھائی بھی ایسے ہی ہیں۔

پھر انہوں نے ڈھیر ساری باتیں کیں تو میں تو پہلے ہی ڈری ہوئی تھی میں اور ڈر گئی۔ اور مجھ سے کچھ بولا ہی نہیں جا رہا تھا میرا تو گلا ہی خشک ہو گیا۔ تو انہوں نے کہا کہ تم بات کیوں نہیں کر رہیں۔ میں کیا بات کرتی میں چپ رہی۔ پھر کہنے لگے تم تھک گئی ہو گی، اتنا بھاری جوڑا پہننا ہے جاؤ چینج کر لو۔ "تمہیں دیکھ کر تو مجھے الجھن ہو رہی ہے۔

اس زمانے میں پارلر کا زیادہ ٹرینڈ نہیں تھا اور میں گلبرگ [illegible] پارلر سے جو کہ ایک چائینز پارلر تھا تیار ہو کر آئی [illegible] چرچا ہوا کہ دلہن گلبرگ کے پارلر سے سج کر آئی ہے۔ خیر میں اپنا میک اپ اتار کر اور کپڑے چینج کر کے واش روم سے باہر آئی تو "یہ" سو چکے تھے۔ میں بھی سو گئی۔

اگلے دن بہن (نند) کی بارات تھی اور ہمارا ولیمہ...... ولیمے کے بعد ہم اپنی امی کی طرف چلے گئے۔ اگلے دن بہن کا ولیمہ تھا...... ولیمے کے بعد وہ بھی اپنی امی کے گھر چلی گئی۔ اور پھر تین دن کے بعد مکلاوہ لینے آنا تھا تو میں تین دن کے بعد اپنے شوہر کی ساتھ گئی اپنے سسرال اور پھر میں امی (اپنی) کے گھر آٹھ دن رہی۔ کیوں رہی مجھے نہیں معلوم۔ کیونکہ ہمارے یہاں ایسا نہیں ہوتا تھا۔"

"شادی والے خواب تو پورے نہ ہوئے ہوں گے؟"

"میں نے شادی سے پہلے ایسے کوئی خواب سجائے ہی نہیں تھے۔ مجھے تو بس یہی لگن تھی کہ میرے ہاتھ میں ڈگری آ جائے سسرال والے ڈراتے رہے اور میں اور میری امی ڈرتے رہے پر شادی ہونی تھی سو ہو گئی۔ سسرال کا نیا ماحول، نئی باتیں مجھے تو خاموشی میں رہنے کی عادت تھی۔ کیونکہ بہن کی شادی ہو گئی تھی۔ بھائی کالج چلے جاتے تھے تو امی ابو اور میں گھر پر ہوتے تھے بلکہ ابو بھی کام پر چلے جاتے تھے...... اور جب میں سسرال میں آئی تو ماشاءاللہ کافی بڑی فیملی تھی۔ ہر ویک اینڈ پہ نندیں آ جاتی تھیں۔ بڑی باجی تو ہر ویک اینڈ پہ آتی تھیں اور کہتی تھیں کہ میں آٹھ دن کے بعد اپنی امی کو دیکھوں اور بہن بھائیوں سے نہ ملوں تو مجھے اختلاج ہونے لگتا ہے۔ پھر بڑی باجی کی بیٹی جو ہمارے خاندان کی پہلی بیٹی تھی اسے میرے میاں صاحب نے اپنی بیٹی بنایا ہوا تھا تو مجھے وہ پیاری لگتی تھی کہ مجھے بچوں سے پیار تھا۔

شادی کے شروع دنوں میں تو ایڈجسٹ ہونے میں وقت لگتا ہے کم سے کم ایک سال تو لگ ہی جاتا ہے خواہ باہر کے لوگ ہوں یا رشتے دار۔ اب میری بیٹی کی شادی میں نے اپنے بھانجے سے کی ہے، ان کے گھر اور ہمارے گھر کا ماحول بھی بہت مختلف ہے اس کی شادی کو دو سال ہو گئے ہیں اور ایک گھر سے دوسرے گھر میں ایڈجسٹ ہونا مشکل [illegible] پھر وہ تو ملک سے باہر گئی ہے۔ اللہ کا شکر [illegible] ہے۔

شادی کے [illegible] بہت اچھے گزرے......

اور میری یہ عادت ہے [illegible] غصہ آئے تو میں خاموش ہو جاتی ہوں اور اب [illegible] ہے۔

میری ساس بہت اسٹرونگ خاتون [illegible] اسٹرونگ نروز (اعصاب) والی جی دار خاتون تھیں۔ انہیں اپنے بیٹوں سے پیار تھا تو بہوؤں سے بھی پیار کرتی تھیں۔ کیونکہ بیٹے منت مرادوں سے ملے تھے۔

شادی کے تین ماہ کے بعد میرے میاں کے بزنس میں کچھ جھگڑا ہوا۔ اور سمجھ لیں کہ وہ کرائسس کی شروعات تھی۔ اور میری طرف سے کوئی خوش خبری بھی نہیں آئی تھی اور میرے ساتھ شادی کر کے جانے والی نند کی خوش خبری آ گئی تھی تو ساری توجہ مجھ پر کہ تم نے ابھی تک کیوں نہیں خوش خبری سنائی، اب میں اور زیادہ پریشان۔ بھلا میرے اختیار میں کیا تھا۔ بیٹے کو کوئی کچھ نہیں کہہ

digestlibrary.com

رہا تھا۔ اس دوران پیپرز کی بھی ڈیٹ آ گئی اور میری امتحان ہو رہی تھی کہ میں پیپرز کی بات کروں۔ میاں سے بات کی تو کہنے لگے کہ خاموش ہو جاؤ۔ پہلے ہی بہت پھڈے چل رہے ہیں ایسا نہ ہو کہ توپوں کا رخ تمہاری طرف ہو جائے۔ پیپرز دینے کا دوسرا چانس بھی مس ہو گیا... اور الحمدللہ تین ساڑھے تین ماہ کے بعد میری طرف سے خوش خبری بھی آ گئی۔ لیکن خوش خبری آنے کے بعد میاں صاحب کے بزنس کے کرائسس مزید بڑھ گئے اور ''مل'' بند ہو گئی اب توپوں کا رخ میری طرف ہو گیا کہ یہ تو ''منحوس'' ہے اس کی وجہ سے سب کچھ ہوا ہے اور پھر نہ جانے کیا کیا کہا گیا مجھے...... جبکہ میں اپنی فیملی کی وہ لڑکی تھی جو پورے خاندان کی جان ہوا کرتی تھی، بچے بڑے سب میرے گرویدہ تھے۔ جبکہ سسرال میں سب کچھ الٹ ہوا۔ مجھے آگے سے جواب دینے کی عادت نہیں تھی۔ میری جگہ اگر کوئی اور لڑکی ہوتی تو دو ماہ بعد ہی چھوڑ چھاڑ کر میکے بیٹھ گئی ہوتی...... مگر میں نے ایسا اس لیے نہیں کیا کہ ایک تو ہماری تربیت ایسی نہیں تھی اور دوسری بات یہ کہ میری بہن جس کی پانچ سال پہلے شادی ہوئی تھی اس نے بہت مشکلات اٹھائی تھیں اور اٹھا رہی تھی تو میں نہیں چاہتی تھی کہ میرے والدین میری وجہ سے بھی پریشان ہوں۔ پھر میرا خیال تھا کہ میں اپنی بہن سے بہتر ہوں۔ بولنے کی عادت پہلے ہی نہیں تھی۔ میں مزید خاموش ہو گئی۔

خیر میری ایک بار پھر امتحانات کی ڈیٹ شیٹ آ گئی دو بار کینسل کرا چکی تھی۔ تیسری بار نا ممکن تھا۔ میری امی میری ڈیٹ شیٹ لے کر آ گئیں کہ یہ آخری چانس ہے اس کو امتحان دینے دیں تاکہ اس کے پاس ڈگری ہو جائے۔ اس وقت تو کوئی کچھ نہیں بولا۔ البتہ بعد میں عدالت لگتی تھی ہمیشہ کی طرح ہمارے گھر میں۔ میاں صاحب کام پر ہوتے تھے تو انہیں کام سے بلایا جاتا تھا اور سارا ماجرا ان کے سامنے رکھا جاتا تھا اور آخری فیصلہ امی اور بڑی باجی کرتی تھیں۔ البتہ ابو میری ہی سائیڈ (سسر) لیا کرتے تھے۔ ابو نے بھی میری حمایت کی اور بڑی باجی نے بھی ...... میاں صاحب نے کہا کہ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ چھوڑ کر آؤں، لے کر آؤں، اتفاق سے میرا دیور (مرحوم) اس کا پیپر اور میرے پیپر ایک ساتھ ہی تھے۔ وہ بڑا خوش خوش اپنا بتانے آیا تو آگے دیکھا تو عدالت لگی ہوئی تھی اس نے پوچھا۔ ''یہ سب کیا ہو رہا ہے۔''

میری رول نمبر سلپ اور ڈیٹ شیٹ سامنے ہی پڑی ہوئی تھی اور میں رو رہی تھی۔ اس نے کہا کہ آپ کو کیا ہوا ہے بھابھی، آپ کیوں رو رہی ہیں؟ میں نے کہا کچھ نہیں اور اپنی چیزیں اٹھائیں اور باہر چلی گئی۔ باجی نے اسے ساری روداد بتائی اور کہا کہ امی اور طاری اجازت نہیں دے رہے۔ وہ ایک دم کھڑا ہو گیا اور کہا کہ یہ کیا بات ہوئی۔ امی آپ کو اجازت دینی چاہیے اور بھائی جان آپ کو تو فخر ہونا چاہیے کہ آپ کی بیوی اتنی پڑھی لکھی ہوں گی۔ بی اے کی ڈگری کوئی معمولی بات نہیں ہے میاں صاحب نے کہا کہ ''مجھے ٹائم کا ایشو ہے'' اسے اس کے گھر (میکے) بھیج دو۔ تب دیور نے کہا کہ ہم دونوں کا سینٹر ایک ہی علاقے میں ہے۔ میں بھابھی کو لے جاؤں گا۔ امی نے بہت کہا کہ اس حالت میں کیسے جائے گی وغیرہ۔ تب دیور نے کہا کہ پھر میں بھی پیپرز نہیں دوں گا۔ تب مجھے اجازت ملی۔ اور میں اس کی زندگی میں بھی اور زندگی کے بعد بھی ہمیشہ اس کی احسان مند رہی اور رہوں گی۔''

''قارئین ثمینہ طاہر بٹ کا ابھی ''بہو سے ساس تک کا سفر'' ختم نہیں ہوا۔ آگے کا حال آپ ان شاء اللہ آئندہ ماہ پڑھیے گا۔

☆☆

(باقی آئندہ)

سیّد آریز احمد

شاہین رشید

1 ”میرا تعارف۔ ۔ ۔!“

”میرا پورا نام سید آریز احمد ہے، پیار سے مجھے ”اجی“ کہتے ہیں۔ 7 نومبر 1991ء میں دنیا میں آیا۔ پل بڑھ کر چھ فٹ کا ہوا۔ پنجابی ہماری مادری زبان ہے۔ ہم چھ بہن بھائی ہیں۔ میرا نمبر آخری ہے۔ اور ہاں تعلیم بی ایس سی ہے اور شادی کے بارے میں تو آپ سب کو معلوم ہی ہے۔ الحمد للہ شادی شدہ ہوں۔ حبا بخاری شریک حیات ہے۔“

2 ”ٹی وی پہ آمد......!“

”کالج کے زمانے میں ایک ”تھیٹر پلے“ کیا تھا۔ لوگوں نے تعریف کی تو سوچا فیلڈ اچھی ہے یہی کرلو......سو کرلیا۔“

3 ”مشکلات......!“

”نہیں نہیں...... کوئی مشکلات نہیں ہوئیں پرسنٹی اچھی تھی، پھر تھیٹر پڑھا بھی تھا۔ سو چا جب تھیٹر کر سکتا ہوں تو ٹی وی بھی کرلوں گا۔ آڈیشن دیے ......اللہ نے کامیابیاں دینی شروع کردیں۔“

4 ”گھر والوں کی سپورٹ......!“

”بہت زیادہ...... تب ہی تو کامیابیاں ملیں۔ ورنہ اس فیلڈ میں قدم جمانا مشکل ہے۔“

5 ”فری ہنڈ دیا......!“

”گھر والوں نے۔ انہیں اندازہ تھا کہ اس کام میں کوئی ٹائم مقرر نہیں ہے۔ گھر آنے میں کبھی دیر تو کبھی سویر...... تو کچھ نہیں کہتے تھے۔“

6 ”پہلا ڈرامہ......!“

”وجود زن۔“

7 ”وجہ شہرت......!“

”بھولی بانو“ بہت مقبول ہوا تھا۔“

8 ”کیا کمایا پہلی بار......!“

”دس ہزار...... پہلی کمائی تھی اور خود ہی اپنے اوپر خرچ کی۔“

9 ”شوبز کے علاوہ مصروفیات......!“

”فی الحال شوبز ہی ہے اور یہ بھی کسی جاب سے کم تو نہیں ہے۔“

10 ”صبح سویرے کیا چاہیے ہوتا ہے کافی یا چائے ......!“

”چائے...... چائے تو پھر چائے ہے۔“

11 ”قوت برداشت ......!“

"بہت ہے الحمد للہ...... غصہ بھی بھوک بھی، انتظار بھی...... سب برداشت کر لیتا ہوں۔"

12 "ایک اداکار پاکستان کے لیے کیا کر سکتا ہے......!"

"ایک اکیلا انسان کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ بس سوچ ہی سکتا ہوں۔ بس اپنے لیے خواہش ہے کہ بین الاقوامی سطح پر اپنے آپ کو منوالوں...... بس مجھے اپنا کام ایمانداری سے کرنا ہے۔"

13 "فارغ اوقات کیسے گزرتے ہیں......!"

"مجھے مطالعہ کا شوق ہے اور فلمیں دیکھنے کا...... بس اسی میں میرا فارغ وقت گزرتا ہے۔ اب تو خیر اتنی مصروفیات ہو گئی ہیں کہ فارغ وقت ملتا ہی نہیں ہے۔"

14 "خوش ہونے کے لیے کیا کرنا چاہیے......!"

"خوش ہونے کے لیے "بے حس" ہونا پڑتا ہے۔ کم سے کم میں نے تو آج کل یہی پالیسی اختیار کی ہوئی ہے۔"

15 "آج کل میرا آن ایئر ڈرامہ ......!"

"راجا رانی۔"

16 "جب شوبز میں آیا تو......!"

ہنستے ہوئے۔ "تو کیمرے کا سامنا کرتے ہوئے ٹانگیں کپکپا رہی تھیں۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔"

17 "آج کل کیا کیفیت ہوتی ہے......!"

"آج کل بھی کچھ ایسا ہی حال ہے۔ کسی نئے سیریل کا پہلا سین ہو، پہلا دن ہو، کیمرا آن ہونے سے پہلے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے۔"

18 "کون سا کھیل پسند ہے......!"

"کرکٹ...... اٹھارہ سال کی عمر تک کرکٹ کھیلا اور بھرپور کھیلا اور کراچی لیول تک کھیلا۔"

19 "کیوں چھوڑی کرکٹ......!"

"کیونکہ پڑھائی میں رزلٹ برا آیا تھا۔"

20 "کچھ واپس ملنے کا موقع ملے زندگی میں تو......!"

"تو دوبارہ کرکٹ کھیلوں گا اور پھر کبھی نہیں چھوڑوں گا۔"

21 "بہن بھائیوں میں لاڈلا کون رہا......!"

"چونکہ میں چھوٹا تھا اس لیے لاڈلا رہا، شرارتیں بھی بہت کیں۔ مگر میری شکایت کبھی گھر تک نہیں پہنچی اس لیے میری شرارتوں کا کسی کو پتا ہی نہیں چلتا تھا۔"

22 "جو فیصلہ کرتا ہوں......!"

ہنستے ہوئے۔ "اکثر فیصلے غلط ثابت ہوتے ہیں۔"

23 "کیا اچھا کھانے کے لیے اچھا پکانا ضروری ہے......!"

"ہاں اچھا کھانے کے لیے اچھا پکانا بھی آنا چاہیے۔ مگر یہ بہت ضروری بھی نہیں ہے۔ مگر مجھے کھانا پکانے سے لگاؤ ہے میں اچھا کھانا پکانا جانتا بھی ہوں اور مزید سیکھ بھی رہا ہوں۔"

24 "کوئی خواہش جو ادھوری رہ گئی ......!"

"جی کرکٹر بننے کی خواہش۔"

25 "کس کے لیے زندہ رہنے کی دعا کرتا ہوں......!"

"اپنے لیے۔"

26 "نصیحتیں سنتا ہوں......!"

"ہاں سنتا ہوں۔ مگر یاد نہیں رکھ پاتا۔ ہاں زندگی میں پیش آنے والے تجربات ضرور یاد رہ جاتے ہیں۔"

27 "ایک کھانا جس کے لیے انکار نہیں کر سکتا......!"

"دال چاول اور اس کے دیگر لوازمات۔"

28 "چائے کے ساتھ کیا کھانے کو دل چاہتا ہے......!"

"بسکٹ اور کچھ نہیں۔"

29 "اپنا ڈرامہ دیکھ کر سوچتا ہوں......!"

"کس نے کام دے دیا اس لڑکے کو...... ہاہاہا۔"

30 "پاکستان میں کیا چیز فری ملنی چاہیے......!"

"تعلیم...... یہی ضروری ہے۔"

31 "جو دل سے اتر جائے......!"

"اس کے لیے کم سے کم میرے پاس تو کوئی راستہ نہیں ہے، جو اتر گیا سو اتر گیا۔"

32 "علاج کرانے کو ترجیح دیتا ہوں ڈاکٹر، حکیم یا ہومیو پیتھک......!"

"ڈاکٹر...... جلدی ریلیف مل جاتا ہے۔"

33 "پہلی فلم جو سینما میں دیکھی......!"

"The Mummy۔"

34 "کبھی برا وقت گزارا......!"

"بہت رول سموسہ اور چائے پر گزارا کرتا تھا۔ اتنا برا ٹائم دیکھا۔ مگر برے ٹائم کے بعد جب اچھا ٹائم آتا ہے تو اس کی خوشی ہی کچھ اور ہوتی ہے۔"

35 "ٹریفک کا برا نظام......!"

"ویسے تو سارا نظام ہی برا ہے مگر سگنل توڑنے والے مجھے بہت برے لگتے ہیں۔"

36 "اگر ملک سے باہر جاب کی آفر ہو تو......!"

"دلچسپ بات بتاؤں۔ جاب کی آفر بھی آئی تھی اور رشتہ کی بھی...... دونوں کے لیے انکار کر دیا۔"

37 "غصہ میں کیفیت......!"

"عموماً خاموش ہو جاتا ہوں۔ جبکہ زیادہ غصہ میں اپنے آپ کو ہی نقصان پہنچاتا ہوں۔"

38 "بچپن میں کون سا ٹی وی پروگرام شوق سے دیکھتا تھا......!"

"مجھے بچپن میں مستنصر حسین تارڑ کا مارننگ شو بہت پسند تھا۔ اور جب وہ پروگرام کے آخر میں "خدا حافظ" کرتے تھے تو مجھے بہت رونا آتا تھا کہ پروگرام اتنی جلدی ختم کیوں ہو گیا۔"

39 "آج کل کے مارننگ شو......!"

"بس رہنے دیں۔ زمانے زمانے کا فرق ہے۔"

40 "ماضی یاد آتا ہے......!"

"بالکل آتا ہے اور سوچتا بھی ہوں...... اور سیکھتا بھی ہوں۔ لیکن ماضی میں رہتا نہیں ہوں۔"

41 "نیند سے محبت......!"

"کوئی خاص نہیں...... صرف صحت کے لیے ضروری ہے اس کے علاوہ نیند سے زیادہ لگاؤ نہیں ہے۔"

42 "گھر کے کس کونے میں کھانا کھانے کا مزا آتا ہے......!"

"میرا ایک "صوفہ" ہے وہاں ہی کھانا کھاتا ہوں۔ مجھے اچھا لگتا ہے۔"

43 "پہلی بار کب موبائل یوز کیا......!"

"جب میں 9th اسٹینڈرڈ میں تھا۔ تب مجھے موبائل استعمال کرنے کی اجازت ملی تھی۔"

44 "پسندیدہ تہوار......!"

"عیدالفطر...... (چھوٹی عید)"

45 "کبھی چپکے چپکے دوسروں کی باتیں سنیں......!"

"بچپن میں بہت سنتا تھا اور اب بھی موقع ملے تو سن لیتا ہوں۔"

46 "بچت کرتا ہوں......!"

"بچت...... نہیں جی...... بچت نہیں ہوتی۔"

47 "دل اور دماغ میں سے کس سے کام لیتے ہیں......!"

"صرف اور صرف دل کی مانتا ہوں۔"

48 "آپ کے ڈراموں کی تعداد......!"

"اب تو کافی ہوگئی ہے ماشاءاللہ سے۔"

49 "ٹی وی کے کون سے پروگرام بند ہو جانے چاہئیں......!"

"کرنٹ افیئرز کے اور دیگر کچھ پروگرام ہیں۔"

☆☆

Digest
Novels
Lovers
Group ❤❤

ایمن رضا

تماش گر

پچھلی قسط کا خلاصہ

ایمن سانول کے کمرے کی صفائی کر رہی ہوتی ہے کہ رحبانی اس سے آکر سانول کے بارے میں پوچھتا ہے۔

ایمن رحبانی سے کہتی ہے کہ سانول باریشہ سے ملنے حویلیاں گیا ہے، وہ اسے چاہنے لگا ہے۔

ان دونوں کی باتوں کے دوران سانول کی کال آتی ہے ایمن کال ریسو کرتی ہے دوسری طرف باریشا ایمن کو بتاتی ہے کہ سانول کو گولی لگی ہے۔

اپنی طرف سے خیام پر فائر کر دینے کے بعد ضامن نے وہاں سے اپنی گاڑی کو آگے کی طرف بڑھا دیا تھا۔ بنواڑی کے علاقے میں اسے خیام بات کرتا نظر آیا اس کا سر گھومنے لگا تھا۔ خیام نے بھی ضامن کو دیکھ لیا تھا۔

ضامن گھبراہٹ میں گاڑی بھگاتا ہے تو اس کی گاڑی جنگلے سے ٹکرا جاتی ہے۔

ایمن اور رحبانی حویلیاں پہنچتے ہیں۔ چارپائی پر میت رکھی ہوتی ہے۔ چاند اوپر کی منزل پر سنکھ بجاتی ہے اور چلاتی ہے کہ التمش کی موت کا بدلہ پورا ہو گیا۔

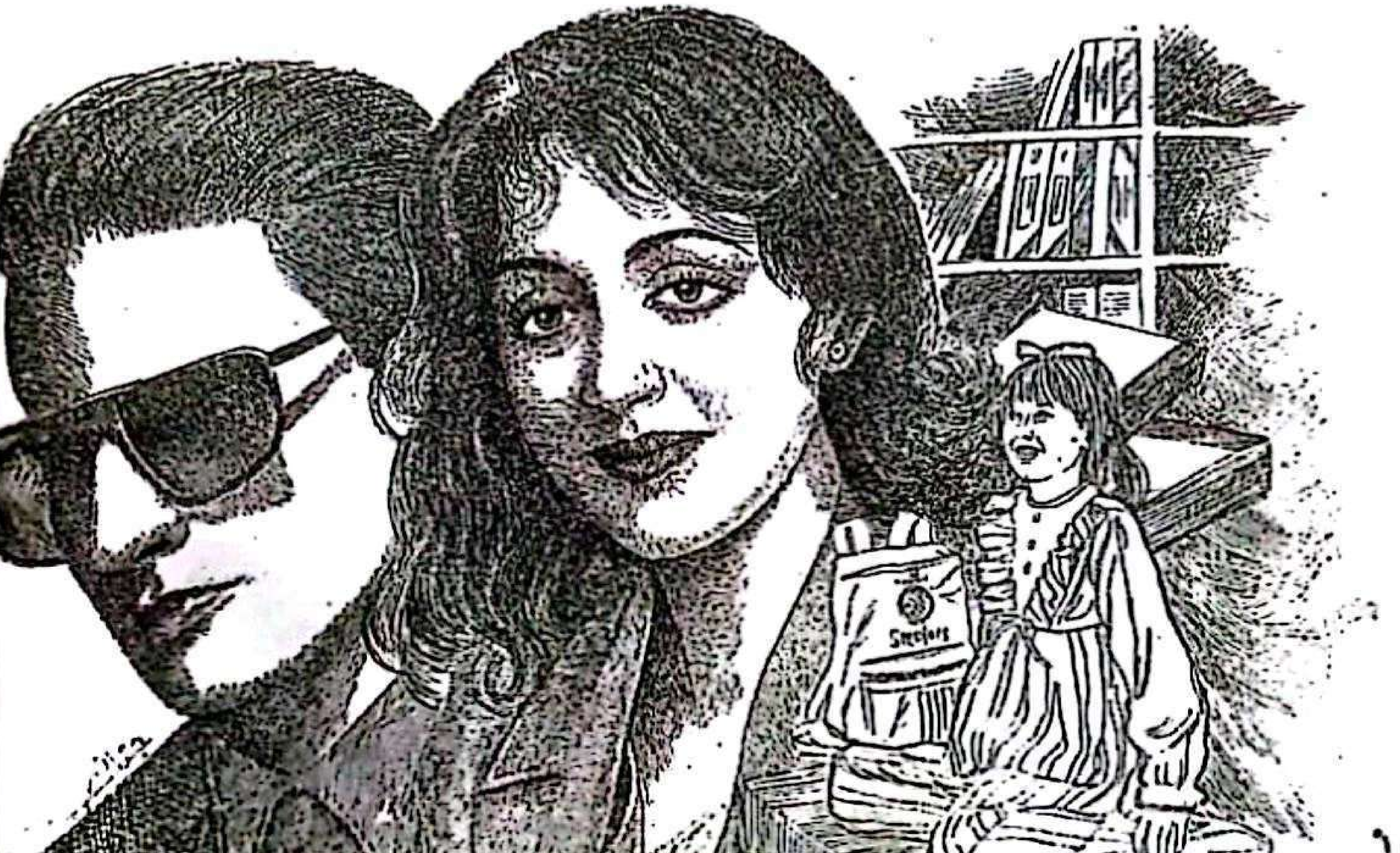

رحمانی وہاں سے چلا جاتا ہے۔ وہ کہاں چلا گیا تھا کسی کو پتا نہیں تھا۔
چاند صبح نہیں اٹھی تھی۔ وہ بے ہوش تھی۔ ارشادی بابا ڈاکٹر کو لے کر آتے ہیں۔ ڈاکٹر کہتا ہے کہ انہیں کوئی خوشی ہی بچا سکتی ہے۔

ایمن روتے ہوئے یاد کرتی ہے کہ کیسے اس نے چاند کو دکھ دینے کے لیے بستامی کو بلا کر صندل کے بارے میں بتایا تھا کہ صندل شنڈیانی میں ایک ہوٹل چلا رہی ہے۔ وہ وعدہ لیتی ہے کہ بستامی صندل کو گنجا کر کے حویلیاں واپس لے کر آئے گا۔ مقصد صرف ایک ہی تھا کہ چاند کو صندل کے حوالے سے ایسے دکھ ملیں کہ وہ طبعی موت مر جائے۔

ضامن و جیسے ہی ہوش آتا ہے پولیس اسے پکڑ لیتی ہے۔

باریشہ چاند کو لے کر اسلام آباد آئی تھی چاند کے کچھ ٹیسٹ کروانے تھے۔ سارے ٹیسٹ کروانے کے بعد وہ چاند کو لے کر خیام کے گھر چلی آئی تھی۔

خیام رو رہا تھا، وہ باریشہ سے کہتا کہ چاہنے کے باوجود وہ ضامن سے نفرت نہیں کر سکتا۔

باریشہ خیام کے جذبات سمجھ رہی تھی۔ کیونکہ اس نے اپنے اردگرد ایسے ہی لوگوں کو دیکھا تھا۔

ضامن جیل میں تھا اس کی آنکھیں درد ... وہ ... چلایا مگر دور کھڑے پولیس اہلکار اس پر ہنس رہے تھے۔

digest library.com

اڑتیسویں قسط

چاند کے تمام ٹیسٹس کی رپورٹس آچکی تھیں۔ اور ایک مستند ڈاکٹر کو دکھانے کے بعد باریشہ کو یہ بات پتا چلی تھی کہ چاند کو کوئی جسمانی نہیں بلکہ ذہنی مسئلہ ہے۔

"رپورٹس میں ایسا کچھ نہیں جس پر پریشان ہوا جائے۔ یہ کوئی ذہنی عارضہ ہے۔ آپ انہیں کسی سائیکاٹرسٹ کے پاس لے کر جا سکتی ہیں۔"

"چاند نانو کسی سائیکاٹرسٹ کے پاس نہیں جائیں گی۔ اور اگر میں زبردستی کر کے انہیں لے بھی گئی تو جانا بے کار ہوگا۔ چاند نانو سائیکاٹرسٹ کے کسی سوال کا جواب نہیں دیں گی۔ ان سے کوئی بات چیت نہیں کریں گی۔ چاند نانو نے اپنی زندگی کے راز کبھی مجھے نہیں بتائے، بلکہ کسی کو بھی نہیں بتائے، تو وہ سائیکاٹرسٹ کو کیا بتائیں گی۔"

"یہ لوگ اپنے شعبے کے کافی ماہر ہوتے ہیں۔ وہ ہر طرح کے مریض کو ہینڈل کر لیتے ہیں۔"

"آپ میری چاند نانو کو نہیں جانتے...... وہ اٹل فیصلے کرنے والی خاتون ہیں۔"

"پھر سوچ لیں کہ آپ نے کیا کرنا ہے۔ ابھی تو مسائل کا آغاز ہے۔ لیکن چاند کی عمر کو دیکھتے ہوئے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ مسائل کتنی جلدی بڑھ جائیں گے اور کس قدر گمبھیر ہو جائیں گے۔"

"لیکن یہ سب کیسے ہو گیا ڈاکٹر صاحب...... چاند نانو نے ساری زندگی بہت صحت مندی سے گزاری ہے۔ شکر گزاری سے......"

"بیماری نہ آنے کے لیے یہ کوئی جواز نہیں ہے۔ بیماریاں بد پرہیزی سے نہیں آتی ہیں۔ اور ذہنی بیماریاں ہمارے تحت الشعور میں چھپ کر بیٹھی ہوتی ہیں۔ جیسے ہی انہیں موقع ملتا ہے وہ شعور میں آ کر ظاہر ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔" ڈاکٹر کی بات سن کر باریشہ پریشان ہو گئی تھی۔ اب جب کہ سب ٹھیک ہوتے جا رہا تھا تو چاند نانو بیمار ہونے لگی تھیں۔ شاید حویلی کو خوشیاں راس ہی نہیں تھیں۔

"انہیں اسلام آباد لے کر آنا بھی آسان نہیں تھا۔ بہت جھوٹ بولے ہیں میں نے ان سے...... ٹیسٹ کروانا اور بھی مشکل تھا۔ میں نے انہیں ان کی صحت کے حوالے سے خبردار کر بھی دیا تو وہ زیادہ سنجیدہ نہیں ہوں گی۔ خود ہی جڑی بوٹیوں سے اپنی بیماری کا علاج کرنا پسند کریں گی۔"

"پھر میں ان کے لیے کچھ دوائیاں لکھ دیتا ہوں۔ آپ ایسا کریں کہ انہیں بہانے سے کھلا دیجیے گا۔ پندرہ دن بعد پھر سے معائنہ کر لیں گے۔ جس سے پتا چل جائے گا کہ ان میں بہتری آ رہی ہے یا نہیں......"

"جی...... یہ ٹھیک ہے۔ میں بہانے سے انہیں دوائیاں کھلا سکتی ہوں۔" باریشہ کو یہ خیال اچھا لگا تھا۔
بارہ کہو واپسی کے سفر پر عجیب طرح کی اُداسی نے اسے گھیر لیا تھا۔ نجانے کیوں اسے لگنے لگا تھا کہ وہ بہت جلد چاند نانو کو کھو دے گی۔ جیسے اس نے ہاتی سب کو کھو دیا تھا۔ اپنی ماں کو، حاجی بوا کو...... اور جیسے ابھی نجانے کس کس کو کھونا باقی ہے۔
شائستہ آنٹی نے بہت روکا تھا کہ وہ ایک دو دن مزید وہاں رہ جائے۔ لیکن باریشہ نے انکار کر دیا تھا۔ وہ جلد سے جلد حویلیاں واپس جانا چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ چاند نانو حویلی میں اس کی ساری کزنوں کے ساتھ وقت گزاریں۔ اور بس خوش رہیں۔ باریشہ کے پریشان چہرے کو دیکھتے ہوئے پھر شائستہ نے زیادہ اصرار نہیں کیا۔
"کل ضامن عدالت میں پیش ہوگا۔" دونوں چہل قدمی کرتے ہوئے کار کی طرف بڑھ رہے تھے جب خیام نے اسے بتایا۔
"کیا اسے کل ہی سزا سنا دی جائے گی۔؟"
"نہیں...... اتنی جلدی تو نہیں...... اس سب میں تو ابھی وقت لگے گا۔ ایک سال بھی لگ سکتا ہے۔"
"اگر اسے پھانسی کی سزا ہوتی ہے تو پھر اس سزا پر کب تک عمل درآمد ہوگا؟"
"دو سال...... اس سے زیادہ بھی لگ سکتے ہیں۔"
"اور اگر وہ رحم کی اپیل کرتا ہے تو......"
"ہاں...... اس موضوع پر بھی بات کی تھی میں نے وکیل سے...... وکیل نے کہا ہے کہ حادثاتی یا اتفاقی قتل پر تو رحم کی اپیل منظور ہو جانے کے چانس ہوتے ہیں۔ لیکن باقاعدہ پلاننگ کر کے قتل کرنے پر رحم کی اپیل منظور ہونے کا چانس نہیں ہوتا ہے۔ ضامن نے پوری پلاننگ سے قتل کیا ہے۔ اس کا اپنی کار میں کراچی سے اسلام آباد آنا...... پستول کا اس کی کار میں ملنا اور فنگر پرنٹ...... سب ثبوت اس کے خلاف ہی جاتے ہیں۔"
"پھر میں دعا کروں گی کہ ان دو سالوں میں کچھ ہو جائے۔ کچھ ایسا کہ ضامن سزا سے بچ جائے۔"
کار سے ٹیک لگاتے ہوئے، اور شام کے سورج کو ڈوبتے ہوئے دیکھ کر باریشہ نے کہا۔ خیام کو اس کی بات پر کچھ حیرت ہوئی تھی۔
"تم چاہتی ہو کہ ضامن سزا سے بچ جائے؟"
"ہاں...... میں چاہتی ہوں کہ وہ سزا سے بچ جائے۔ پتا نہیں کیوں...... لیکن میں نہیں چاہتی کہ وہ پھانسی کی سزا سے مرے۔ اس کی یہ موت میرے لیے تکلیف کا باعث بنے گی۔"
"اور میرے لیے اذیت کا......"
خیام نے دردناک سے لہجے میں کہا۔
باریشہ نظریں چرا گئی۔ وہ ابھی تک اس احساسِ جرم سے باہر نہیں نکلی تھی کہ اس کی وجہ سے دونوں دوستوں کی دوستی خراب ہوئی ہے۔ باریشہ کی ان کی زندگیوں میں آمد سے قبل ان دونوں کی دوستی کس قدر اچھی جا رہی تھی۔ یہ باریشہ ہی تھی جس نے دونوں کی دوستی کو دشمنی میں بدل دیا تھا۔ وہ ان کے لیے منحوس ثابت ہوئی تھی۔
"میں...... میں چلتی ہوں اب خیام...... تمہیں ضامن کے بارے میں کوئی بھی نئی بات معلوم ہو تو مجھے ضرور بتانا۔"
"ٹھیک ہے۔"
حویلیاں واپسی کا سفر کافی طویل ثابت ہوا تھا۔ باریشہ کو لگنے لگا تھا کہ ڈرائیور انہیں اسلام آباد میں ہی گھماتا جا رہا ہے۔ یا حویلیاں ہی اس دن کہیں کھو گیا تھا۔ کھڑکی سے باہر دیکھتی وہ اپنی ذہنی کیفیت کو کوئی نام دینے کی

کوشش کر رہی تھی جب چاند نانو نے اسے مخاطب کیا۔
"کیا ضامن کو واقعی ہی میں پھانسی ہو جائے گی۔؟" انہوں نے پوچھا۔
باریشہ نے کچھ چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ اسے چاند نانو کا ضامن کے مسئلے میں دلچسپی لینا حیران کر گیا تھا۔
"جی...... لگتا تو ایسا ہی ہے۔ اس نے حرکت بھی تو بہت غلط کی ہے۔ ضامن سے اس بات کی امید نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ اپنے بچپن کے دوست پر گولی چلائے گا۔ وہ الگ بات کہ خیام کی جگہ سانول کا قتل ہوا ہے۔"
"یہ سب ضامن نے نہیں کیا ہے۔ زویا نے کیا ہے......"
چاند نانو جیسے باریشہ کو بتایا۔ "میں زویا کو اچھے سے جانتی ہوں۔ وہ جن سے محبت کرتی ہے اور جن سے نفرت کرتی ہے۔ ان دونوں کو برباد کر دیتی ہے۔"
"زویا آنٹی نے اس بار صرف اپنے بیٹے کو تباہ نہیں کیا ہے۔ انہوں نے خیام کو بھی برباد کر دیا ہے۔ اس وقت دو لوگ جیل کی سزا کاٹ رہے ہیں۔ ایک ضامن اور ایک خیام...... خیام ماضی کی جیل میں بیٹھا ہوا ہے اور ضامن حال کی جیل میں......"

digest library.com

"مقسوم کو کوئی رد نہیں کر سکتا ہے۔ جو ہونا ہوتا ہے ہو کر رہتا ہے۔" چاند کی آنکھوں میں ماضی اتر آیا تھا۔
"اگر ضامن کو پھانسی ہوئی تو خیام بھی اسی دن مر جائے گا......"
باریشہ چاند کے کندھے پر ڈھے سی گئی اور آنسو بہانے لگی۔ وہ بہت دنوں سے رونے کے لیے کسی کندھے کی تلاش میں تھی۔ "ضامن کو کچھ ہوا تو خیام چلتا پھرتا تو نظر آئے گا۔ لیکن اندر سے مر جائے گا۔ اور خیام مر گیا تو...... میرا کیا بنے گا چاند نانو...... میری محبت ادھوری رہ جائے گی۔ میں نہیں چاہتی کہ خیام کو کچھ ہو۔"
"تمہارے ساتھ میں کچھ برا نہیں ہونے دوں گی میری بچی...... چاہیے اس کے لیے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے۔" چاند نے پیار سے باریشہ کا گال تھپتھپایا تھا۔
"میں مایوس ہو رہی ہوں چاند نانو...... ضامن کے حوالے سے ہر طرف سے بری خبریں سننے کو مل رہی ہیں۔"
"و فکر مت کرو...... ایسا کچھ نہیں ہو گا جیسا تم سوچ رہی ہو۔" چاند نے باریشہ کو دلاسا دینے کے سے انداز میں کہا۔
باریشہ نے سر اٹھا کر چاند کو دیکھا۔ ان کے لہجے کے یقین نے اسے حیران کیا تھا۔
"تمہارے پاس ایمن کا نمبر ہے۔؟"
"جی......"
"گھر جا کر میری اس سے بات کروانا...... میں بھی نہیں چاہتی کہ میرزاد کے بھانجے کو کچھ ہو۔" چاند کہہ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ ماضی امڈ امڈ کر اس کی آنکھوں کے سامنے آ رہا تھا اور ان میں آنسو بھر رہا تھا۔

☆☆☆

درگا مورتی کو پہلے اخبار سے اچھی طرح لپیٹ دیا گیا تھا اور پھر اس پر کپڑا باندھا گیا تھا۔ اس کے بعد ببل شیٹ کی بہت سی پرتیں چڑھائی گئی تھیں۔ اور آخر میں اس کو کارڈ بورڈ سے اچھے سے پیک کر دیا گیا تھا۔ ملازم لوگ پہلے پوجا کے سامان والے صندوق حویلی سے باہر لے گئے تھے۔ اور پھر تین چار لوگوں نے مل کر درگا مورتی کو اٹھا لیا تھا۔ اب وہ اسے اٹھائے حویلی کے گیٹ کی طرف بڑھ رہے تھے۔
حویلی کے سب افراد صحن میں جمع یہ سب ہوتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ جب درگا مورتی حویلی کے بڑے دروازے سے باہر چلی گئی تو نجانے کیوں سب کے دل بند سے ہونے لگے۔ ایسے جیسے کوئی بہت ہی اہم چیز ان

سے چھین لی گئی ہو۔ جب سے درگا مورتی بڑے کمرے سے باہر صحن میں آئی تھی بڑے کمرے میں کوئی نہیں جا رہا تھا۔ درگا مورتی والی خالی جگہ ان سب کو ہی کھل رہی تھی۔ جیسے کوئی زندہ جاوید انسان مر گیا ہو۔
انسان جس قدر مرضی کہہ لے کہ وہ چیزوں سے محبت نہیں کرتا لیکن درحقیقت وہ چیزوں کا اس قدر عادی ہو جاتا ہے کہ یہ بات وہ خود بھی نہیں جانتا ہے۔ وہ سانپ جو درگا مورتی کی ٹانگ سے لپٹا رہتا تھا وہ بھی تو پھر واپس نہیں آیا تھا۔ سب کو اس کا بھی قلق لگا ہوا تھا۔
''درگا مورتی واپس کرنے کے لیے بہت بہت دھنے واد......'' روی نے ہاتھ جوڑ کر سب کا شکریہ ادا کیا تھا۔ چاند نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔
''ہم نے وہاں ٹیم بٹھا دی ہے۔ ان تمام جگہوں کو دیکھا جا رہا ہے جہاں کرن اور زارا کے ہونے کے چانس ہو سکتے ہیں۔ اُمید ہے کہ ان کے بارے میں جلد کوئی خبر مل جائے گی۔''
''ہم......ہم اُن کے لیے بہت پریشان ہیں۔'' سارہ نے پریشان لہجے میں کہا۔
''میں سمجھ سکتا ہوں۔ میں ان کے مل جانے کی ایسے ہی کوشش کر رہا ہوں جیسے اپنے کسی کے ملنے کی......آپ بے فکر رہیں۔''
''ٹھیک ہے بیٹا......تمہارے لفظوں پر یقین ہے مجھے......کرن اور زارا کو ایک بار دیکھ لوں گی تو سکون سے مر سکوں گی۔''
''بھگوان کی کرپا سے سب اچھا ہوگا۔ چلتا ہوں اب......دھنے واد......''
روی کہہ کر باہر کو ہوا تھا۔ باقی سب اسے دروازے تک چھوڑنے اس کے پیچھے گئی تھیں۔ چاند اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ عجیب تذبذب کا شکار تھی۔
''میں نے اس لڑکے سے کن لڑکیوں کے بارے میں کہا ہے کہ ان کو دیکھ کر سکون سے مر سکوں گی۔؟'' چاند غائب دماغی کی حالت میں اپنے کمرے میں آئی تھی۔
''کرن اور زارا کون ہیں۔؟ میں کیوں ان سے ملنا چاہتی ہوں۔؟'' تخت پر لیٹنے تک چاند خود سے یہ ہی سوال کرتی رہی تھی۔

☆☆☆

زویا کا رو رو کر برا حال ہو چکا تھا۔ وہ ضامن کو ایسے گلے لگائے ہوئے تھی جیسے ضامن کوئی سال دو سال کا بچہ ہو اور اس کے گم ہو جانے کا ڈر ہو یا وہ ایک عرصے کی گمشدگی کے بعد اسے آج ہی ملا ہو۔ ضامن بھی رو رہا تھا۔ اس کے چہرے پر شرمندگی، دُکھ اور پچھتاوے کے تاثرات تھے۔ زوہیب فاصلے پر کھڑا سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔ اسے نہ تو ضامن پر پیار آ رہا تھا اور نہ ہی زویا پر ترس......اس کا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر واپس لندن چلا جائے۔ یا دنیا کے کسی ایسے خاموش علاقے میں جہاں وہ اپنی آواز بھی نہ سن سکے۔
''ہم نے وکیل سے بات کر لی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ میں کچھ بھی کر کے تمہیں سزا سے بچا لوں گا۔'' زویا نے رونے سے کچھ سنبھل کر بتایا تھا۔
ضامن نے آنکھوں کے آنسو صاف کیے تھے۔ اس نے ماں کی بات پر ایک فی صد بھی یقین نہیں کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی ماں جھوٹ بول رہی ہے۔ یہاں پولیس کے اہلکار اسے بتا چکے تھے کہ کوئی معجزہ ہی اسے پھانسی کی سزا سے بچا سکتا ہے۔
''ہم دو تین اور وکیل کرنے کی بھی سوچ رہے ہیں۔ شہر کے سب سے بڑے اور مہنگے وکیل......تم فکر مت کرنا ضامن......ہم جلد ہی تمہیں یہاں سے نکلوا لیں گے۔ میں نے سب سوچ لیا ہے۔ ہم سب کچھ بیچ کر جلد سے جلد لندن چلے جائیں گے۔ سازشی لوگوں سے بھری اس زمین کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیں گے۔ یہاں کے لو

گ بہت چالباز اور مکار ہیں۔ انہوں نے ہم تینوں کو تھکا دیا ہے۔"
"ٹھیک ہے۔" ضامن بس اتنا ہی کہہ سکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ایسا کچھ بھی نہیں ہونے والا......
"وکیل نے کہا ہے کہ وہ تمہاری میڈیکل ضرورت کے لیے بھی درخواست دے دے گا۔ جیسے ہی درخواست منظور ہوگئی تمہیں کسی بھی طرح کی میڈیکل ٹریٹمنٹ کے لیے پریشان نہیں ہونا پڑے گا۔ ہم تمہیں شہر کے اچھے ڈاکٹر اور بڑے سائیکاٹرسٹ کے پاس لے کر جائیں گے۔"
ضامن نے اپنے باقی ماندہ آنسو بھی صاف کیے تھے۔ جو کچھ اس کے ذہن میں چل رہا تھا اسے اب کوئی سائیکاٹرسٹ حل نہیں کرسکتا تھا۔
"تمہیں اعصاب کو مضبوط رکھنے کی ضرورت ہے میرے بچے...... تمہیں مجھ جیسا بننے کی ضرورت ہے۔ مجھے دیکھو...... اپنی ماں کو...... میں نے ہر طرح کے حالات کا کس قدر مضبوطی سے سامنا کیا ہے۔"
زوہیب نے سر جھٹکا۔ زویا کی باتیں اس کے نزدیک اول فول بکنے سے زیادہ اور کچھ نہیں تھیں۔
"ملاقات کا وقت ختم ہوگیا ہے۔" باہر سے صدا آئی تھی۔
"خود کو مضبوط کرو ضامن...... بس چند دنوں کی بات ہے۔ سب ختم ہو جائے گا۔ پھر تم اسے کسی برے خواب کی طرح بھول جانا۔"
"چلو زویا...... ملاقات کا وقت ختم ہوگیا ہے۔" زوہیب نے کہا۔ زویا جانے سے پہلے پھر سے ضامن کو چومنے لگی تھی۔
"ڈیڈ...... کیا آپ مجھے گلے سے نہیں لگائیں گے۔؟" ضامن نے رندھی آواز میں کہا۔
زوہیب نے ضامن کی طرف دیکھا۔ آنسو دونوں کی آنکھوں میں جھلملا رہے تھے۔ چند لمحے اسی طرح گزر گئے لیکن زوہیب کے چہرے کی سختی نرمی میں نہیں بدلی۔
"چلو زویا...... دیر ہو رہی ہے۔" زوہیب کہہ کر خود باہر نکل گیا تھا۔ اور ضامن کی آنکھوں میں رُکے ہوئے آنسو ایک بار پھر سے جاری ہو گئے تھے۔

☆☆☆

"میں نے ساری انفارمیشن اکٹھی کرلی ہے۔ زوہیب لوگ جس گھر میں رہ رہے ہیں وہ گھر پانچ سے چھ کروڑ کی مالیت کا ہے۔ زوہیب کے بزنس کے اثاثے بھی کروڑوں میں ہیں اور گردشی رقم بھی کم و بیش اتنی ہی ہے۔ اس کے علاوہ زوہیب اور زویا کے بینک اکاؤنٹ میں بڑی بڑی رقمیں موجود ہیں۔ پھر ضامن ان کی اکلوتی اولاد ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کو پھانسی سے بچانے کے لیے وہ کچھ بھی کر گزریں گے۔ انہیں اپنا سب کچھ بیچ کر سڑکوں پر ہی کیوں نہ آنا پڑے، وہ آ جائیں گے۔ اگر ہم دس کروڑ کی دیت کا مطالبہ بھی کریں تو میرے خیال سے بھاؤ تاؤ کے بعد سات آٹھ کروڑ میں بات فائنل ہو جائے گی۔" کومل نے اپنا سارا حساب کتاب بستامی کو بتایا تھا۔
"لیکن ہم دس کروڑ سے نیچے نہیں آئیں گے۔ کوشش کریں گے کہ دس ہی ملیں۔" بستامی کومل سے بھی زیادہ دیت کا حامی تھا۔
"ہاں...... دس کروڑ کی رقم ہمارے بہت سے مسائل حل کرسکتی ہے۔ ہم اپنے جل چکے گھر کو پھر سے تعمیر کر سکتے ہیں۔ کوئی کاروبار شروع کر سکتے ہیں۔ میرے خیال سے ایک سال کے عرصے میں ہم اپنی پرانی پوزیشن حاصل کرلیں گے۔"
"مجھ پر دائر مقدمات بھی ختم ہو جائیں تو مجھے ذہنی سکون ملے۔"
"میں نے اس کا حل بھی سوچ لیا ہے۔ ہم یہ شہر چھوڑ کر بھی جاسکتے ہیں۔ ہم لاہور چلے جائیں گے۔ وہاں

جا کر پھر سے نئی زندگی شروع کریں گے۔ اور اگر لاہور نہیں تو پہاڑی علاقوں کی طرف بھی نکلا جا سکتا ہے۔ یہ سیاحتی مقام بھی کمائی کا اچھا ذریعہ بنتے جا رہے ہیں۔ امیر زادوں کو وہاں اپنے اپنے گھروں میں ذہنی سکون کے ساتھ ساتھ ہر طرح کی سہولت چاہیے ہوتی ہے۔ ہم وہاں کوئی بڑا سا ہوٹل بھی کھول سکتے ہیں۔"

"یہ خیال بھی برا نہیں ہے۔"

"ہوٹل تو دو سے تین کروڑ میں بھی مکمل ہو جائے گا۔ اس کے بعد بھی ایک بڑی رقم ہمارے ہاتھ میں ہوگی۔"

"خدا کرے سب ایسا ہی ہو جیسا تم کہہ رہی ہو۔"

"ایسا ہی ہوگا۔ فکر مت کرو۔ خدا نے ہماری سن لی ہے۔ میری دعائیں قبول ہوگئی ہیں۔ جو میں غریبوں کی اتنی امداد کیا کرتی تھی نا، یہ اس کا بدل ہے۔ ہمارے حالات اب جلد ہی بدلنے والے ہیں۔"

تصور ہی تصور میں خود کو ایک بار پھر سے امیر ہوتا دیکھتے ہوئے کومل کافی خوش نظر آ رہی تھی۔ اسے غربت میں جینے کی عادت نہیں تھی۔ ان چند دنوں کی غربت نے ہی اسے تھکا دیا تھا۔ لیکن پھر اللہ نے راستہ بنایا تھا۔ سانول کو مار کر..... کومل کو سانول کی موت کا اتنا ہی دکھ ہوا تھا جتنا کہ اسے اپنے گھر کے کسی پالتو جانور کی موت پر ہو سکتا تھا۔

"کیا باتیں ہو رہی ہیں۔؟" ایمن وہاں آئی تھی۔ دروازے کے پیچھے کھڑی وہ سب سن تو چکی تھی لیکن چاہتی تھی کہ اس کی بہن اور اس کا بہنوئی اپنے منہ سے بتائیں کہ وہ کیا باتیں کر رہے تھے۔ کومل نے کچھ گھبرا کر ایمن کو دیکھا۔ وہ دیت والی بات ابھی سے نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ دیت کی بات سن کر ایمن ناراض نہ ہو جائے۔ لیکن پھر اسے محسوس ہوا کہ ایمن کے کانوں میں کچھ کچھ لفظ پڑ چکے ہیں تب ہی اس نے پوچھا ہے کہ وہ کیا باتیں کر رہے تھے۔

ایمن کے چہرے پر سرد مہری نظر آ رہی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے چاند سے فون پر بات کرتے ہوئے وہ زار و قطار روئی تھی۔ چاند نے اسے دلاسا دینے اور "ایک مطالبہ" کرنے کے لیے فون کیا تھا۔ وہ اس بارے میں کومل سے بات کرنا چاہتی تھی لیکن آگے صورتِ حال کچھ الگ تھی۔

"ہم..... ہم سوچ رہے تھے کہ جو ہونا تھا ہو چکا ہے۔ تو کیوں نہ اب سانول کے قاتل کو معاف کر دیا جائے۔" کومل نے آدھی بات کی تھی۔ ایمن کے چہرے کی مردنی اسے ڈرا رہی تھی۔

"کیا بس یہی بات ہو رہی تھی؟"

"ہاں..... یہ ہی..... ہم دونوں سوچ رہے تھے کہ دیت لے کر ضامن کو معاف کر دیتے ہیں۔" کومل فوراً ہی اصل مدعا پر آ گئی۔

"کتنی دیت......؟"

"تم بتاؤ..... کتنی ہونی چاہیے۔؟ سانول تمہارا بیٹا تھا۔"

"تم دونوں نے کیا سوچا ہے۔؟ کیا قیمت لگائی ہے تم دونوں نے میرے بیٹے کی....." ایمن کا لہجہ کچھ چبھتا ہوا سا تھا۔ کومل اپنی بہن سے بات کرتے ہوئے کچھ جھجک سی گئی۔

"دس کروڑ.....؟؟؟" پتا نہیں کومل نے پوچھا تھا کہ بتایا تھا۔

ایمن اپنی بہن کو دیکھ کر رہ گئی۔

"دس کروڑ ہمارے حالات بدل سکتے ہیں ایمن..... ہم اپنے پرانے گھر واپس چلے جائیں گے۔ کسی نئے شہر بھی جا سکتے ہیں۔ کوئی ہوٹل کھول سکتے ہیں......"

"اور وہاں بھی وہی واہیات کام کریں گے جو یہاں کرتے رہے ہیں۔ امیر زادوں کو لڑکیاں سپلائی کرنے والا کام......" ایمن نے فقرہ مکمل کیا تھا۔

"ظاہر ہے۔ اور کیا کریں گے ہم..... ہم سب اسی میں طاق ہیں۔ لیکن بسامی کچھ بزنس کے بارے میں

digest library.com

ہی اس وار رہا ہو۔"

"ویسے تم قیمت لگانے میں بہت طاق ہو کومل...... تم نے میرے بیٹے کی بہت مناسب قیمت لگائی ہے۔ دس کروڑ...... "ایمن نے طنزیہ کہا تھا۔

کومل اور بستامی کو سمجھ میں نہیں آسکا تھا کہ ایمن نے ان کی بات کی تائید کی ہے یا اسے یہ بات بری لگی ہے۔

"اگلی پیشی کب کی ہے بستامی......؟"

"پندرہ تاریخ کو......"

"ٹھیک ہے۔ میں عدالت جا کر دیت کی رقم کا مطالبہ کر دوں گی۔" ایمن نے کہا اور پھر دونوں پر ایک نظر ڈال کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

کومل اور بستامی نے مسکراتے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔ اور گہرا سانس بھرا تھا۔ جیسے بہت دور سے سفر کر کے آئے ہوں اور اب آرام میسر آ رہا ہو۔

☆☆☆

ایک دن حویلی کے باہر ایک ٹرک آ کر رکا تھا۔ سارہ ہی صبح سے کہیں باہر گئی تھی۔ واپس آئی تو پتا نہیں کون کون سا سامان ساتھ لائی تھی۔ ملازموں نے سامان کو ٹرک سے اُتار کر اندر رکھنا شروع کر دیا۔

"یہ سب کیا ہے سارہ......؟" چاند نے پوچھا تھا۔

"مشینیں ہیں چاند امی...... جوکی مشینیں...... جدید طرز کی سلائی مشین سمجھ لیں آپ......"

"یہ کیا کام کرتی ہیں......؟"

"ان پر جدید طرز کی کڑھائیاں ہوتی ہے۔ ڈیزائن بنتے ہیں۔ اسے سیکھنا زیادہ مشکل نہیں ہے۔ دکان والے سے بات ہو گئی ہے۔ وہ روز آ کر اس کی بنیادی چیزیں سمجھا دیا کرے گا۔"

"لیکن کس لیے......؟"

"خود کو فعال بنانے کے لیے چاند امی...... خود کو ماضی سے نکالنے کے لیے...... ہم سب مل کر یہ کام کریں گے۔ جیسے پہلے اس حویلی میں سلمٰی ستارے کا کام ہوتا تھا۔ اب یہ والا ہوگا۔ پاس پڑوس کی لڑکیوں کو بھی میں اس کام کی طرف لاؤں گی۔ دیکھیے گا دنوں میں ہی کام کیسے چل نکلے گا۔ میں نے ساری معلومات لے لی ہے۔ پہلے ہم اپنے مال کو ایبٹ آباد کی منڈی میں بیچیں گے۔ اس کے بعد فیصل آباد، اسلام آباد اور لاہور...... پھر سارا پاکستان......" سارہ نے جوش سے بتایا تھا۔

اس کی باتیں سن کر سب کے چہروں پر خوشی دوڑ گئی تھی۔

چاند جانتی تھی کہ سارہ وہی کام کر رہی ہے جیسا سالوں پہلے اس نے دین بابا کے لیے کیا تھا۔ انہیں زندگی کی طرف لانے کے لیے...... اب سارہ چاند سمیت باقی سب کو بھی زندگی کی طرف لانا چاہتی تھی۔ اور پھر حقیقت میں ایسا ہوا بھی......

سارہ نے بہت جلد ہی اپنی باقی کزنوں کو کام سمجھا دیا تھا۔ اور سب کو سب کا شعبہ دے دیا تھا۔ تعبیر رنگوں کے امتزاج بٹھاتی تھی اور دھاگا وغیرہ منتخب کرتی۔ روشانے، باریشہ کے ساتھ مل کر ڈیزائن تیار کرتی تھی۔ باریشہ کمپیوٹر میں کچھ ماہر تھی۔ وہ ڈیزائنوں کو بہت جدید طرز دیا کرتی تھی۔ انشیں کے ذمے کاریگروں سے کام لینا تھا۔ وہ کاریگروں کی انچارج تھی۔ چاند اور آمنہ سب کے لیے کھانے کا بندوبست کرتی تھیں۔ اور سارہ نے منڈی کا سارا کام اپنے ذمے لے لیا تھا۔

شروع شروع میں سب کو ہی مشکل پیش آئی۔ جیسا کہ نئے کام میں ہونا معمولی ہے۔ پھر سب ہی اس کام کو ایسے کرنے لگیں جیسے سالوں سے یہ ہی کام کرتی چلی آ رہی تھیں۔ اردگرد کی لڑکیاں بھی ان سے کام سیکھنے اور کرنے آنے لگیں تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے کام چل پڑا۔ ایک ایک کر کے ساری مشینیں چلنے لگیں۔ کڑھائی والی بھی اور سلائی والی بھی ...... مہینے بھر بعد ریڈی میڈ کپڑوں کی ایک بڑی کھیپ تیار ہو چکی تھی۔ سارہ سارے مال کو لے کر منڈی گئی تھی۔

''یہاں سے مال کل ہی سے چھوٹی دکانوں تک پہنچنا شروع ہو جائے گا۔ اور ایک مہینے تک نتیجے کا پتا چل جائے گا کہ آپ کے کپڑوں کو عوام نے پسند کیا ہے یا نہیں......'' بیوپاری نے سارہ کو بتایا تھا۔

''نتیجہ اچھا ہی آئے گا۔ ہم سب نے بہت محنت اور دل سے کام کیا ہے۔''

''ویسے آپ نے کپڑوں پر کسی طرح کا ٹیگ نہیں لگایا ہوا۔ کسی کمپنی، کسی ادارے کا...... کچھ تو ہونا چاہیے۔''

بیوپاری نے کہا تو سارہ کا دھیان اس طرف گیا۔ واقعی ہی کپڑوں پر کسی طرح کا ٹیگ تو لگا ہی نہیں ہوا تھا۔

''میں اگلی بار ٹیگ لگا کر لاؤں گی۔''

digest library.com

''ویسے کیا نام سوچا ہے آپ نے اپنی برانڈ کا......؟''

''چاند...... چاند کولیکشن......'' سارہ نے فوراً سے سوچ کر اسی وقت بتا دیا۔

☆☆☆

بعض جگہوں کی صبحیں بہت جلدی جاگ جاتی ہیں۔ سبزی منڈی کی صبح، ہسپتال کی صبح، اور عدالت کی صبح...... دن پوری طرح طلوع ہونے سے پہلے ہی یہاں اتنی چہل پہل شروع ہو جاتی ہے کہ ان کے عادی نہ ہونے والے افراد جب پہلی بار صبح میں یہاں آتے ہیں تو حیران رہ جاتے ہیں۔

ایمن کو اتنی صبح اُٹھ کر گھر سے باہر نکلنے کی عادت نہیں تھی۔ آج جب وہ خود پر لمبی چادر اوڑھ کر عدالت میں پہنچی تو اسے یہ سب کسی اور ہی دنیا کا منظر لگا۔ پولیس کی گاڑیاں ایک کے بعد ایک بڑے دروازے سے اندر داخل ہو رہی تھیں۔ یہ گاڑیاں ان مجرموں سے بھری ہوئی تھیں جن کی آج عدالت میں پیشی تھی۔ پولیس کی نگرانی اور ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے قیدی کمرہ عدالت کے باہر کھڑے اپنے نام کے پکارے جانے کا انتظار کر رہے تھے۔ ہتھکڑیاں پہنے ہوئے ضامن کو بھی وہاں لایا گیا تھا۔ زویا اور زوہیب پہلے سے ہی کمرہ عدالت کے باہر کھڑے تھے۔ زویا ضامن کو دیکھتے ہی جیسے پھر سے ہوش کھونے لگی تھی۔ وہ ضامن سے لپٹی تھی اور اس کا چہرہ چومنے لگی تھی۔ زوہیب کسی بت کی طرح کھڑا رہا تھا۔ جو کردار اسے ادا کرنا پڑ رہا تھا اسے اس کردار سے نفرت ہونے لگی تھی۔

ایمن اور بسطامی اپنے وکیل کے ساتھ کمرہ عدالت کے باہر آئے تھے۔ ایمن نے زویا اور ضامن کو دیکھا تھا اور دونوں ہی نظریں چرا گئے تھے۔ ایمن کے چہرے کی سرد مزاجی انہیں ایسے دکھ رہی تھی جیسے وہ انہیں نظروں سے ہی مار ڈالنے کا ارادہ کیے ہو۔

''یہ درخواست آپ نے جج کے آگے پیش کرنا ہے۔ اس میں یہ لکھا ہے کہ ہم قتل کے بدلے کے طور پر دیت کا مطالبہ کرتے ہیں۔'' وکیل نے ایمن کی طرف ایک پیپر بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اسے آپ اپنے پاس رکھیں۔ جب اندر جائیں گے تو تب مجھے دے دیجیے گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' وکیل نے پیپر کو واپس اپنی فائل میں رکھ لیا تھا۔

بسطامی ضامن کو نفرت سے دیکھ رہا تھا۔ زویا اور زوہیب بے بسی کی تصویر بنے کھڑے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد کمرہ عدالت سے ضامن کا نام پکارا گیا تو سب اندر چلے گئے۔ اور اس سے پہلے کہ کسی بھی طرح کی کارروائی کا

آغاز ہوتا، بستامی نے وکیل سے کاغذ لے کر ایمن کی طرف بڑھایا۔ ایمن نے اس کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ ایمن اپنے ہینڈ بیگ میں سے کوئی اور کاغذ نکال چکی تھی۔ اور پھر وہ اس نے جج کی طرف بڑھا دیا۔ جج نے اسے پڑھا۔

"آپ قاتل کو معاف کر رہی ہیں؟" جج نے کچھ حیرت سے ایمن سے پوچھا اور بستامی سمیت سب نے اپنے چہروں کے رُخ ایمن کی طرف کیے تھے۔

"جی...... میں قاتل کو معاف کر رہی ہوں۔ بنا کسی مجبوری کے...... اپنی خوشی اور رضامندی سے...... اور اپنے پورے ہوش وحواس میں......" ایمن نے لفظ لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو ایمن......" بستامی بھڑکا تھا۔

"جو مجھے بہتر لگ رہا ہے۔" ایمن نے بستامی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

"ہمیں تو دیت کا مطالبہ کرنا ہے۔؟"

"مجھے کسی طرح کا کوئی مطالبہ نہیں کرنا ہے۔ میں اپنے بیٹے کا قتل ضامن کو معاف کرتی ہوں۔ مجھے مزید دیر کچھ نہیں کہنا۔" ایمن نے کہا اور اس سے پہلے کہ کوئی حیرت سے نکل پاتا ایمن وہاں سے باہر کی طرف چلی گئی تھی۔

بستامی اور اس کا وکیل ہکا بکا کھڑے تھے اور زویا دیوانوں کی طرح ضامن کا منہ چومتے ہوئے رونے لگی تھی۔

☆☆☆

"یہ...... یہ تم نے کیا کیا ہے ایمن...... تم نے ضامن کو معاف کر دیا ہے۔"

کومل ایمن پر چلائی تھی۔ غصہ تو بستامی کو بھی بہت تھا لیکن وہ ضبط کیے بیٹھا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ پہلے کومل ایمن سے باز پرس کر لے۔ وہ بعد میں کرے گا۔ عدالت سے گھر واپسی کا سفر اس کے لیے مشکل ثابت ہوا تھا۔ اسے اپنی زندگی رکتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ وہ خواب جو اس نے اور کومل نے دس کروڑ کی رقم مل جانے کے بعد کے حوالے سے دیکھے تھے وہ بنا کسی وجہ سے ختم کر دیے گئے تھے۔

"جو میرے دل آیا میں نے وہ ہی کیا۔ میرے دل نے کہا کہ میں ضامن کو معاف کر دوں۔ سو میں نے کر دیا۔"

"تم...... تم پاگل ہو گئی ہو۔ مفت میں معاف کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ جب ہم ان سے دیت کا مطالبہ کر سکتے تھے تو......"

"نہیں...... مجھے کوئی دیت نہیں چاہیے تھی۔" ایمن نے سادگی سے کہا تھا۔

کومل اور بستامی کو اس کی ذہنی حالت پر شبہ ہوا تھا۔

"ہمیں تو چاہیے تھی۔ تم دیکھ نہیں رہیں کہ ہم کس حال میں پہنچ چکے ہیں۔ غربت نے کس طرح ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا ہے"

"اس سب میں سانول کا کوئی قصور نہیں ہے۔"

"لیکن سانول مر کر ہمارے کام آ سکتا تھا۔ وہ ہمیں غربت سے نکال سکتا تھا۔ ورنہ ہم کون سا ان پر بوجھ ڈال رہے تھے۔ سات آٹھ کروڑ تو کوئی معنی ہی نہیں رکھتا تھا ان کے لیے...... بہت امیر ہیں وہ لوگ...... اپنی اکلوتی اولاد کے لیے وہ ہنسی خوشی اتنی رقم دے سکتے تھے۔"

"میں نے خدا کے نام پر اپنے بیٹے کا قتل معاف کیا ہے۔ مجھے دیت نہیں چاہیے تھی۔ میں خدا کی خوشنودی

چاہتی تھی۔"
ایمن نے کہا تو کومل کو اس کی بات پر پہلے سے زیادہ حیرت ہوئی تھی۔ وہ غصے میں نہ ہوتی تو یقیناً ہنس پڑتی۔ "خدا کی خوشنودی" یہ الفاظ شاید ایمن نے زندگی میں پہلی بار ادا کیے تھے۔
"تم ہم سے تو مشورہ تو کرتیں ایمن...... تم نے خاموشی سے معافی نامہ تیار کروایا اور پھر وہاں جمع کروا دیا۔" بستامی بھی غصے سے بولا۔
"سانول میرا بیٹا تھا بستامی...... اس کے قاتل کے لیے کیا کرنا تھا اور کیا نہیں یہ میں بہتر جانتی تھی۔ تم سانول کا باپ بننے کی کوشش مت کرو۔"
"تم رحبانی کی تلاش تک تو انتظار کر لیتیں۔ ضامن کو کون سا کل ہی پھانسی ہونے والی تھی۔ ابھی تو کیس نے پتا نہیں کتنے ماہ مزید چلنا تھا۔ رحبانی مل جاتا تو اس سے مشورہ کر کے کچھ کرتیں۔ وہ سانول کا باپ ہے۔ کچھ اس کا بھی حق بنتا ہے سانول پر......"
"رحبانی اب کبھی واپس نہیں آئے گا۔" ایمن نے کہا۔ اور یہ کہتے ہوئے وہ کچھ اداس ہو گئی تھی۔
دونوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ایمن اتنے وثوق سے یہ بات کیسے کہہ سکتی تھی۔
"کل رات مجھے ایک خواب آیا ہے۔ مجھے اب ساری زندگی رحبانی کے بنا ہی گزارنا ہو گی۔"
"تم ولی اللہ نہیں ہو جو تمہارے خواب سچ ہوں گے۔ رحبانی کی تلاش ہو رہی ہے۔ پولیس نے کہا ہے کہ وہ جلد ہی اسے تلاش کر لے گی۔ تم تو ایسے بات کر رہی ہو جیسے اسے گم ہوئے صدیاں بیت چکی ہوں۔"
"تم اس کے بچپن کے دوست ہو بستامی...... تم بے شک اس کے مل جانے کی امید میں رہو۔ لیکن میں رحبانی کی تلاش سے مایوس ہو چکی ہوں۔ میں جان گئی ہوں کہ اب اسے کبھی نہیں دیکھ سکوں گی۔"
ایمن کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔ کل رات کے خواب پر اس نے دل و جان سے یقین کر لیا تھا۔
اس کی بات اور لہجے پر بستامی کا دل ڈوبنے لگا تھا۔ اسے بھی یہ ہی لگنے لگا تھا کہ اس کی آنکھیں اب کبھی رحبانی کو دوبارہ نہیں دیکھ سکیں گی۔

digest.library.com

"تم نے یہ سب کرتے ہوئے ہمارے بارے میں ایک لمحہ کو بھی نہیں سوچا ایمن......" افسوس سے کہتی ہوئی کومل دھپ سے صوفے پر بیٹھی تھی۔ اسے ایمن کی حرکت پر شدید رنج پہنچا تھا۔ "تم وہ رقم خود نہ لیتیں۔ ہمیں دے دیتیں۔"
"اپنے بیٹے کی موت میں کسی کو کیش نہیں کروانے دوں گی کومل......" ایمن نے غصے سے کہا۔ "دوبارہ مجھ سے اس موضوع پر بات مت کرنا۔" اور کہہ کر وہ اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔
کمرے میں پہنچ کر ایمن نے ایک طائرانہ نظر کمرے پر ڈالی اور پھر الماری میں سے اپنا بیگ باہر نکالا۔ جس میں وہ ایک دو دن سے اپنا ضروری سامان رکھ رہی تھی۔ ایمن نے اس بار بیگ کی زپ کھول کر رحبانی اور سانول کی تصویروں والے فوٹو فریم رکھے تھے۔ کچھ چیزیں جن سے دونوں کی یادیں جڑی ہوئی تھیں وہ رکھی تھیں اور پھر بیگ کو بند کر لیا تھا۔ مناسب موقع ملتے ہی وہ خاموشی سے اس گھر کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دینے والی تھی۔
"پاگل ہو چکی ہے ایمن...... ایک لمحے میں برباد کر کے رکھ دیا ہے اس نے ہمیں......" بستامی کا غصہ کم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔
"کاش رحبانی کی ہی کچھ خیر خبر مل جاتی تو وہ ایمن کو ہرگز یہ کام نہ کرنے دیتا۔"
"اندازہ نہیں تھا کہ ایمن یہ کام کرے گی۔ ورنہ میں مقدمہ اپنی مدعیت میں درج کروا لیتا۔"

"خیر...... میرے پاس ایک حل اور ہے۔ جو ہمیں اس ساری مشکلات سے نکال سکتا ہے۔" کومل نے کہا تھا اور بستامی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ تو ویسے بھی اب تنکوں کے سہارے چاہنے لگا تھا۔

"وہ کیا......"

"باریشہ......" کومل کی آنکھوں میں روشنی سی جگمگانے لگی تھی۔ بستامی اس کی بات نہیں سمجھا تھا۔

"ہم ابھی تک اس کے گارجین ہیں۔ وہ پیپر جن پر باریشہ نے سائن کیے تھے میرے لاکر میں موجود ہیں۔ ہم باریشہ کو واپس لا سکتے ہیں اور اسے اپنی مرضی سے استعمال کر سکتے ہیں۔ باریشہ وہ پہلی لڑکی ہوگی جو ہمارے بزنس کو پھر سے شروع کرنے میں ہماری مددگار ثابت ہوگی۔ اس کی پہلی رات کی اچھی قیمت مل سکتی ہے اور باقی کی راتوں کی بھی۔"

اور ساری بات سمجھ کر بستامی کی آنکھیں بھی چمکنے لگی تھیں۔

☆☆☆

"چاند نانو...... آپ کی دوائی کا وقت ہو گیا ہے۔" باریشہ نے چاند کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا تھا۔ تخت پر لیٹی چاند نے انجان نظروں سے اس کی طرف ایسے دیکھا تھا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔

"یہ لیں...... دوائی کھا لیں۔" باریشہ نے چاند کے ہاتھ پر کچھ کیپسول رکھے جنہیں چاند نے چپ چاپ منہ میں ڈال لیے۔ پھر باریشہ کے ہاتھ سے پانی کا گلاس پکڑ کر چند ایک گھونٹ پانی پیا۔

"یہ...... یہ کس چیز کی دوائی ہے۔؟"

"کچھ خاص نہیں...... بس وٹامن ہیں۔ جسم کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔" باریشہ نے بات بنائی تھی۔

"کیا مجھے کمزوری ہے۔؟"

"نہیں...... لیکن اگر دوائی نہ لی تو ہو سکتی ہے۔"

چاند نے کچھ نہیں کہا۔ وہ پھر سے لیٹنے کی تیاری کرنے لگی۔

"کچھ کھانے کے لیے لاؤں میں آپ کے لیے......؟"

"نہیں...... میرا دل نہیں چاہ رہا ہے۔"

"میں رات میں آپ کے لیے پلاؤ بنا دوں گی۔ آپ کو بہت پسند ہیں نا...... بالکل ویسا ہی جیسی شائستہ آنٹی نے ہمارے لیے بنایا تھا۔"

"ٹھیک ہے۔ اب میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتی ہوں۔" چاند نے کہا تو باریشہ نے کمرے سے جانا مناسب سمجھا، جبکہ وہ ابھی کچھ دیر بیٹھ کر چاند سے باتیں کرنا چاہتی تھی۔

"یہ...... یہ لڑکی کون ہے۔؟ حویلی میں کیا کر رہی ہے۔؟ بات تو ایسے کر رہی تھی جیسے مجھے جانتی ہو یا جیسے میری کچھ لگتی ہو۔" چاند نے اپنی کنپٹی پر انگلی رکھی تھی۔ جیسے وہاں شدید درد اٹھا ہو۔

"یہ تو صندل کی بیٹی نہیں...... لیکن صندل کون ہے۔ نام تو ایسے یاد ہے مجھے جیسے میں جانتی ہوں۔ لیکن چہرہ یاد نہیں آ رہا۔ کیا تہمینہ پھپھو کی بیٹی تھی صندل...... لیکن تہمینہ پھپھو تو بے اولاد تھیں۔ ان کے تو کوئی اولاد نہیں ہو سکی تھی۔ اور وہ تو ہجرت کے وقت ہی مر گئی تھیں۔ پھر یہ صندل کون ہے۔؟" چاند نے ذہن پر زور ڈالنا شروع کیا تھا۔ اسی کوشش نے اس کی ساری نیند اڑا کر رکھ دی تھی۔ پھر چند لمحوں کی کوشش کے بعد اسے کچھ کچھ یاد آنے لگا۔

ایک بچی کے رونے کی آواز...... حویلی کے دروازے کے باہر کین کی ٹوکری میں پڑی سرخ اونی کمبل میں لپٹی ہوئی ایک ننھی سی بچی...... چاند کا بچی کو پالنے کی ضد کرنا...... بچی کو پاک کرنا...... اس کا نام صندل رکھنا...... اور پھر کتنا بہت سا عرصہ گزر جانا...... ایک طویل عرصہ...... شاید صدیاں...... جن میں وہ تھی اور اس کی

صندل...... اس کی زندگی کا سب سے بڑا اثاثہ...... اور پھر جیسے اس کی محبت کو کسی کی نظر لگ گئی۔ کیا کیا تھا بستامی اور ایمن نے مل کر اس کے ساتھ...... چاند کو وہ رات یاد آئی تھی جب بستامی اسے ٹھنڈیانی سے حویلیاں واپس لایا تھا۔

”تم نے نیگ کے بہانے وعدہ لیا تھا نا...... میں تب ہی سمجھ گیا تھا کہ تم صندل کو حویلی میں واپس لانا چاہتی تھیں۔ لو میں صندل کو واپس لے آیا ہوں۔“ بستامی نے کہا تھا پھر اپنے پیچھے کھڑے چار آدمیوں کے جھرمٹ میں سے صندل کو نکال کر چاند کے سامنے کیا تھا۔

گہری ہوتی رات میں چاند نے صندل کو دیکھا تھا۔ جس کی گود میں ہاریشہ تھی۔ اس نے ایک سیاہ چادر لی ہوئی تھی اور اس کے وجود سے زیادہ اس کی ذات سیاہ دکھ رہی تھی۔ اس کی ذات میں کیا بات عجیب تھی کہ چاند والہانہ اس کی طرف بڑھ ہی نہیں سکی تھی۔ اسے گلے لگا ہی نہیں سکی تھی۔ کس بات نے اس کے قدم روک دیے تھے۔ صندل نے نظریں اُٹھا کر اپنی چاندامی کو دیکھا تھا۔ اور چاند کا دل ہوک کر رہ گیا تھا۔ صندل کی آنکھیں صرف آنسوؤں سے ہی نہیں بلکہ بے انتہا دُکھ سے بھی بھری ہوئی تھیں۔ دُکھ کی کوئی صورت ہوتی تو یقیناً صندل کی آنکھیں ہوتیں۔ ان میں پانی نہیں زہر بھرا ہوا تھا۔

ہوا کا ایک جھونکا حویلی میں وارد ہوا تھا جس نے حویلی کی ساری قندیلوں کو بجھا دیا تھا۔ سیاہ رات مزید سیاہ ہوگئی تھی۔

digest library .com

”لیکن گھر لانے سے پہلے اسے پاک کرنا ضروری تھا۔ یہ گھر سے بھاگ گئی تھی نا...... اس لیے ناپاک ہو گئی تھی۔ گھر واپس لانے سے پہلے اس کو پاک کرنا ضروری تھا۔ جیسے بچپن میں کیا گیا تھا۔ یاد ہوگا تمہیں......“ بستامی نے کہا تھا اور پھر صندل کے سر سے سیاہ چادر کو ڈھلکا دیا تھا۔ ساتھ ہی صندل کے آنسو بھی ڈھلکے تھے۔ بے بسی کے آنسو...... بے چارگی کے آنسو...... اپنی بے عزتی کے آنسو...... اور چاند کا دل پھٹنے پر آگیا تھا۔ صندل کے سیاہ بال اس کے سر پر موجود نہ تھے۔ حویلی واپس لانے سے پہلے بستامی نے اسے سر سے گنجا کر دیا تھا۔

”ہائے میرا اللہ......“ سب یاد کرتے ہوئے چاند نے اپنے دل پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ جیسے اسے دل کا دورہ پڑا ہو۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ سامنے سنگھار میز پر اس کی نظر ٹھہری تھی۔ اپنے ہی عکس کو دیکھتے ہوئے وہ ٹھٹکی تھی اور اجنبیت سے اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی تھی۔

”اپنی بیٹی کی موت کا بدلہ پورا ہو جانے تک میں اب ایسے ہی رہوں گی۔“ اسے اپنا ہی کیا ہوا عہد یاد آیا تھا۔

☆☆☆

اندھیرے کمرے میں دو جگنو روشن ہوئے تھے۔ یہ جگنو آنکھوں میں چمک رہے تھے۔ سانپ کی آنکھوں میں...... اپنے پرانے سوراخ سے نکل کر سانپ درگا موریتی والے بڑے کمرے کے فرش پر چکر لگانے لگا تھا۔ اس کی سیاہ کھال پر پیلی چتیاں پہلے سے زیادہ نمایاں ہو چکی تھی۔ وہ واپس آ گیا تھا۔ کیونکہ پچھلے دنوں اس گھر میں سنکھ بجائی گئی تھی۔ اور وہ چاند نے ہی بجائی تھی۔ موٹا سانپ کمرے سے باہر نکل کر دالان کے کونے سے رینگتا ہوا آگے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کی پھنکار میں خوف تھا۔ اس کی چال میں دہشت تھی۔ اپنے وجود کو بل پر بل دیتے ہوئے وہ آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ چاند کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اور چاند خود کو سنگار میز کے آئینے میں اجنبی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ کیا تلاش کر رہی تھی۔؟ کیا سوچ رہی تھی۔؟ سانپ تخت کے موٹے پائے سے لپٹنے لگا تھا۔ جب نیچے صحن سے کوئی شور سنائی دیا تھا۔ چاند جلدی سے تخت سے اُتر گئی نیچے کو لپکی تھی۔ سانپ بھی چاند کے پیچھے پیچھے چلنے لگا تھا۔

☆☆☆

تین چار افراد بہت تیزی سے کھلے دروازے سے حویلی کے اندر داخل ہوئے تھے۔ان میں سے ایک بستامی تھا، ایک کومل اور دو ان کے ساتھ گارڈ...... جنہیں وہ حویلی والوں پر رعب ڈالنے کے لیے ساتھ لائے تھے۔کومل اور بستامی کے چہرے غصے سے ایسے سرخ ہو رہے تھے جیسے حویلی والوں نے ان کے گھر پر ڈاکا ڈال دیا ہو۔

"باریشہ...... باریشہ......"

بستامی نے بڑک مارنے کے سے انداز میں باریشہ کا نام پکارا تھا۔آواز حویلی میں چاروں طرف پھیلی تھی۔

سب اپنے اپنے کام چھوڑ کر باہر صحن میں آئے تھے۔باریشہ، چاند، آمنہ، تعبیر، روشانے، انشیں اور سارہ...... اس کے علاوہ کچھ ملازم لوگ بھی دلان تک باہر آگئے تھے۔جیسے باہر کچھ ہونے والا ہو۔حویلی کے مکین بستامی اور کومل کو وہاں دیکھ کر حیران ہوئے تھے۔

"کیا بات ہے۔تم یہاں کیا کر رہے ہو۔تمہیں کس نے اجازت دی میرے گھر میں آنے کی......" چاند نے غصے سے پوچھا۔

"میں تم سے ملنے نہیں آیا ہو۔میں باریشہ سے بات کرنے آیا ہوں۔"

"جی...... بولیے کیا بات ہے۔؟" باریشہ نے پوچھا۔کومل آگے کو بڑھی۔اس کی آنکھوں میں بڑی مکاری جھلکتی تھی۔

"تمہیں کچھ یاد دلانا تھا باریشہ......" کومل نے کہا اور پھر ایک پیپر باریشہ کے سامنے کیا۔باریشہ اس پیپر کو پہچانتی تھی۔اس پیپر پر اسی کے سائن تھے اور لکھا ہوا تھا کہ وہ کومل اور بستامی کو اپنا گارجین تسلیم کرتی ہے۔اس پیپر پر اور بھی بہت کچھ لکھا ہوا تھا۔اتنی شقیں تھی جن کی تب تو باریشہ نے پروا نہیں کی تھی لیکن اب اس کا سر گھومنے لگا تھا۔

"یقیناً تم اس پیپر کو پہچان چکی ہو گی۔؟"

"جی...... تو......؟"

"تو ہمارے ساتھ چلو...... اس سے پہلے کہ ہم زبردستی کریں۔"

"تم ہوتی کون ہو باریشہ کے ساتھ زبردستی کرنے والی......" چاند نے غصے سے کہا۔

"تم خاموش رہو چاند...... یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔یہ باریشہ کا اور ہمارا مسئلہ ہے۔اس نے ہمیں اپنا گارجین تسلیم کیا ہوا ہے۔اس لیے اب اسے ہمارے ساتھ جانا ہو گا۔" بستامی نے اپنی طرف سے مسئلے کو جیسے خوش اسلوبی سے حل کرنے کی کوشش کی تھی۔

"باریشہ تمہارے ساتھ نہیں جائے گی۔"

"تم فضول میں خود کو تھکا رہی ہو چاند......" کومل نے طنزیہ کہا۔"تمہارا باریشہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔اس پیپر میں لکھا ہے کہ وہ چاند سے اپنے سارے تعلق ختم کرتی ہے۔یقین نہیں آتا تو پڑھ لو۔"

چاند نے اور باقی سب نے بھی باریشہ کی طرف دیکھا تھا۔باریشہ نظریں چرا گئی تھی۔نادانی میں اس نے گناہ کبیرا جیسی غلطیاں کی تھیں۔کسی کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا وہ کیا کہے۔لیکن ایک بات تو سب نے دل ہی دل میں طے کر لی تھی کہ کوئی بھی باریشہ کو یہاں سے لے کر نہیں جا سکتا۔

"ہمیں زبردستی کرنے پر مجبور مت کرو باریشہ...... خاموشی سے ہمارے ساتھ چلو۔" کومل نے ایک بار پھر پیار سے کہا۔

"میں اس اقرار نامے سے انکار کرتی ہوں۔"
"اس کے لیے تمہیں عدالت سے رجوع کرنا ہوگا۔ پیپر پر لکھا ہے کہ اس اقرار نامے کو پانچ سال سے پہلے کسی بھی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ابھی تین سال باقی ہیں۔ تم تین سال کے بعد بے شک عدالت میں اسے چیلنج کر دینا۔"
"میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ جو کرنا ہے کرلیں۔"
"تم ہمیں زبردستی پر مجبور کر رہی ہو باریشہ......"
"نہیں جانا باریشہ نے تمہارے ساتھ...... تم ہوتی کون ہو باریشہ کو اپنے ساتھ لے کر جانے والی......" تعبیر آگے بڑھ کر بولی۔
"باریشہ کو لے کر جانے کے لیے تمہیں ہماری لاش پر سے گزرنا ہوگا۔" روشانے بھی آگے ہوئی تھی۔
"میں یہ بھی کرلوں گا۔"
"خدا سے ڈر بے حس اور بے غیرت انسان...... خدا کے عذاب سے ڈر......" انشیں نے نفرت سے بستامی کو دیکھا۔ جیسے بستامی کا منہ ہی نوچ ڈالنا چاہتی ہو۔
"جب خدا سے ڈرنے کا وقت آئے گا۔ یہ کام بھی کرلوں گا۔"
"خدا کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔ یقیناً تیرا انجام بہت دردناک ہونے والا ہے۔" سارہ نے بددعا دینے کے سے انداز میں کہا تھا۔

digest library.com

بستامی نے سر جھٹکا۔ جیسے سارہ کی بددعا کو کوئی اہمیت نہ دے رہا ہو۔
"اپنی بیٹی کو تو میں نہیں بچا سکی۔ اپنی نواسی کے لیے جو ہو سکا کروں گی۔" آمنہ تن کر کھڑی ہو گئی تھی۔ "تمہارے لیے بہتر ہے کہ تم دوبارہ حویلی میں قدم نہ رکھنا۔"
"میں دیکھتا ہوں کہ کون مجھے روکتا ہے؟"
بستامی نے کہا اور پھر آگے بڑھ کر باریشہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "میں باریشہ کو اپنے ساتھ لے کر جا رہا ہوں۔ جس نے جو کرنا ہے کرلے۔"
باریشہ کو مضبوطی سے پکڑے بستامی اسے دروازے کی طرف کھینچنے لگا تھا۔ ایک شور اٹھا تھا۔ باریشہ سمیت باقی سب ہی چلانے لگے تھے۔
"مجھے...... آپ میرے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتے ہیں۔" باریشہ چلا رہی تھی۔
چاند بستامی کی گرفت سے باریشہ کا ہاتھ چھڑوانے لگی تھی۔ باقی سب بھی بستامی کو روک رہی تھیں۔ لیکن بستامی میں آج نجانے کیسے اتنی طاقت آگئی تھی۔ وہ سب کو پیچھے دھکیلتا ہوا دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔
"پیچھے ہو جاؤ تم بچی عورت...... اس عمر میں تمہیں کچھ ہو گیا تو الزام ہم پر آجائے گا۔" کومل نے چاند کو بری طرح سے پیچھے دھکیلا تھا۔ چاند لڑکھڑا کر پیچھے ہوئی تھی۔ اور توازن قائم نہ رکھ سکنے کی وجہ سے اس کا سر ستون سر ٹکرا گیا تھا۔ جہاں سے فوراً ہی ہلکا سا خون ظاہر ہوا تھا۔
"چاند......" آمنہ نے چلا کر کہا اور چاند کی طرف بڑھی۔ تعبیر، روشانے اور کچھ ملازم بھی چاند کو سنبھالنے لگے تھے۔
"چھوڑیے مجھے......" باریشہ نے پوری طاقت لگاتے ہوئے جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑوایا۔ اور پھر نفرت سے بستامی کے منہ پر تھوک دیا۔ غصے سے بستامی کا پورا چہرہ سرخ ہو چکا تھا۔ اس نے باریشہ کو بالوں سے پکڑ لیا۔ اور بے دردی سے اپنے ساتھ کھینچنے لگا۔ باریشہ نیچے فرش پر گر گئی تھی۔ بستامی اس کے بالوں کو پکڑے اسے گھسیٹ رہا

تھا۔ انشیں بری طرح سے بستامی پر ہاتھ چلاتی جا رہی تھی۔ جسے کومل روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سارہ کو گلزار نے پکڑا ہوا تھا۔

حویلی سے نظر آتے آسمان پر سورج پوری آب وتاب کے ساتھ روشن ہو گیا تھا۔ اس کی روشنی ہر چیز روشن کر دینے والی تھی۔ ہر اندھیرے کو ختم کر دینے والی...... یہ سورج جیسے جنت سے سیدھا اس گھر کے صحن پر طلوع ہوا تھا۔ سالوں بعد...... یا شاید صدیوں بعد......

"ہاریشہ......" کراہتی ہوئی چاند دہائی دینے لگی تھی۔ اور تب ہی ایک عجیب بات ہوئی تھی۔ ہاریشہ کو فرش پر گھسیٹتا بستامی رکا تھا۔ نجانے کیا بات ہوئی تھی۔ وہ ایک دم سے ہی رک گیا تھا اور ساکت ہو گیا تھا۔ جیسے اس کے قدم زمین میں میخ گئے ہوں اور اب وہ ایک انچ بھی چل نہ سکتا ہو یا جیسے اسے کرنٹ نے جکڑ لیا ہو۔ ایک دم سے ہی اس نے ہاریشہ کے بال چھوڑ دیے تھے۔ اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے سب کو دیکھنے لگا۔

"سانپ......سانپ......" سب نے اس سانپ کو دیکھتے ہی شور مچا دیا تھا جس نے بستامی کو ڈس لیا تھا۔

سیاہ کھال پر پیلی چتیوں والا موٹا اور زہریلا سانپ بستامی کو ڈس لینے کے بعد اب صحن کے پیچیدہ اُبھار دار رینگتا ہوا دُور جا رہا تھا۔ جہاں چاند اپنا ماتھا پکڑے کراہ رہی تھی، وہاں پہنچ کر وہ سانپ نجانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ کس بل میں چھپ گیا تھا۔ اتنی تیزی سے کہ کوئی اسے پکڑ کر مار بھی نہیں سکا تھا۔ اوجھل ہونے سے پہلے چاند نے سانپ کو دیکھ لیا تھا۔ یہ اس کا پالتو سانپ تھا۔ جسے وہ دودھ پلایا کرتی تھی۔

کومل فق چہرہ لیے بستامی کو دیکھنے لگی۔ بستامی کے سارے وجود نے جھٹکا کھایا تھا اور پھر دوسرے جھٹکے پر وہ فرش پر جا گرا تھا۔ کومل نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ کر چلانا شروع کر دیا تھا۔ باقی سب سہم کر دُور دُور ہو گئے تھے۔ بستامی ایسے تھرتھر کانپنے لگا تھا جیسے اس پر کسی نے ہزار میگاواٹ کی ننگی تار رکھ دی ہو۔ کسی کو بستامی کے پاس جانے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ چند لمحوں کے بعد اس کے منہ سے جھاگ نکلنا شروع ہو گئے تھے اور اس کا جسم دیکھتے ہی دیکھتے نیلا ہونے لگا تھا۔ سانپ کا زہر سوچ سے زیادہ زہریلا تھا۔ بستامی کی حالت ایسے ہونے لگی تھی جیسے اس کا جسم تیزاب میں ڈال دیا گیا ہو۔ اس کی ناک اور کان سے خون نکلنا شروع ہو چکا تھا۔ اس کے جسم کی طاقت ہر لمحے میں ختم ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھیں ڈیلوں سمیت باہر اُبل پڑنے کو تیار تھیں۔ وہ ایسے سانس لے رہا تھا جیسے اس کی سانس کی نالی سوئی کے سوراخ جتنی تنگ ہو گئی ہو۔

کومل فرش پر ڈھیر ہوئی چلاتی جا رہی تھی۔ باقی سب خاموشی سے بستامی کی موت کا منظر دیکھ رہے تھے۔ سب کی آنکھوں میں خوف تھا۔ چند لمحوں کے بعد بستامی کے وجود نے ہر طرح کی حرکت کرنا بند کر دی۔ اس کی سانسیں پوری ہو چکی تھیں اور روح فنا ہو چکی تھی۔ ایسی دردناک موت پر ملازموں نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔

چاند ہمت کر کے کھڑی ہوئی تھی اور دُور سے ہی بستامی کی موت کا تماشا دیکھتی رہی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی وہ بستامی کے پاس آئی۔ بستامی کی موت کے بعد بھی زہر اپنا اثر دکھا رہا تھا۔ اس کا جسم نیلے سے گہرے نیلے رنگ میں بدلنے لگا تھا اور ہونٹ بری طرح سے سوج گئے تھے۔ چاند نے بستامی کے بگڑے ہوئے چہرے کو دیکھا اور پھر نیچے بیٹھ گئی۔ ہلکے سے اس نے بستامی کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔ زہر کی وجہ سے بستامی کے سر کے سارے بال لمحے بھر میں اس کی جلد سے الگ ہو گئے تھے۔ چاند نے اس کے سر پر ہر طرف ہاتھ پھیر کر اس کے سارے بال اُتار دیے تھے۔ بستامی کا نیلا گنجا سر سب کو نظر آنے لگا۔

"لے اب تو بھی پاک ہو گیا بستامی......" چاند نے نفرت سے کہا۔

☆☆

(آخری قسط ان شاء اللہ آئندہ ماہ......)

شازیہ ستار نایاب

ہائے یہ بارش

digest library.com

بادلوں نے آج بھی آسمان پر ڈیرا ڈال رکھا تھا اور گرجتے ہوئے زمین پر برس رہے تھے۔ ویلے (فارغ) اکابرینِ ریاست اپوزیشن (پھپھو) اور آئینی صدر (سسر) برآمدے میں بیٹھے بارش سے لطف اٹھا رہے تھے۔ عوام (بچے) چھوٹی چھوٹی باتوں میں خوشی تلاش کرتے ہوئے کاغذ کی کشتیاں بنا کر پانی میں ڈال رہے تھے۔ بڑا صاحبزادہ گتے اور گلو سے بحری جہاز بنا رہا تھا۔ چیف (سرتاج) اپنے کام پر تھے اور وزیر اعظم (ہم) امورِ راجدھانی میں مصروف

......

پھوپھو اور سسر انکل کو چائے دینے گئے تو برستی بوندیں دیکھ کر رہ نہ سکے اور موبائل اٹھا کر اپنی حس فوٹو گرافی کو تسکین دینے لگے۔

پھوپھو نے دیکھا تو تنقید کا ڈونگرا برسایا۔"

کیمرے والا موبائل کیا آیا۔ ہر بندہ ہی فوٹو گرافر بن گیا...... ورنہ پہلے تو کسی کسی کے پاس کیمرا ہوتا تھا۔"

لیکن اس سے پہلے کہ وہ کہتیں کہ بڑی آئی فوٹو گرافر...... ہونہہ!" ہم نے آواز لگائی "اسمائل پلیز" اور اپوزیشن (پھوپھو) اور آئینی صدر (سسر) کی تصویر لے لی۔ ہمارے اس عمل نے پھوپھو کے چہرے کے تاثرات بدل دیے اور ہمارا بھی موڈ خراب ہونے سے بچ گیا جو "بڑی آئی فوٹو گرافر" سن کر ہوتا تھا۔

"دکھاؤ ذرا کیسی آئی ہے؟" پھوپھو نے اشتیاق سے پوچھا۔

"دیکھ لیں، آج کل کے موبائل کیمرے کا کمال، تصویر کھینچو اور جھٹ سے دیکھ لو...... پسند نہ آئے تو ڈیلیٹ کر دو۔" ہم نے تصویر دکھاتے ہوئے کہا۔

"ارے واہ! تصویر تو بہت اچھی آئی ہے، بہو دو تین اور تصویریں لے لو میری اور بھائی جان کی۔" پھوپھو نے فرمائش کی۔

ہم نے کھٹا کھٹ کئی تصویریں لے لیں اور پھوپھو کو واٹس ایپ کر دیں۔ ہمارے کون سا پیسے لگنے تھے۔

پھوپھو اپنے موبائل کی طرف متوجہ ہوئیں اور ہم بچوں کی طرف جو دھڑا دھڑ کاغذ کی کشتیاں بنا کر پانی میں ڈال رہے تھے۔

"بس کرو بچو...... اب اور کوئی کشتی نہیں بنانی...... بہت ہو گیا۔" ہم نے کہا۔

"ارے کھیلنے دو بہو...... اس موسم میں بچے کشتیاں نہیں بنائیں گے تو اور کیا کریں گے...... یاد ہے بھائی جان۔ ہم بھی بچپن میں ایسے ہی کرتے تھے۔"

ہاں ہاں بھئی، کھیلنے دو۔" آئینی صدر نے بھی عوام (بچوں) کو چھوٹ دی۔

"لیکن کب تک...... بارش تو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی۔"

"ہاں تو بہو، جمعرات کی جھڑی ہے جمعرات کو ختم ہو گی۔"

"تو کیا یہ اسی طرح کھیلتے رہیں گے۔" ہم نے بچوں کو گھورا۔

"کھیلنے دو بہو...... تم یہ بتاؤ آج کھانے میں کیا بناؤ گی؟" اپوزیشن نے عوام کا ساتھ دیا اور ہماری توجہ دوسری جانب مبذول کروائی۔

"ابھی سوچ رہی ہوں کیا بناؤں؟"

"ایک تو تم سوچتی بہت ہو بھئی، جو گھر میں پڑا ہے بنا لو۔" پھوپھو نے مشورہ دیا۔

"سبزی میں تو کدو ہی پڑے ہیں۔ وہ ہی بنا لیتی ہوں۔"

"مما! میں کدو نہیں کھاؤں گا۔" چھوٹے صاحبزادے نے فوراً کہا۔

"مما! کچھ اور بنا لیں نا۔" بیٹے اور بیٹی نے بھی اس کی تائید کی۔

"ٹھیک ہے کوفتے بنا لیتی ہوں۔" ہم نے عوام کو ریلیف دیا۔

"مما! چاول بھی۔" عوام ذرا سی ریلیف ملتے ہی مزید پھیلے۔

ہم نے حامی بھرنے میں دیر نہ کی یہ سوچ کر کہ روٹی تو نہیں بنانی پڑے گی نا۔

"واہ بھئی...... ہمارے زمانے میں تو اگر ایسا کہتے تھے تو اماں کی اڑتی ہوئی چپل آتی تھی۔ مزاج پوچھنے کو...... پہلے اماں کے جوتے کھاتے تھے اور پھر سبزی۔" پھوپھو نے کہا۔

"بالکل ایسا ہی ہوتا تھا۔" سسر صاحب نے قہقہہ لگایا۔

"اور ایسی کوئی فرمائش کرنی ہوتی تھی تو دو دو گھنٹے زمین پر ایڑیاں رگڑتے تھے۔" نجمہ پھوپھو نے کہا۔

"منی! تمہارا ناگن ڈانس تو مجھے اب بھی یاد ہے جو اماں پھر چپل مار کر ہی ختم کروائی

تھیں۔" انکل بھی پرانی یادوں میں کھو گئے۔

"فرمائش پھر بھی پوری نہیں ہوتی تھی۔" نجمہ پھوپھو نے برا سا منہ بنایا۔

"آج کل کے بچے بڑے خوش قسمت ہیں بھئی۔ جو انہیں ایسی مائیں ملی ہیں، یا یا پھر مائیں بہت اچھی ہیں جو بچوں کی ہر فرمائش فوراً پوری کر دیتی ہیں۔" سسر انکل نے کہا۔

"کیا خاک اچھی مائیں ہیں ادم ہی نہیں ہے کہ بچوں کو سبزی کھلا سکیں...... اور بچے بھی خاک خوش قسمت ہوئے۔ سبزیوں کے وٹامنز کھانا نصیب ہی نہیں ہوتا۔" نجمہ پھوپھو چڑ کر بولیں۔

ہم مسکرا دیے۔ اب کیا راز کھولتے کہ آج کل کی ماؤں نے طریقہ واردات بدلا ہے...... مقصد اُن کا بھی متوازن غذا کھلانا ہی ہے۔ ابھی راز کھولنے کا وقت نہیں تھا نا۔

"بس بچو...... کشتیاں جہاز بنانے بند کرو...... سارا لان بھر گیا ہے اخبار اور گتے کے ٹکڑوں سے۔" ہم نے ایک بار پھر بچوں کو منع کیا اور اندر آنے لگے کہ پھوپھو کی آواز سنائی دی۔

"اے بہو! سنو ذرا...... تم کہاں دو دو سالن بناتی رہو گی۔ ہمارے لیے بھی کوفتے ہی بنا لینا۔ ہم بھی وہی کھا لیں گے۔" نجمہ پھوپھو نے اس انداز میں کہا جیسے کہہ رہی ہوں کہ کھا مر لیں گے۔

ہم نے (آئینی صدر) سسر انکل کی طرف دیکھا۔ "ہاں بیٹا! نجمی ٹھیک کہہ رہی ہے جو بچے کھائیں گے ہم بھی وہی کھا لیں گے۔" انداز نجمہ پھوپھو والا ہی تھا۔

ہم نے رخ موڑ کر بمشکل اپنی ہنسی پر قابو پایا اور کچن میں چلے آئے۔

ابھی کام شروع بھی نہیں کیا تھا کہ پھوپھو چلی آئیں، "اے بہو! ایسا کرو، میٹھے میں گڑ والے چاول بنا لو سونف اور چھوٹی الائچی ضرور ڈال دینا اس موسم میں بہت مزا دیں گے۔"

"بارش میں تو پکوڑے بنتے ہیں"۔ ہم نے کہا۔ گمان تھا کہ پچھلی بار کی طرح اس بار بھی پھوپھو خود ہی پکوڑے اور گلگلے بنا لیں گی۔

"بھئی پہلے تو جمعرات کی جھڑی لگتی تھی تو روز نت نئے پکوان بنتے تھے۔ کبھی پکوڑے...... کبھی مال پوڑے کبھی گڑ والے چاول، کبھی قتلمہ...... جمعرات کی جھڑی جمعرات کو ختم ہو تو روز پکوڑے تو نہیں کھائے جا سکتے نا۔"

"جی پھوپھو...... پکوڑے تو ہمارے ہاں صرف رمضان میں فرض ہوتے ہیں۔"

"گڑ والے چاول بنا لینا۔" پھوپھو نے ہماری بات سنی ان سنی کی۔

"ایک بات بتائیں پھوپھو...... بھادوں شروع ہو گیا ہے اور اتنی بارش ہو رہی ہے لیکن بھادوں کی بارش پر ایک بھی گیت نہیں بنا، کوئی شاعری نہیں ہوئی سارے گیت اور اشعار ساون کے لیے ہی کیوں ہیں۔" ہمارے ذہن میں اچانک یہ سوال کلبلایا۔

"کیا کہہ سکتی ہوں میں...... کہتے ہیں کہ یہ گیارہ مہینوں کے نام گیارہ بھائیوں پر رکھے گئے، بھادوں اُن کی اکلوتی بہن تھی...... پندرہ اگست کے بعد چونکہ موسم رنگ بدلتا ہے اس لیے اس مہینہ کا نام بہن کے نام پر بھادوں رکھا کہ گرمی کا زور ٹوٹ جاتا ہے اور جیسے بہن اور بیٹی رحمت ہوتی ہیں اسی طرح اس مہینے میں بھی گرمی کے ستائے لوگ سکون کا سانس لیتے ہیں۔"

"اس مردوں کی دنیا میں بے چاری بہن (بھادوں) کا کوئی ذکر ہی نہیں"۔ ہم نے فیمینیزم کا جھنڈا لہرایا۔

"ویسے بہو، بات تم نے پتے کی کی ہے...... بھادوں کی بارش کا کوئی ذکر ہی نہیں۔"

"میں تو ہمیشہ پتے کی بات کرتی ہوں آپ نے ہی کبھی میری تعریف نہیں کی۔" ہم ذرا سی تعریف سن کر مزید پھیلے۔

"کیوں تم نے کون سی لاعلاج بیماری کا علاج

دریافت کر لیا ہے۔" وزیراعظم کے اس انوکھے مطالبے پر اپوزیشن کے چہرے کے زاویے بدلے۔

"گر ہی نہ لوں...... کچن تو میرا کسی حکیم کے مطب کا منظر پیش کر رہا ہے۔" ہم نے بھی بڑا دعویٰ کیا، وزیراعظم جو ہوئے۔

"نہ بہو! یہ کام نہ کرنا، کفر کا فتویٰ لگ جائے گا...... یہ کام غیر مسلموں پر چھوڑ دو۔" پھوپھو نے کہا۔

ہم نے یہ کڑوا سچ سن کر برا سا منہ بنایا۔

"ویسے اگر تعریفیں کروانے کا اتنا شوق ہے نا تو فیس بک پر گروپ بنا لو پہلے اپنے واٹس ایپ کو ایڈ کرنا پھر پوسٹ لگانی شروع کرنا۔ یقین کرو جھاڑی پہ دوپٹا لٹکا دو گی تو لوگ کہیں گے "کیا سوچ ہے...... کیا creativity ہے"۔ گروپ تمہارا ہو گا تم چاہے دن کو رات کہنا یا رات کو دن...... جو کوئی اختلاف کرے تو واویلا شروع کر دینا کہ آپ نے بات کیسے کی... آپ بدتمیزی کر رہے ہیں...... پھر گروپ سے نکال دینا بلکہ بلاک کر دینا...... اور ہاں مجھے اس قسم کے گروپ میں ایڈ نہ کرنا...... مجھ سے نہ ہو پائیں گی یہ جھوٹی تعریفیں۔" پھوپھو نے مشورہ دیا

"پھوپھو! میں تو بہت کم فیس بک پہ ہوتی ہوں۔" ہم نے بہت کم پر زور دیا۔

"ہری بتی تو ہر وقت جل رہی ہوتی ہے"۔ پھوپھو نے کہا

"آپ کو کیسے پتا؟" ہم نے فوراً اپنے پروں سے پانی جھاڑا اور اپوزیشن پر ڈالا۔

پھوپھو نے ہمیں گھورا اور بڑبڑائیں۔ "واقعی پوسٹ تو کوئی لگاتی نہیں۔"

ہم مسکرا دیے پوسٹ پر پرائیویسی لگی ہوتی ہے پھوپھو کو کیسے نظر آئے۔

پھوپھو نے ہمیں بغور دیکھا اور واپسی کا رخ کیا۔

"بچوں کو اندر بھیج دیں۔" ہم نے آواز لگائی۔

"بچے تو چھت پر چلے گئے ہیں۔ کہہ رہے تھے برساتی پہ کھڑے ہو کر بارش دیکھیں گے۔"

"اب وہاں کاغذوں کا گند پھیلائیں گے......

ہم جھلائے پھر سر جھٹک کر کام کا آغاز کیا۔ پلاؤ کے لیے یخنی اور گڑ والے چاولوں کے لیے چاشنی بنی رکھی۔ پھر کدو کو چھیل کر باریک کش کیا اس میں کوفتہ مصالحہ مکس کیا دو بڑے چمچ بھنے چنے پیس کر ڈالے ایک چمچ ملک کریم ڈالی ایک ڈبل روٹی کا ٹکڑا بھگو کر ڈالا اور فریج میں سیٹ ہونے کے لیے رکھ دیا۔ کوفتوں کے لیے گریوی بنائی چاول بھگوئے اور پھر کوفتے بنا کر فرائی کر کے گریوی میں ڈال دیے...... کدو کے کوفتے تیار تھے پھر پلاؤ اور گڑ والے چاول بنائے رائتہ اور کچومر سلاد بنایا، اتنے میں چیف بھی آ گئے۔

"آج تو کھانے کی خوشبو سے پورا گھر مہک رہا ہے کیا بنایا ہے تم نے۔" چیف کے لہجے میں ستائش تھی۔ ہم ساری تھکن بھول کر ساتویں آسمان پر جا پہنچے۔

"جو بھی بنا ہے میں نے اور بچوں نے بنوایا ہے ورنہ تمہاری بیگم تو کدو بنا رہی تھی۔" اپوزیشن نے سارا کریڈٹ خود لے کر ہمیں ساتویں آسمان سے نیچے دھکا دیا۔

"ابھی بھی کدو ہی ہوں گے"۔ چیف زیر لب بڑبڑائے۔ وزیراعظم کی رگ رگ سے واقف تھے۔

ہم نے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

کھانا مزے کا تھا سب نے بہت شوق سے کھانا کھایا الحمدللہ۔

"اے بہو یہ کوفتے چکن کے تھے یا مٹن کے؟" پھوپھو کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

"کدو کے"۔ ہم نے راز آشکار کیا۔

"کیا...... کدو کے کوفتے۔" پھوپھو چلائیں۔

"تو کیا بچوں کو سبزی نہ کھلاؤں"۔ ہم نے اطمینان سے کہا۔ اور ڈونگے میں بچے باقی دو کوفتے اٹھا کر پھوپھو کی پلیٹ میں ڈال دیے انہوں نے ایک نظر ہم پر ڈالی اور پھر مزے سے کھانے لگیں۔

☆☆☆

شام کو ذرا دیر کو بارش تھمی تو پرندوں کو دانہ ڈالنے چھت پر گئی ...... اور ایک لمحے کو دم بخود رہ گئی۔ چھت پر پانی ہی پانی تھا۔ بڑے صاحبزادے کے بنائے ہوئے گتے کے بحری جہاز اور کشتیاں پر نالوں کا محاصرہ کیے ہوئے تھیں۔ اس لیے وہ بند ہو گئے تھے۔ کھڑکیوں اور روشن دان کے شیڈ پر نظر پڑی تو وہ بھی پانی سے بھرے ہوئے تھے وہاں پرندوں نے گھونسلے بنا لیے تھے اس وقت تو ہم بہت خوش ہوئے تھے روز ان میں جھانکتے ان کی تصویریں کھینچتے۔ لیکن اب ان کے گھونسلوں کے تنکے بکھرے ہوئے تھے اور ایک روشن دان کے شیڈ پر انڈے تیر رہے تھے۔ اف یہ کیا ہوا ہم نے اپنا گھومتا سر تھاما اور بھاگتے ہوئے نیچے آئے الماری سے لمبے بوٹ نکالے ابھی پہن رہے تھے کہ صاحب آ گئے۔

"کہاں جا رہی ہو؟"

"اوپر۔" ہم نے صاحب سے نظریں چار کیے بغیر جواب دیا حالانکہ موسم تو پیا سے آنکھ لڑانے کا تھا۔

"اوپر جانے کے لیے یہ تیاری ......" صاحب حیران ہوئے

ہم نے کچھ نہ کہا جھاڑو اور لمبا بانس اٹھایا اور چل دیے، صاحب بھی ہمارے پیچھے لپکے۔ اوپر کے منظر نے چیف کو حیران کم اور پریشان زیادہ کیا

"تم نے اس بار پرنالوں کی صفائی نہیں کی"۔

"کی تو تھی ...... لیکن آپ کے بچوں نے اپنے تخلیقی شاہکار یہاں رکھ دیے۔ پرندے بھی یہیں پرنالوں پر بیٹھتے تھے کیوں کہ یہاں دھوپ نہیں آتی تھی اور شیڈز پر انہوں نے گھونسلے بنا لیے تو میں نے سوچا کہ اُن کے بسے بسائے گھر کیوں اُجاڑوں۔

"پانی کا راستہ روک کر بسائے جانے والے گھر بھی کبھی بسے ہیں۔"

صاحب نے تحمل کے وقت فلسفہ جھاڑا جس کی ہم نے چنداں پروا نہ کی اور اپنے کام میں مشغول رہے آخر کو منتخب وزیر اعظم تھے ...... لمبے بوٹ بھی تھے کام کرنے کا جذبہ بھی ...... بانس والے جھاڑو سے پرنالے صاف کیے کچرا ٹوکری میں ڈالا پرنالے صاف ہوتے ہی چھت سے پانی گٹر میں چلا گیا۔

پھر ہم نے لمبے بانس سے جھاڑو باندھا اور روشن دانوں کے شیڈ صاف کرنے کی کوشش کی۔ اب چیف سے رہا نہیں گیا انہوں نے ہمارے ہاتھ سے بانس لیا اور شیڈز کے اوپر سے صفائی کرنے لگے۔ آخر سول انتظامیہ کی مدد چیف نے ہی کرنا تھی نا۔

خیر صفائی کر کے نیچے آئے تو اپوزیشن تنقیدی بیان جاری کرنے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔ "اے بہو تم بچوں کو منع نہیں کر سکتی تھیں"۔

"منع کر تو رہی تھی تب آپ نے کہا تھا کھیلنے دو ......"

"تو بھی ...... اب ہم ہی بڑے ہو گئے ...... صفائی کرنا ...... بچوں پر نظر رکھنا تو تمہارا کام ہے نا۔" پھوپھو نے جلتی پر تیل ڈالنے کا کام جاری رکھا۔

اتنا تیل ہوتا ہے ان کے پاس پتا نہیں پٹرول پمپ کیوں نہیں بنا لیتیں۔ ہم نے سوچا۔

اپوزیشن کا تیل کام آیا اور چیف نے بچوں کو گھور کر دیکھا پھر رخ روشن ہماری طرف موڑا لیکن اس سے پہلے کہ کچھ کہتے ہم نے اپنا رخ زیبا دوسری طرف موڑ لیا جو اس بات کا واضح اشارہ تھا کہ اس موقع پر وزیر اعظم سے پنگا نہیں چلے گا۔ اور وہ چیف ہی کیا جو الیکٹڈ وزیر اعظم کا اشارہ نہ سمجھے۔ چیف نے یقیناً گہرا سانس لیا اور چلے گئے۔

"بہو! آئندہ دھیان رکھنا ......" بچے نے بڑا ضبط کیا ہے آج ...... غصہ پی لیا۔"

"یہی تو شادی شدہ ہونے کی نشانی ہوتی ہے ......" ہم نے بھی اپنا غصہ پیتے ہوئے کہا ورنہ جی تو چاہ رہا تھا کہ بچوں کی چھترول کر دیں ...... اور کبوتروں کو ڈربے میں بند کر دیں۔ توبہ ہے بھئی ......

☆☆

digest.library.com

Digest Novels Lovers Group

آمنہ بانو

کارپے ڈائم

پیڑوں پہ لہراتے... رے پتے ہیں جہاں.
زندگی کے خوابوں کے گیت بھی
اٹکھیلیاں کرتے وہیں کو جاتے ہیں
بہت کچھ مگر ناپید ہو چکا تب سے
جب ہم نے پہلی بار گائے تھے
بڑی نازک دھنوں والے گیت
سب گیت بھی تو فانی ہیں
ایک بھی نہیں جو پھر ہمیشہ سنائی دے
کبھی کچھ اڑا لے جاتی ہے ہوا
پھول بھی، تتلیاں بھی سب
جو کبھی نہیں مرتے مگر
دوڑتے بھاگتے عکس ہی تو ہیں
شاعر: ہرمن ہیس

☆☆☆

یہ تیسری دفعہ تھا جب کرسی پر براجمان شخص نے کپکپاتے ہاتھوں کو باہم ملا کر خود کو نارمل کرنے کی کوشش کی۔ اضطرابی حالت میں ایک ٹانگ کو مسلسل جھلاتا، آنکھیں بند کیے اپنے ذہن میں ایک تصویر ترتیب دے رہا تھا۔ سامنے میز پر پڑی چیزیں مایوسی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ کہ کب وہ ان کی طرف ہاتھ بڑھائے اور پچھلے ایک گھنٹے سے جاری ان کا انتظار اختتام پذیر ہو۔ بالآخر چند لمحوں بعد۔ اس نے باہم ملے ہوئے ہاتھوں کی مٹھی بنا کر، منہ کے قریب کر کے باری باری پھونک ماری۔ جیسے ہاتھوں کی کمزوری کو طاقت بخشنی چاہی ہو۔

دیوار گیر کھلی کھڑکی سے ہوا کے جھونکے نے کمرے میں مداخلت کی ذرا سی کوشش کی۔ جو کامیاب ٹھہری تھی۔ میز پر پڑا سفید بے داغ کاغذ اڑنے کو ہی تھا، جسے بروقت تھام لیا گیا۔ اور ہوا کو اس کی شرارت پر خفگی سے دیکھا۔ کھڑکی کے کھلے

پٹ زور سے بند کرتے ہوا نے بھی جواباً ویسا ہی رد عمل دکھایا تھا۔

اس شخص کے سامنے میز پر عجیب سی بے ترتیبی تھی۔ جو اس کے ذہنی خلفشار کی عکاس تھی۔ مختلف اقسام کے رنگ، برشز، پنسل، ربڑ اور پنسل تراش سارے پہ پھیلے ہوئے تھے۔

''اب یہ پنسل کہاں گم ہوگئی۔'' اس نے میز کے کونے پر پڑا چشمہ اٹھا کر آنکھوں پہ لگایا اور چیزیں الٹ پلٹ کرنے لگا۔ پنسل ہاتھ میں لیے، شکر کا گہرا سانس کھینچ کر بکھری چیزوں کو بے دردی سے ایک

طرف دھکیلا اور خالی جگہ پر کاغذ رکھ کر کانپتے ہاتھ سے پہلی لکیر کھینچی۔ ہاتھوں کی لرزش میں ہلکی سی کمی واقع ہوئی۔ دوسری لکیر کھینچنے پر اعتماد تھوڑا اور بحال ہوا۔ پھر یکے بعد دیگرے وہ بے شمار لکیریں کھینچتا چلا گیا۔

سرما کے اواخر میں رات کے پہلے پہر فضا میں خنکی گھلی تھی۔ اس کے باوجود کرسی پر بیٹھا وجود بہت حد تک پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ کافی دیر تک ماہرانہ انداز میں کاغذ پر نقش و نگار بنانے کے بعد تھم گئے۔ کاغذ کو دونوں ہاتھوں میں تھامے اس نے اس آڑھے ترچھے نقش کو بغور دیکھا۔ چہرے پر چھائی خود اعتمادی پہلے مایوسی اور پھر بے بسی میں تبدیل ہوئی۔ آنکھوں کی سرخی میں تھوڑا اور اضافہ ہوا۔ ہاتھ میں پکڑی پنسل زور سے مٹھی میں دبائی اور کھلی کھڑکی سے باہر پھینکی۔ دوسرے ہاتھ میں بھینچے کاغذ کے کئی ٹکڑے کر کے میز کی سطح کے سپرد کیے۔ نظر دھندلا گئی۔ آنسوؤں نے رخسار نم کیے۔

”تم جاتے ہوئے میری ہر چیز ساتھ لے گئی ہو۔ میرا دھیان، سوچیں، خود اعتمادی اور۔ سب سے اہم چیز میری رنگوں سے محبت بھی۔“ سر ہاتھوں میں گرائے وہ کسی نادیدہ وجود سے مخاطب ہوا۔ کمرے کی ہر چیز افسردگی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ حتیٰ کہ دیوار پر سجی ایک بڑی فریم شدہ تصویر میں ٹھہرا، مسکراتا عکس بھی۔

☆☆☆

سورج کی نرم گرم شعاعوں سے ستاتی زمین پر بادلوں کا سایہ ابھرنے لگا تھا۔ جامد کھڑے درختوں کی شاخوں نے آسمان کی جانب دیکھا اور ہولے ہولے جھومتی بادلوں کو اپنے سنگ اڑانے لگیں۔ فلک کی وسعتوں کو بوسہ دیتے پرندے فضا کے سنگ اٹھکیلیاں کرتے گیت گانے میں مگن تھے۔

فن مصوری کی تاریخ میں اہم مقام رکھتے یہ اٹلی کے دارالحکومت روم کی سرزمین تھی۔ یہ وہی مقدس سرزمین تھی، جہاں یورپی فن تصویر کا آفتاب طلوع ہوا، اور اس کی شعاعیں تین صدی تک دیگر ممالک کو منور کرتی رہیں۔ یہیں اس فن کے خدا پیدا ہوئے۔ جن کے شاہکار صدیوں بعد بھی لوگوں پر اپنا سحر قائم کیے ہوئے تھے۔ اور آج بھی اس سرزمین کے کسی حصے میں، اس فن مصوری کے فن پارے لوگوں پر سحر طاری کرنے والے تھے۔ چونکہ ویکینڈ ہونے کی وجہ سے روم کے لوگ عدیم الفرصت تھے اور اپنی مصروفیت کو بہترین انداز میں صرف کرنے کے لیے اس عمارت کی طرف چلے آ رہے تھے۔ جو روم کیڈسٹرکٹ تریستیویئر کی ایک گلی میں پورے قد سے براجمان تھی۔

چند زینے طے کر کے عمارت کا مضبوط دروازہ باہیں پھیلائے فن کے دلدادہ لوگوں کو خوش آمدید کہہ رہا تھا۔ دروازے سے آگے ایک راہداری تھی، جو چند قدم چل کر ایک درمیانے سائز کے ہال میں اختتام پذیر ہو رہی تھی۔ یہ ایک مقامی نمائش ہال تھا۔ جس کی تین طرفہ دیواریں کریم رنگ سے رنگی تھیں۔ جن کی شفاف سطح پر مختلف فنکاروں کے دیدہ زیب فن پارے ان کی خوب صورتی میں اضافہ کر رہے تھے۔ ہال کا ماربل لگا فرش لوگوں کے بے ترتیب قدموں کی انہیں جذب کرنے کی ناکام کوشش میں ہلکان تھا۔ انفرادی اور گروہوں کی صورت میں تصویروں کے سامنے کھڑے لوگ ان کی توصیف میں مصروف تھے۔ بیک گراؤنڈ میں چلتی مدھم دھن، لوگوں کی سرگوشیاں غرض کہ آوازوں کا ایک جہان اس مقامی نمائش میں آباد تھا۔ راہداری کے بائیں جانب استقبالیہ ڈیسک تھا۔ جس کے پیچھے ایک اطالوی مرد ٹیلیفون ریسیور کان سے چپکائے مصروف نظر آ رہا تھا۔

”کیا یہاں آرٹ کے قدردانوں سے یہ سلوک کیا جاتا ہے کہ انہیں اپنے پسندیدہ مصور کے فن پارے بھی نہ ملیں۔“

استقبالیہ ڈیسک کے سامنے ایک نوجوان موجود تھا۔ جو کسی بات پر خفا نظر آ رہا تھا۔ کریم رنگ

کی شرٹ پینٹ اور نیلی جینز میں ملبوس، بالوں کو ہاتھوں کی مدد سے جماتے اس آدمی سے مخاطب ہوا۔ جبکہ ڈیسک کی دوسری جانب کھڑے آدمی، جس کی شرٹ پینٹ پر ہنری نام کا ٹیگ واضح تھا، نے ایک پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے اسے دیکھا اور کریڈل دبا کر نمبر دوبارہ ملایا۔ بالآخر کئی لمحے انتظار کی نظر ہونے کے بعد ائیر پیس سے آواز ابھری۔

''تمہارا دن اچھا گزرے ہنری۔'' سماعت کو ایک اطالوی لب ولہجہ سنائی دیا۔ یہ اطالوی زبان میں صبح بخیر کہنے کا طریقہ تھا۔

''میں سوچ رہا تھا کہ فضا میں تاریکی کیوں ہے؟ اب پتا چلا کہ روما کا اجالا تو ابھی تک سر منہ لپیٹے بستر میں دراز ہے۔''

ہنری نے اس آواز میں نیند کا غلبہ محسوس کرتے لطیف سا طنز کیا۔ تبھی روما کے آسمان میں گردش کرتی ہوا نے اڑان بھری اور کچھ دور واقع ایک کھلی کھڑکی کی دہلیز پر براجمان اس خوب صورت دوشیزہ کے لہجے کو اپنی سماعت میں اتارنے لگی۔

''تم مذاق کافی اچھا کرتے ہو انکل ہنری۔''

اجالا نے سنجیدگی سے اس کے طنز کا جواب دیا اور منہ کے آگے ہاتھ رکھ کر جمائی کی آواز کو اپنے تک محدود رکھنے کی ناکام کوشش کی۔ جبکہ دوسری طرف ہنری کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ جسے سن کر وہ خفیف سی مسکرائی۔

''خوش خبری یہ ہے کہ تمہاری دونوں پینٹنگز کے دام مسٹر ابراہیم لگا چکا ہے۔'' ہنری اب سنجیدگی سے فون کرنے کا مقصد بیان کر رہا تھا۔

''میں اسے اپنی پینٹنگز ہرگز نہیں بیچوں گی۔'' لہجے کی بشاشت ایک دم خفگی میں تبدیل ہوئی۔

''اچھے آرٹسٹ اپنے قدر دانوں کو ایسے نہیں دھتکارتے۔'' ہال میں داخل ہوتے چند مہمانوں کی طرف جاتا ہنری فون کا ریسیور نوجوان کو تھما کر، ایک مسکراہٹ اس کی طرف اچھالتا منظر سے غائب ہو چکا تھا۔ جیسے کہنا چاہتا ہو کہ ''دو لوگوں کی بحث میں تیسرے کا کیا کام؟''

اجالا نے ہنری کے بجائے ایک اجنبی لب و لہجہ سن کر موبائل فون کو حیرت سے گھورا۔ یوں جیسے موبائل اسکرین پر نمبر کی جگہ اس اجنبی کا چہرہ ہو۔

''کیوں خریدنا چاہتے ہو میری پینٹنگز؟''

فون کان سے لگائے مطلب کی بات پوچھی گئی۔

''کچھ کیوں ہر قسم کے جواب سے نابلد ہوتے ہیں۔ آپ اسے میری خواہش کہہ سکتی ہیں۔'' ہیزل گرین آنکھوں میں کسی خواہش کی چمک ابھری۔ جسے پورا کرنے کی چاہ اس کی زبان سے الفاظ کی صورت ادا ہوئی تھی۔

''کیسی خواہش۔؟'' عجلت میں پوچھا گیا۔

''وقت آنے پر بتاؤں گا۔'' نوجوان نے بات کو طول دینے کے لیے ایک احمقانہ بات کہہ ڈالی تھی۔

''[illegible] وقت آنے پر تمہیں اپنی پینٹنگز دوں گی۔'' اجالا کے جواب [illegible] ہال کی فضا میں سر بکھیر گیا۔ جسے خفگی سے [illegible] نظر انداز کر دیا گیا تھا۔

''تو تم یہ اقرار نہیں کرو گے کہ تم اجالا دی گریٹ آرٹسٹ کے ڈائی ہارٹ فین ہو۔'' ایک خوش فہمی نے دماغ کو تحریک دی جسے فوراً زبان زد کیا گیا۔

''بالکل نہیں۔'' ہونٹوں پہ آئی مسکراہٹ کو چھپاتے دو لفظ جواباً ادا کیے گئے۔

''تو پھر کیوں۔ روبرٹو، مارکو، جوزف پیس اور وارنر جیسے نامور فنکاروں کو چھوڑ کر تمہیں پوری گیلری میں صرف اجالا سرفراز کی پینٹنگز ہی کیوں اچھی لگیں۔؟'' وہ پچھلے پانچ سالوں سے اس سوال کا جواب جاننا چاہتی تھی۔ کہ آخر اس کی پینٹنگز ایک ہی نام کا شخص کیوں خریدتا ہے۔؟ اور اس کیوں کے آگے وہ تمام خوش فہمیاں تھیں جو اس نے خود سے پالی تھیں۔ جیسے کہ کوئی اس کی مصوری کا دلدادہ ہے وغیرہ وغیرہ۔

''کیا میں اتنی اچھی آرٹسٹ ہوں؟'' سوال دوبارہ دہرایا گیا۔ اس امید پر کہ شاید جواب حسب

digest library.com

منشا ملے۔

''میں نے ایسا کب کہا۔؟'' سوال کے بدلے کیے جانے والے سوال نے اجالا کو سر تا پیر سلگا دیا تھا۔

''تم۔'' غصے میں بلبلاتی اجالا کی بات درمیان میں ہی روک لی گئی تھی۔

''جی جی میں آپ کا پرانا قدر دان۔'' نوجوان نے ہنری کو آتے دیکھ کر مسکراہٹ چھپائی۔

''بہت شکریہ آپ کے قیمتی وقت کا۔ میں آپ کی محنت کو ہمیشہ سنبھال کے رکھوں گا۔ امید ہے آپ کا دن اچھا گزرے گا۔'' ہنری کے آتے ہی اس نے فون کریڈل پر ڈال دیا اور چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ سجائی۔ جیسے کہہ رہا ہو کہ ''دیکھا میں یہ پینٹنگز لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔''

''مبارک ہو مسٹر ایان ابراہیم۔'' ہنری نے ہاتھ اس کی طرف بڑھاتے مبارک باد سے نوازا۔ جسے خوش دلی سے تھامتے سر کے اشارے سے ''شکریہ'' کہہ کر وصول کیا گیا۔

ایان نے مڑ کر کچھ دور بائیں طرف دیوار پر ٹنگے ان دو فن پاروں کو دیکھا جو عنقریب اس کی کلیکشن کا حصہ بننے جا رہے تھے۔ لیکن اس کی مسکراتی آنکھوں میں حیرت در آئی تھی۔ ان پینٹنگز کے سامنے ایک ادھیڑ عمر آدمی کھڑا تھا۔ اس کی پیٹھ ایان کی طرف ہونے کے باعث وہ اس کا چہرہ دیکھنے سے قاصر تھا۔ لیکن اس کا حلیہ وہاں ٹھہرے ہر شخص کو ایک لمحے کے لیے ہی سہی پر اپنی طرف متوجہ ضرور کر رہا تھا۔ ڈھیلے سے ٹراؤزر شرٹ میں ملبوس، الجھے سفید بال، جن میں کہیں کہیں بھورا رنگ بھی سر اٹھائے جھانک رہا تھا کو ہاتھ سے جماتے وہ ان دو پینٹنگز کو بڑے انہماک سے تک رہا تھا۔ ایان نے سر جھٹکا اور باہر کی طرف قدم بڑھا گیا۔ وہ جس کام کے لیے گیلری میں آیا تھا وہ ہو چکا تھا اور اب اسے یہاں ٹھہرنا بے مقصد لگا تھا۔ یہ جانے بغیر کہ اس کا اصل مقصد یہیں اس سے چند قدم کے فاصلے پر تھا۔

جسے وہ انجانے میں پیچھے چھوڑے جا رہا تھا۔

☆☆☆

یہ تریستیو یر کی ایک معروف شاہراہ تھی۔ جس پر لوگوں کی بھیڑ دن کی نسبت سہ پہر کے وقت زیادہ تھی۔ جاتے سرما کی ٹھنڈی دھوپ لوگوں کو سمٹنے پر مجبور کر رہی تھی۔ لیکن اس کے باوجود لوگ ڈوبتے سورج کو خدا حافظ کہنے کے لیے روما کی سڑکیں آباد کر رہے تھے۔

سڑک کنارے فاصلے پر رکھے دو رخی بنچوں پر اکا دکا لوگ بیٹھے نظر آ رہے تھے۔ کوئی کلائی پر بندھی گھڑی کی سوئیاں تاک رہا تھا تو کوئی موبائل اسکرین پر نظریں جمائے سوشل میڈیا میں گم تھا۔ اور ان میں سے چند ایک لوگ ایسے بھی تھے، جو موبائل اور گھڑی کی ٹک ٹک سے پرے، سڑک پر چلتے لوگوں کو بلاوجہ تاڑنے میں مصروف تھے۔ غرض کہ وہاں بیٹھے سب لوگوں کی اپنی اپنی مصروفیت تھی۔ سوائے ان دو افراد کے جو ہر چیز سے بے نیاز اپنی سوچوں میں مگن تھے۔

''اس کی آنکھیں اتنی خوب صورت ہیں کہ پورے روما کی روشنیاں اس چمک کے سامنے سرنگوں ہو جائیں۔''

اس بات پر سامنے بیٹھے وجود نے اس میٹھے لہجے کی بلائیں لی تھیں۔ ماضی کے بند کمرے میں یاد کے جگنو نے روشنی پھیلائی تو اندھیرا سرک کر آوازوں کو راستہ دینے لگا۔

''اور جب وہ بولتا ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے......

''اجالا رک کر اس کی تعریف کے لیے کوئی خوب صورت سا لفظ ڈھونڈنے لگی۔ جس کے لیے اسے چند لمحے درکار تھے۔

اس نے آنکھیں میچ کر اس روشنی کو پرے دھکیلنا چاہا۔ لیکن وہاں ایسی بے شمار روشنیاں اسے حال سے ماضی کی طرف دھکیلتی نظر آ رہی تھیں۔

''جیسے۔؟'' سننے والی کی آنکھوں میں تجسس ابھرا۔ اجالا کا چہرہ اس اشتیاق پر اور بھی کھل اٹھا تھا۔

"جیسے کوئی محبت کرنے والا بحیرہ روم کے ساحل پر بیٹھا اپنے محبوب کے انتظار میں کیٹس کی نظم آئی سا بیلا گنگنا رہا ہو۔"

اس جواب پر بولنے اور سننے والے کے بیچ چند پل کی حیرت زدہ خاموشی آ ٹھہری تھی۔ اور اس کے بعد دو بھرپور قہقہے گونجے تھے۔ جن کی گونج سے اس کے اندر کی خاموشی بے چین ہو کر کرلانے لگی۔

"ماما۔" گلے میں ابھری گلٹی کو نگلتے اس نے آنکھیں جھپک کر پانی کے آگے بند باندھا تھا۔

"یادوں کی سب سے بری بات یہ ہی ہے کہ وہ آنکھوں کو کبھی خشک نہیں ہونے دیتیں۔ چاہے ان کا تعلق خوشی سے ہو یا غم سے۔"

کچھ دور بیٹھے ایان ابراہیم نے اس منظر کو دیکھتے کرب سے سوچا تھا۔ گھوم پھر کر، بل کھاتا یہ راستہ انجانے میں ہی سہی لیکن اسے بالکل ٹھیک جگہ لایا تھا۔ اس نے شرٹ کی جیب سے رومال نکال کر گود میں رکھا اور پنسل سے اس کے کونے پر کچھ تحریر کرنے لگا۔ ٹرام کی آواز پر فرصت سے بیٹھے مسافر جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ کچھ دیر پہلے کا سکون اب ایک شور کی کیفیت اختیار کر چکا تھا۔

رومال ہاتھ میں تھامے وہ قدم قدم کچھ دور بیٹھی اجالا کی طرف بڑھنے لگا۔ ہوا کے سنگ جھولتی شاخوں کے رقص میں اضافہ ہوا۔ پیروں تلے بچھی زمین اس کے قدموں کے ساتھ ساتھ دھڑکن کی آواز سے ہم قدم ہوئی۔ گردش ایام اپنے سارے کام روک کے ساکن ہو گئی۔ ایک حسین اتفاق واقع ہونے کو تھا۔

چند لمحوں بعد، پاس سے گزرتے اس نے رومال آہستہ سے اجالا کی گود میں رکھا اور رفتار تیز کرتا بھیڑ میں گم ہو گیا۔

گود میں رکھے رومال کو اجالا نے حیرت سے ہاتھ میں لیا اور دائیں جانب متلاشی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ آنکھوں میں نمی کے ساتھ حیرت بھی رقم تھی۔ ٹرام بتدریج آہستہ ہوتی ہوئی رک چکی تھی۔ سڑک کنارے کھڑے لوگ ٹرام میں سوار ہونے لگے تھے۔ اجالا نے بھی حیرت کو پس پشت ڈالا اور ٹرام میں سوار ہو گئی۔ کیونکہ ٹرام اس کی حیرت دیکھنے کے لیے انتظار کرنے والی نہیں تھی۔ دوسرے ہاتھ میں رومال ابھی تک اس کی مٹھی کی گرماہٹ جذب کر رہا تھا۔ اس نے الٹ پلٹ کر دیکھا اور ایک کونے پر اس کی آنکھیں ٹھہر گئی تھیں جہاں دو الفاظ "کارپ ڈائم" درج تھے۔ ٹرام میں کھڑے سیاحوں کے درمیان دو سبز آنکھیں اجالا کی طرف اٹھیں اور پھر سے باہر دوڑتے مناظر کو تکنے میں مصروف ہو گئیں۔

"اگر دل کا آنکھوں میں دھڑکنے کا احساس ایسا ہی ہوتا ہے تو اس پل ایان ابراہیم کا دل ان سبز آنکھوں میں دھڑکتا سنائی دے رہا تھا۔

☆☆☆

ٹرام سے اتر کر، کچھ دور چل کے وہ دائیں جانب مڑی۔ جہاں ایک سیدھی سڑک تھوڑی ڈھلوان میں تریستیو یئر کے مشہور اور قابل دید چوک پیازا دی اسپاگنا کی طرف جا رہی تھی۔ ڈوبتے سورج کے رنگ آسمان پر یوں دکھائی دے رہا تھے، جیسے کسی مصور نے سفید کینوس کو سلیقے سے جگہ جگہ رنگوں سے بھر دیا ہو۔ ہلکی تاریکی نے بھی اس کینوس پر جگہ بنائی۔

سڑک کے دونوں اطراف بنی دکانوں کے اندر اور باہر لگے قمقمے روشن ہو چکے تھے۔ سفید اور زردی مائل روشنی سے سجی دکانوں کے سامنے اور اندر کھڑے سیاح یقیناً اشیاء کی قیمتوں کو دیکھ کر کچھ بھی خریدنے کا ارادہ ترک کیے صرف ان کی خوب صورتی دیکھنے پر انحصار کر رہے تھے۔ کیونکہ یہ اسکوئیر مشہور ہونے کے ساتھ ساتھ بہت زیادہ مہنگا بھی تھا۔

یہاں دن رات سیاحوں کی تعداد ایک جیسی رہتی تھی۔ ریلے کی صورت بہتے سیاحوں میں ہر مذہب اور قوم کے لوگ شامل تھے۔ ایک دوسرے سے بچتا بچاتا ہر کوئی کالے مستطیل پتھروں کو اپنے جوتوں سے دھمکا رہا تھا۔ ان سب میں اجالا سرفراز

بھی تھی۔ اس کے پیروں کی دھمک بھی ان سب میں شامل ہو کر شدید شور کی صورت اختیار کر رہی تھی۔ چلتے چلتے اس کی نظر چند قدم آگے ایک گیارہ، بارہ سالہ بچے پر پڑی، جو اس جم غفیر میں راستہ بنانے کی کوشش میں بار بار پیچھے کی جانب دھکیلا جا رہا تھا۔ چند ثانیے نظریں جمائے رکھنے کے بعد وہ منظر اسے کوفت میں مبتلا کر گیا۔ چند لمحوں بعد بالآخر اس نے آگے بڑھ کر اس بچے کا ہاتھ مضبوطی سے تھاما اور تیز تیز چلتی سیاحوں کے سونامی کو کاٹ کر نسبتاً کم رش والے گوشے میں پہنچ گیا۔

جو تھے اسپینش اسٹیپس Spanish Steps۔ جو تاریخی چرچ کی بلند و بالا عمارت تک رسائی پہنچانے کے لیے بنائے گئے تھے۔ اوپر چرچ کی طرف جاتی ان گنت سیڑھیوں پر جوڑیوں اور گروہوں کی شکل میں بیٹھے سیاح مختلف مشاغل میں مگن تھے۔ ہاتھوں میں موبائل فونز کی روشن اسکرینز، سامنے رکھی کھانے کی اشیاء۔ باتیں اور بلند و بانگ قہقہے۔ اسپینش اسٹیپس پر بکھرے رنگ برنگ پھولوں کو دیکھ کر بتانا مشکل نہ تھا کہ بہار نے ہر طرف قدم جما لیے ہیں اور رنگوں نے فضا کو معطر کر دیا ہے۔

"تمہاری ماں کو تمہیں گھر سے نکلتے ہوئے رومال دینا چاہیے۔ مجھے بہتی ناک والے بچے بالکل پسند نہیں۔" اجالا نے ہاتھ میں پکڑے پرس سے رومال نکال کر بچے کی طرف بڑھایا۔

"کیا اس عمر میں تمہاری ناک نہیں بہتی تھی، یا تمہاری ماں تمہیں رومال دینا کبھی نہیں بھولی تھی؟"

بھورے رنگ کی پینٹ شرٹ جس کا رنگ مٹی نے اور بھی گندا کر دیا تھا۔ اس کے اوپر سبز رنگ کی صاف لیدر کی جیکٹ پہنے وہ بچہ کافی زیادہ حاضر جواب تھا۔ رومال کو غصے سے کھینچتے اس نے اپنی ناک رگڑی اور ارد گرد دیکھنے لگا۔

اسپینش اسٹیپس کے سامنے فوارہ بنا تھا۔ جس کے ارد گرد بیٹھے سیاح اسکوئیر کی خوب صورتی کو آنکھوں اور کیمروں میں مقید کر رہے تھے۔ وہیں کچھ فاصلے پر بائیں جانب ریستورانوں کی ایک لمبی قطار تھی۔ جن کے دروازوں سے بہتی اشتہا انگیز خوشبوئیں لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہو رہی تھیں۔

"اتنی باتیں بنانی آتی ہیں تو راستہ کیوں نہیں لینا آتا؟" اجالا نے اس کے کان کے قریب ہو کر قدرے بلند آواز میں کہا۔ لوگوں کے شور کے ساتھ ساتھ سڑک پر چلتی بگھیاں اور ان میں بیٹھے کاہل لوگ اسے اس وقت زہر لگ رہے تھے۔ باوجود اس کے کہ یہ رونق اس کی تنہائی کے لمحات میں بہترین رفیق [illegible]

"میں نے جب [illegible] لے رہا تھا۔" ارد گرد کا جائزہ لیتا بچہ اپنی بات سے اسے متحیر کر گیا۔ ہاتھ میں پکڑا رومال اس نے جیب میں اڑسا اور ذرا سا مسکرا کر آنکھ دبائی۔

"تو بتاؤ پھر کتنے پرس مارے ہیں آج؟"

اب کی بار حیران ہونے کی باری بچے کی تھی۔ لیکن وہ تاثرات چھپانے کے لیے رخ موڑ گیا۔ ہاتھوں کو باہم ملائے اس نے کن انکھیوں سے اجالا کو دیکھا۔ اجالا کے لب ہلکے سے پھیلے، یعنی اس کا تیر عین نشانے پر لگا تھا۔

"چلو لوگوں کے چہرے پڑھنے کا کچھ تو فائدہ ہوا۔" وہ دل ہی دل میں اپنی پیٹھ ٹھونکتی مسکرائی۔

اجالا سرفراز پیشے کے لحاظ سے ایک سائکاٹرسٹ تھی۔ اس کی اکثر شامیں اسپینش اسٹیپس پر بیٹھ کر لوگوں کے چہرے پڑھنے کی کوشش میں گزر جاتی تھیں۔ جن میں اب وہ کافی حد تک کامیاب بھی ہونے لگی تھی۔ ابھی بھی وہ فوارے کے گرد بنی پتھریلی فصیل پر بیٹھے لڑکے کو بغور دیکھ رہی تھی۔ جس کی سرمئی آنکھوں کی اداسی اس کے چہرے کی مسکراہٹ سے میل نہیں کھا رہی تھی۔ لیکن پھر بھی وہ مسکرائے جانے کی ناکام کوشش میں غلطاں تھا۔

"میں بھی یہ ہی کام کرتی ہوں۔" بے فکر

digest library.com

رہو، تمہیں پولیس کے حوالے بالکل نہیں کروں گی۔" بچے کی خاموشی نے اسے بولنے پر اکسایا۔

اس لڑکے کی نظروں کا مرکز دائیں ہاتھ بنی وہ قدیم عمارت تھی۔ جس کی ہر اینٹ سے جواں مرگ شاعر (کیٹس) کی محبت لپٹی تھی۔ محبت کے اس مقبرے پر حاضری دیتے وہ یقیناً اپنی لاحاصل خواہشات کا ماتم کر رہا تھا۔

آہ یہ بیچ راستے میں پیچھے چھوٹ جانے والوں کا کرب۔ اور اس سے لپٹی محبوب کی یاد کی امر بیل۔ جو سانس کو اذیت میں لپیٹ کر زندگی جیے جانے کی ترغیب دیتی ہے۔

"جیب کترنے کا پتا نہیں لیکن تم جھوٹ بہت برا بولتی ہو۔" بچے نے رخ موڑ کر اس کے حلیے پر نگاہ دوڑائی اور منہ بنا کر کہا۔

اجالا کے حلق سے ایک بلند قہقہہ برآمد ہوا جس پر اردگرد بیٹھے چند لوگ ایک پل کو متوجہ ہو کر دوبارہ اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ یہ ایسی ہی جگہ تھی جہاں کسی روتے ہوئے کو بھی ایک ثانیے دیکھ کر دوبارہ نظر ڈالنا بھی گوارا نہیں کیا جاتا تھا۔

"گھر کہاں ہے تمہارا؟۔ تمہیں تمہاری مطلوبہ سواری پر بٹھاؤں۔"

درختوں پر اونگھتا اندھیرا آنکھیں کھولے سارے میں پھیلنے لگا تھا۔ اس کی نظریں فوارے کی طرف اٹھیں۔ لڑکا اب وہاں موجود نہیں تھا۔ لیکن عین اس جگہ اجالا کو اس کی اداسی نظر آئی۔ جس کا ہاتھ وہ بے دھیانی میں چھوڑ کر جا چکا تھا۔ جو چیز بوجھ لگنے لگے اس کا ہاتھ دھیان یا بے دھیانی میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ پھر چاہے وہ اداسی ہو یا محبت۔ اس نے سر جھٹکا اور سوالیہ انداز میں بچے کی طرف دیکھا۔ جس کی نظریں اب بھی لوگوں کے مشاغل پر جبکہ حسیات اجالا کے سوال پر ہی تھیں۔

"کچھ لوگ ایسے گھروں سے محروم ہوتے ہیں، جن کے باہر ان کے نام کی تختی لگی ہو۔ امید ہے ہم دوبارہ کبھی نہیں ملیں گے۔" اتنا کہہ کر وہ اسپینش اسٹیپس کی سیڑھیاں پھلانگتا بھیڑ میں گم ہو گیا۔

اس کے فلسفے پر اجالا نے ایک لمبی سانس ہوا کے سپرد کی اور اپنے مطلوبہ راستے کی طرف بڑھنے لگی۔ کالے پتھروں سے بچی زمین اس کے علاوہ کسی اور کے قدموں کی حرکت سے بھی گونج رہی تھی۔ ڈھلوانی گلیاں عبور کرتے اس نے ایک پل کو رک کر اس آہٹ کو محسوس کیا اور انجان بنتی آگے بڑھنے لگی۔ اسٹریٹ کیفے کے سامنے لگی میزیں لوگوں سے آباد تھیں۔ جو اپنے من پسند کھانے کھا کر بھوک مٹانے کے ساتھ باتوں میں مشغول تھے۔ آوازیں، شور، بلند و بانگ قہقہے۔ اور ان سب میں دھڑکتی زندگی۔ اس نے آنکھوں میں ٹھہری محرومی کو کڑوے گھونٹ کی طرح اندر اتارا۔ کچھ لمحے مسلسل چلتے رہنے کے بعد وہ اپنی مطلوبہ گلی میں داخل ہو چکی تھی۔ اس کے چلتے قدم ایک دروازے کے سامنے رک گئے۔ جس کے اوپر ایک چھوٹا سا لیمپ روشن تھا۔ پرس سے چابی نکالتے اسے قدموں کے ساکت ہونے کی آواز آئی۔ اس نے نظر انداز کیا اور لاک میں چابی لگائی۔

"کیا معاف کرنا تمہارے اختیار میں نہیں۔ یا میری غلطی اتنی بڑی ہے کہ......" التجا کرتے ہونٹ ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔ مضطرب نظریں اجالا کی پیٹھ پر جمی روز کی طرح فیصلہ سننے کی منتظر تھیں۔

"گناہوں پر معافی نہیں سزا ملتی ہے۔"

دروازہ کھولتے ہاتھ تھم گئے۔ دروازے کے ہینڈل کو مضبوطی سے تھامے اس نے ہاتھ کی لرزش پر قابو ڈالا۔ لیکن آواز کی کپکپاہٹ نے بھرم کو چور چور کر دیا تھا۔

"اور پتا ہے سزا دینے میں سب سے زیادہ تکلیف دہ بات کیا ہے۔؟" گلے میں پڑی ان گنت گرہوں نے آواز کا راستہ روکا۔ جنہیں زبردستی نگلا گیا۔ "کسی اپنے کو سزا دینے کا مطلب خود کو بھی تا عمر اس آگ میں جلانا ہے، جس میں آپ نے اپنے

اس پیارے کو پھینکا ہو۔"

بات مکمل کر کے اس نے دروازہ جھٹکے سے کھولا اور اندر داخل ہوئی۔ دروازہ واپس زور سے بند کر کے لاک کیا اور سیڑھیاں پھلانگتی پہلی منزل پر آ گئی۔ تیز تیز زینے طے کرنے سے اس کا سانس بے ترتیب ہو گیا تھا۔ ریلنگ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اپنا سانس بحال کرنے لگی۔ آنکھوں میں ٹھہرا نیر گالوں پر بہہ رہا تھا۔ لیکن اس بے ریا پانی میں وہ دکھ شامل نہیں تھے جو آتی جاتی سانسوں پر بھاری سل کی مانند قابض تھے۔ کاش کہ دکھ و تکلیفیں بھی آنکھوں کے ذریعے بہائی جا سکتیں۔ کاش۔

سارا گھر اندھیرے کی چادر میں گم کہیں سے روشنی کی ایک ہلکی سی کرن کے انتظار میں تھا۔ اس نے دیوار پر لگے سوئچ بورڈ پر ہاتھ مارا۔ روشنی نے اندھیرے کو نگل کر ہال کی ہر چیز کو واضح کیا۔ اس چار دیواری کی اندرونی دنیا ویسی ہی تھی۔ دیواروں سے لپٹی وحشت۔ خاموشی کی گمبھیرتا۔ اور چاروں کونوں میں قبضہ جمائے سونا پن۔

سب چیزوں سے نظریں پھیرے وہ دائیں جانب بنے اپنے کمرے میں آ گئی۔ جہاں پورا دن آنکھوں میں انتظار لیے، تنہائی اس سے بغل گیر ہونے کو بانہیں پھیلائے کھڑی تھی۔ اس نے خاموشی سے خود کو اس حصار کے سپرد کیا اور آنکھیں موندے اپنے تھکے وجود کو آرام دینے لگی۔

کمرے میں تنہائی کے علاوہ ایک اور چیز کا اضافہ ہوا تھا۔ بے پناہ افسردگی۔

☆☆☆

کوئی بھی سفر مشکل نہیں ہوتا، مشکل ہے واپسی۔ اور ایسی واپسی جس میں آپ کے دامن میں سوائے شرمندگی کے اور کچھ نہ ہو۔ تھکے قدم بے مقصد گلیوں میں پھرتے واپسی کے سفر پر گامزن تھے۔

"میں نے کبھی بھی بہت لمبی عمر کی دعا نہیں مانگی۔ پر اب میں چاہتی ہوں کہ میں تمہارے ساتھ روما کی ساتھ، ستر بہاریں دیکھوں۔" اسٹریٹ کینڈے کے باہر ادھیڑ عمر جوڑے کو دیکھ کر دماغ کچھ بھولی بسری باتیں یاد دلانے لگا تھا۔

"صرف بہاریں دیکھنی ہیں تو باقی تین موسم میں کس کے ساتھ دیکھوں۔؟" مقابل نے حیرت سے سوال کیا۔

کانپتے ہاتھ سے آنکھوں کی دھندلاہٹ صاف کی اور جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک ڈبیا نکالی۔

"اپنی بیٹی کے ساتھ۔ کیونکہ مجھے پھولوں کے رنگ باقی سارے موسم کے رنگوں سے زیادہ دلفریب لگتے ہیں۔" ایک اور آواز اس کی سماعت کے رستے پر پاؤں دھر چکی تھی۔

قدم روک کر اس نے جلدی سے ڈبیا کا ڈھکن کھول کر اسے ہاتھ پر انڈیلا۔ پر اس کی ہتھیلی میں سوائے خالی پن کے کچھ نہ آیا۔

"کیوں کہ رنگوں سے پر اسی موسم میں ہم ملے تھے۔"

"ہم اپنی بیٹی کا نام اجالا رکھیں گے۔"

"میرے بعد اجالا کو تنہا مت ہونے دینا۔"

"تم دونوں اب ایک دوسرے کا سہارا بننا۔"

آوازیں بڑھتی جا رہی تھیں۔

ایک شور تھا جس نے دل و دماغ کو بے قابو کرنا شروع کیا۔ اس نے ڈبیا ایک طرف پھینکی اور کانوں پر ہاتھ رکھتا تیز تیز قدموں سے گلیاں عبور کرنے لگا۔ کوئی اس کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگا تھا۔

وحشت۔ درد۔ اور اداسی۔

☆☆☆

تریستیویر کے تمام چوک رات کے پہلے پہر اطالیہ کے مقامی لوگوں سے بھرنے لگے تھے۔ اشیاء خورد و نوش اور تمام کاروباری دکانوں کے دروازوں کو تالا لگ چکا تھا۔ یہ وقت ان لوگوں کے جاگنے کا تھا جو دن بھر سوئے اپنے مال کو دوگنا کرنے کے خواب دیکھنے میں مگن رہتے تھے۔ شہر کے تمام کلب و بارز کے اندر کی دنیا مہلک مشروبات اور نشے کی بو سے

مہک اٹھی تھی۔ تریسٹھویں سیر کی ہی ایک گلی میں قائم یہ ایک چھوٹا سا میڈیکل اسٹور تھا۔ جس کے باہر جلتا سائن بورڈ اس کے کھلے ہونے کی تصدیق کر رہا تھا۔ کاؤنٹر کے پیچھے کھڑے ایان نے کلائی موڑ کر وقت دیکھا۔ گھڑی کی دونوں سوئیاں دس کے ہندسے پر اکٹھی ہو چکی تھیں۔ اس نے اپنا سفید کوٹ اتار کر کھونٹی پر لٹکایا اور چابی اٹھا کر کاؤنٹر سے باہر آنے کی پیش رفت کی ہی تھی۔ جب عین اسی پل گلاس ڈور دھکیل کر ایک ادھیڑ عمر آدمی کو داخل ہوتا دیکھ کر وہ دوبارہ کاؤنٹر کے پیچھے چلا گیا۔ اس آدمی نے کاؤنٹر پر پرچی رکھ کر مطلوبہ دوائی کی نشان دہی کی۔ ایان نے بنا کسی حیرت کے الماری سے دوائی کی ڈبی نکال کر کاؤنٹر پر رکھی۔ آدمی کی ظاہری حالت بتا رہی تھی کہ اسے کسی ماہر نفسیات کی ہی ضرورت ہے۔

''کیا سائنس نے ایسی کوئی دوائی ایجاد نہیں کی جو ہمیں ماضی کی تلخ باتیں بھلانے میں مدد دے۔'' اس آدمی کے ہاتھ میں کافی کا کپ تھا، جس سے گھونٹ بھرتا وہ ایان سے سے مخاطب ہوا۔ جیب سے پیسے نکال کر اس نے کاؤنٹر پر رکھے۔ اور ایان کی طرف جواب طلب نظروں سے دیکھا۔

''ماضی تلخ ہو یا خوش گوار وہ ہمیشہ حال اور مستقبل کا حصہ رہے گا۔ بھولنے سے بہتر ہے کہ اسے قبول کیا جائے۔'' ایان نے کاؤنٹر سے پیسے اٹھا کر دوا کی تھیلی آدمی کے ہاتھ پر رکھی اور باہر نکل آیا۔

''قبول کرنا ہی تو مشکل امر ہے ینگ مین۔''

''کیا میں آپ کو گھر تک چھوڑ دوں؟''

بکھرے بال اور ملگجے حلیے والا وہ آدمی اس وقت ایان کو اپنے ہوش و حواس میں نہیں لگ رہا تھا۔

''اگر تمہیں کوئی تکلیف نہ ہو تو، ساتھ چلنے میں مجھے کوئی عذر نہیں۔ میرا نام سرفراز ہے۔'' ایان کی پیش کش قبول کرتے ہی آدمی نے اپنا تعارف کروایا۔

''مجھے ایان کہتے ہیں۔'' روشنی گل کرتے ایان نے اپنا نام بتا کر دروازہ کھولا۔ سرفراز کے باہر نکلنے کے بعد اس نے گلاس ڈور بند کر کے اسٹور کو تالا لگا کر چابی جیب میں منتقل کی۔

''یہ اسٹور تمہارا ہے یا یہاں کام کرتے ہو؟'' قدموں میں حرکت آتے ہی سرفراز نے سوال داغا۔ آسمان پر ساکت کھڑے ستارے ان کے ہم سفر بن گئے تھے۔

''یہ اسٹور میرے والد صاحب نے بنایا تھا۔ اب ان کی وفات کے بعد یہ میری ملکیت ہے۔ وہ ڈاکٹر تھے اور مجھے بھی ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے۔ لیکن ان کی وفات نے ہمارا یہ خواب پورا نہیں ہونے دیا۔''

ہوا کی ٹھنڈک سما باندھ رہی تھی۔ فاصلوں پر لگے اسٹریٹ لیمپس کی زرد روشنی نے فضا کو بھی زرد رنگ اوڑھا دیا تھا۔ باقی کا فاصلہ تقریباً خاموشی کی نظر ہو گیا۔ یہ ایک سیدھی جاتی گلی کا آخری موڑ تھا۔ جہاں نکڑ پر بنے ایک کافی ہاؤز کے سامنے سرفراز کے قدم جامد ہوئے۔

''تمہارا شکریہ بیٹا۔ یہ چھوٹا سا کیفے میرا ہے۔ آؤ تمہیں کافی پلاؤں۔'' سرفراز نے خوش دلی سے دعوت دی۔ اور جیب سے چابی نکالتے دروازے کی جانب رخ موڑ گئے۔

''پیراڈائز لاسٹ'' ایان نے کیفے کا نام زیرِ لب دہرایا۔

کیفے کے دروازے کے اوپر دائیں جانب دیوار پر ایک سائن بورڈ آویزاں تھا۔ جس پر کندہ اپنی طرز کا یہ عجیب اور منفرد نام پہلی نظر میں لوگوں کو متوجہ کرنے کی طاقت رکھتا تھا۔ ایان نے ایک نظر وقت کی رفتار کو دیکھا۔ اور گہری سانس اندر کھینچتے سرفراز کی تقلید کی۔

''یقیناً میری طرح تمہارے گھر میں بھی تنہائی کے علاوہ کوئی بھی تمہارا منتظر نہیں ہوگا۔'' بتیاں روشن کرتے کے ساتھ وہ اندازے لگانے میں مصروف تھے۔

خوابیدہ ماحول یکدم بیدار ہوا۔ مدھم روشنیوں

نے ایان کو خوش آمدید کہا۔ در و دیوار حیرت سے اس اجنبی کو تکنے لگے۔ جو بے بسی سے اس باتونی شخص کو دیکھتا اندر داخل ہو رہا تھا۔ کافی ہاؤس چھوٹا لیکن اس کا ماحول کافی دلکش اور توجہ طلب تھا۔ جس کا نقشہ کچھ یوں تھا۔

دروازے سے داخل ہوتے ہی بالکل سامنے چند قدم کے فاصلے پر بائیں جانب چھوٹا سا کاؤنٹر تھا۔ کیفے ہال میں دائیں بائیں ترتیب سے لگیں میزیں اور ان کے گرد کرسیاں جچی تھیں۔ کیفے کی دائیں اور بائیں جانب کی دیواروں پر مختلف شخصیات کے فریم شدہ اسکیچز آویزاں تھے۔ اور ان اسکیچز کی خوب صورتی میں اضافے کے لیے ان کے گرد فیری لائیٹس لگی تھیں۔ ایان کی کوفت لمحے میں ہوا ہوئی۔ سرفراز نے کاؤنٹر کے ایک جانب رکھا آرکسٹرا پلے کیا۔ ایان نے چونک کر اس طرف دیکھا۔

”مجھے افسوس ہے کہ میں پہلے اس کیفے میں کیوں نہیں آیا؟“ اسکیچز کو قریب سے دیکھتے ایان نے اس لاعلمی پر خود کو کوسا۔

کاؤنٹر کے پیچھے کھڑے سرفراز اس کی بات پر مسکرائے۔ کافی مشین کے چلتے ہی بھینی بھینی خوشبو نے پورے ہال کا احاطہ کیا۔ دو مگ کافی کے بھر کے انہوں نے کاؤنٹر ٹیبل پر رکھا گیا۔

ایسے دن ہوتے ہیں جن میں میں سوتا نہیں۔

تمہارے بارے میں سوچتا ہوں۔

میں گھر میں بند ہوں اور خاموشی میری دوست ہے۔ Ricchi E Poveri (رکی اے پووری) کی آواز آرکسٹرا سے نکلتی کیفے میں پھیلتی جا رہی تھی۔ مسکراہٹ نے ایان کے لبوں کو چھوا۔ وہ قدم قدم چلتا کاؤنٹر کے سامنے پہنچ کر ایک کرسی سنبھال گیا۔

جبکہ شیشوں کے پیچھے برف گر رہی ہے،

میں یہاں آگ کے پاس تمہارا منتظر ہوں۔

سحر ٹوٹنے کی بجائے بڑھتا جا رہا تھا۔ اس نے کپ اٹھا کر سپ لیا۔ کافی کے خوش گوار ذائقے کا اندازہ اس کے چہرے کے تاثرات سے بتا چل رہا تھا۔ آمنے سامنے بیٹھے دو لوگ خاموش تھے لیکن اس کیفیت کو دو دل اچھی طرح محسوس کر رہے تھے۔ جو [illegible] باندھے چل پڑی تھی۔

کہ یہ بھی افسوس ناک ہے، بہت طول شام

تمہارے بغیر مزید نہیں رہے گی۔

”موسیقی میں آپ کی پسند قابل داد ہے۔“ نظم کے بول اسے تعریفی کلمات ادا کرنے پر مجبور کر گئے۔

”موسیقی زندگی کی سب سے بڑی عطاء ہے۔“ سرفراز نے کاؤنٹر کے ایک دراز سے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر نکالا۔ ایک سگریٹ منہ میں رکھ کر سلگایا۔

میں نے چاند سے بھی پوچھا ہے وہ نہیں ہے

یہ مزید میرے ساتھ نہیں رہنا چاہتا۔

خاص کر ان لوگوں کے لیے جنہیں یہ دنیا جینے کی جگہ سے زیادہ موت کا کنواں لگتی ہے۔“ سگریٹ کے کش نے حلق کڑوا کیا۔

میں گھر میں بند ہوں اور خاموشی میری دوست ہے۔

بادل کی گرج نے آرکسٹرا کی آواز کو دبایا۔ ایان نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ جل تھل ہونے کے آثار نے گھر جانے کی جانب توجہ دلائی۔

”آپ جیسے اچھے آرٹسٹ سے مل کر خوشی ہوئی؟“ کپ پیندے تک خالی ہو چکا تھا۔ اس نے کاؤنٹر پر کپ رکھا اور اٹھ کر ہاتھ سرفراز کی جانب بڑھایا۔ وہ جیسے گہری نیند سے چونک اٹھے۔ یہ چونکنا انہیں ہمیشہ تکلیف میں مبتلا کر دیتا تھا۔

”یہ تو شوق تھا جو ماضی کے دھندلکوں میں گم ہو گیا ہے۔“ گرم جوشی سے ہاتھ تھامتے انہوں نے اداسی سے کہا۔

”میں اس شوق کے مسودے دیکھنے دوبارہ ضرور آؤں گا۔“

digest library.com

ایان نے ہاتھ چھڑایا اور دروازے کی جانب قدم بڑھانے لگا۔ لیکن پھر وہ درمیان میں ہی رک کر دوبارہ مڑا اور سرفراز کی پشت پر دیوار پر آویزاں اس پورٹریٹ کو دیکھا۔ ایک مسکراہٹ نے اس کے چہرے کا گھیراؤ کیا۔ اب وہ تیز تیز قدم اٹھاتا باہر نکل گیا۔

آرکسٹرا کی آواز مدھم ہو چکی تھی۔ افسردگی نے اپنے پر آہستہ سے کھولنے شروع کیے۔ اور سارے میں پھیلتی چلی گئی۔ کاؤنٹر کے پیچھے، دو اداس آنکھیں ابھی سے اس انتظار میں دن گننا شروع ہو چکی تھیں۔ جس کا اختتام قسمت کے ہاتھ میں تھا۔ اور قسمت اتنی آسانی سے کوئی بھی چیز دان نہیں کرتی۔

☆☆☆

ٹپ ٹپ برستی بارش کھڑکی پر دستک دیتی اسے اپنی جانب متوجہ کر گئی۔ کچھ دیر پہلے کی بے حسی چھٹنے لگی۔ تنہائی کے بازو بری طرح جھٹکتے وہ اٹھ کر لاؤنج میں آ گئی۔ جہاں ایک طرف بنے اوپن کچن میں آ کر اس نے الماری سے کپ اور کافی کی شیشی نکالی اور کافی بنانے لگی۔ دائیں طرف کھڑکی کے سامنے رکھی روکنگ چیئر ہوا کے جھونکے سے جھولنے لگی۔ اجالا کی نظریں اس پر ٹھہر گئیں۔ اچانک کرسی کے پاس دو ہیولے نمودار ہوئے اور اس کی توجہ کا مرکز بن گئے۔

"سارا دن اس کھڑکی سے باہر کیا چیز آپ کی نظروں کا مرکز رہتی ہے؟ جو آپ بور نہیں ہوتیں اور بنا اپنے اعصاب تھکائے یہاں بیٹھی رہتی ہیں۔" اجالا نے برش اور کلر پیلٹ ایک طرف رکھے۔ ریوالونگ چیئر کے پاس آ کے بوڑھے کندھوں کو اپنے بازوؤں کے حصار میں لیا۔

"پھولوں کے کھلنے کی آواز سنتی ہوں۔ جیسے دور کہیں بانسری کی مدھر دھن اداس بیٹھی دوشیزہ کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دے......" مسز جوزف نے اپنے کانپتے ہاتھ میں اجالا کا ہاتھ تھامتے کہا۔

"ہوا کی اٹکھیلیاں دیکھتی ہوں جو کبھی الہڑ مٹیاروں کے بالوں کے خم کھولتی ہے، تو کبھی کھڑکی سے کان لگائے عورتوں کی طرح باتیں سننے لگتی ہے......" ان کی نظریں ابھی بھی کھڑکی کے پار ہوا کی شرارت پر تھیں۔ "دیکھو یہ ہوا تمہاری اور میری باتیں سن کر مسکرا رہی ہے۔"

اجالا ان کے چہرے پر پھیلی معصومیت دیکھ کر مسکرائی تھی۔

"اور وہ جو سامنے درخت ہے نا......" مسز جوزف نے شہادت کی انگلی سے کھڑکی کے پار نظر آتے درخت کی طرف اشارہ کیا۔ جس کی شاخیں ہوا کے زور سے لہرا رہی تھیں۔ "وہاں ایک اداس چڑیا روز ٹہنی پر بیٹھی اپنی سکھیوں کو آوازیں دیتی ہے۔ ان دنوں کو یاد کرتی ہے۔ جب وہ ایک ساتھ اس نیلے آسمان میں اڑان بھرتی خوشی کے گیت گاتی تھیں......" ان کی آواز میں اس چڑیا جیسی ہی چہکار تھی۔ "سوچتی ہوں انسان اگر قدرت کو قریب سے دیکھنا شروع کر دے تو وہ ان دنیاوی چیزوں سے کبھی دل نہ لگائے۔" مسز جوزف نے ایک لمبی سانس خارج کی۔

"اس دنیا میں زندہ رہنے کے لیے یہ دنیاوی چیزیں بہت ضروری ہیں نینی۔ ہم بھوک لگنے پر پھولوں کی پتیوں سے پیٹ نہیں بھر سکتے۔ سردی لگنے پر پتوں کا لباس بنا کر سرد ہوا سے بچنے کا ذریعہ صرف پرانے دور کے انسانوں کے پاس تھا۔" وہ مسز جوزف کے پاس سے اٹھ کر دوبارہ کینوس کے سامنے آ گئی۔

"تم سب سے ضروری چیز گنوانا بھول گئی ہو میری بچی۔"

انہوں نے ذرا سا رخ موڑ کر اجالا کی طرف دیکھا۔ جو ہاتھ میں برش تھامے کینوس پر اسٹروک لگا رہی تھی۔

مسز جوزف کی بات پر اس نے ہاتھ روک کر سوالیہ نظروں سے ان کی جانب دیکھا۔

"دنیا میں جینے کے لیے سب سے ضروری چیز

رشتے ہیں۔ جن کی کمی انسان کو مارنے کے لیے کافی ہوتی ہے۔"

کافی چھینٹتے ہاتھ تھم گئے۔ ان گنت لمحے سرک کر ماضی کا حصہ بن گئے۔ کپ شیلف پر رکھ کر وہ آہستہ سے چلتی خالی کرسی کے پاس آ ٹھہری۔ آنکھوں سے بہتے گرم سیال نے گال بھگوئے۔

"آپ کی اجالا مر رہی ہے نینی۔ میرے پاس جینے کے لیے کوئی رشتہ نہیں بچا، کوئی رشتہ نہیں۔" رولنگ چیئر کے پاس بیٹھتے وہ نینی کے لمس سے مخاطب تھی۔

"سب مجھے چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ آپ، ماما، وقار اور......" اس اور کے آگے اس کے ہونٹ مقفل ہو گئے۔ بچھڑے رشتوں کی یاد میں آنکھیں پھر سے اشک بہانے لگی تھیں۔

اس وقت کھڑکی کے باہر اور اندر ایک سا موسم تھا۔ جل تھل کا موسم۔

☆☆☆

"جب بارش ہوتی ہے تو لگتا ہے آسمان کسی کی تکلیف پر آنسو بہا رہا ہے۔ کسی ایسے انسان کی تکلیف پر، جس کے پاس سر رکھ کر رونے کو کوئی کاندھا نہیں ہے اور نہ آنسو پونچھنے کے لیے کوئی مہرباں ہاتھ۔"

ایان نے دیوار پر ٹنگی اس پینٹنگ پر ہاتھ پھیرا۔ مختلف رنگوں سے سجی وہ پینٹنگ کسی کی اصل زندگی کی کہانی تھی۔ جس میں ایک لڑکی بارش میں چھتری لیے کھڑی ہونے کے باوجود سر سے پاؤں تک پانی میں شرابور نظر آ رہی تھی۔ پینٹنگ کے کونے میں آرٹسٹ کا نام بھی درج تھا۔ "یو ایس" اس کا ہاتھ اس نام پر رک گیا۔ کچھ دیر وہ اس نام کو دیکھتا رہا اور پھر کھڑکی کے پاس آ گیا۔ اس نے کھڑکی کے باہر بھیگتے شہر کو دیکھنے کی کوشش کی۔ جہاں دور تک سوائے روشنیوں کے اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ آسمان پر ابھی تک بادلوں کی حکمرانی اور اندھیرے کا راج تھا۔ جو وقتاً فوقتاً اپنی زوردار گرج سے روما کے باسیوں کو ہراساں کر رہے تھے۔ تب ہی دو اداس آنکھیں کھڑکی کے شیشوں پر نمودار ہوئیں۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ان آنکھوں کو چھوا جن میں چھپا اضطراب اس کے دل کو بے چین کر رہا تھا۔

"یہ آنکھیں ہنستی اچھی لگتی ہیں اور میں انہیں ہنسنے پر مجبور کر دوں گا۔" خود سے عہد کرتا وہ اپنی ہی بات پر مسکرایا۔

مضطرب آنکھیں پانی میں بہہ گئی تھیں۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر سلائیڈنگ ڈور ایک طرف کھسکایا اور دیوار سے ٹیک لگائے ہوا میں بڑھتی ٹھنڈک کو محسوس کرنے لگا۔

☆☆☆

روم کی صبح غیر معمولی طور پر روشن اور نکھری ہوئی تھی۔ رات بھر پانی برساتا آسمان حد سے زیادہ شفاف دکھائی دے رہا تھا۔ مارچ کے آخری ایام کا سورج روما کے باسیوں کے لیے زندگی سے بھرپور حرارت لے کر بیدار ہوا تھا۔ جس کی تمازت نے ٹھٹھرتے جانداروں کو نئی توانائی بخشی تھی اور ہر کوئی اس حسین صبح کی بیداری پر اپنے بازو وا کیے معمول کے کام نمٹانے چل دیا تھا۔ غرض کہ ہر طرف زندگی کو نیند سے بیدار ہوئے کئی گھنٹے گزر چکے تھے۔ سوائے ان چند لوگوں کے۔ جنہیں نیند کی پناہ ہر فکر و غم سے آزاد رکھتی ہے۔ جن کے لیے زمین و آسمان کا تغیر ہر چیز سے ماورا ہے۔

یہ ایک چھوٹے سے کمرے کا اندرونی منظر ہے۔ جہاں دن کی روشنی نے اجالے کو سمیٹ لیا تھا، مگر رات کی خاموشی کے تباہ کن آثار ابھی بھی موجود تھے۔ جہاں آنکھیں نیند کی وادی میں گم تھیں۔ جبکہ خواب کمرے کے کونے کھدروں میں بھٹک رہے تھے۔ کیونکہ انہیں ان کی واحد جائے پناہ سے دربدری کا حکم ملے برسوں گزر چکے تھے۔ پر واپسی کا بلاوا تا حال ندارد تھا۔

دائیں جانب دیوار گیر کھڑکی سے آتی ٹھنڈی ہوا نے بستر پر دراز اجالا کو کسمسانے پر مجبور کیا۔ اپنے

اردگرد ہاتھ مارتے اس نے لحاف کا کونا پکڑ کر کھینچا اور آنکھیں دوبارہ بند کیے نیند کی بانہوں میں جانے لگی تھی، لیکن تب ہی کھڑکی میں آن بیٹھی ایک چڑیا نے اپنی میٹھی آواز سے کمرے کی دبیز خاموشی کو ختم کیا۔ اجالا نے مسکرا کر کروٹ بدلی اور چڑیا کی طرف دیکھا

"صبح بخیر پیاری دوست۔" چڑیا اس کی زبان سے نابلد پھر سے چوں چوں کرتی روما کی فضا میں اڑان بھر گئی تھی۔

"اوہ نو۔" آنکھیں بند ہوتے ہی دوبارہ جھٹکے سے کھلی تھیں۔

"سالگرہ مبارک ماما۔" بستر سے اٹھتے ہی اس نے مسکراتے ہوئے سامنے دیوار پر لگے اسکیچ کی طرف دیکھا اور تیار ہونے کے لیے چل دی۔

تریستویر کی بل کھاتی اور ڈھلوانی گلیوں سے گزر کر وہ کچھ دیر بعد اپنی منزل کے سامنے تھی۔ کلائی پر بندھے وقت کی رفتار کو تکتے اس نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئی۔ دروازے کے عین اوپر لگی اطلاعی گھنٹی کھنکھنا اٹھی۔

تریستویر کی گلیوں میں آباد یہ ایک چھوٹا سا کافی ہاؤز تھا۔ جس کے گلاس ڈور پر کلوزڈ کا کارڈ آویزاں ہونے کی وجہ سے لوگ دروازے سے ہی واپس پلٹتے جا رہے تھے۔ جبکہ کافی ہاؤز کا اندرونی منظر اس کارڈ پر لکھے الفاظ سے بالکل مختلف تھا۔ کافی ہاؤز کے بند دروازے کے پار ہال میں ترتیب سے میزیں لگی تھیں اور ان کے گرد چنی کرسیاں بچوں اور ادھیڑ عمر لوگوں سے پر تھیں۔ ہال کی بائیں طرف دیوار کے سامنے کاؤنٹر تھا اور دروازے کے مخالف بالکل سامنے والی دیوار کے آگے ایک کرسی رکھی تھی۔ جس پر ایک موسیقار براجمان تھا۔ جو وائلن کو کندھے پر رکھے، گردن ایک طرف جھکائے، اپنے دونوں ہاتھوں سے وائلن کی تاروں سے کھیلتا دھن ترتیب دیے ہوئے تھا۔

اجالا کے بڑھتے قدموں کے ساتھ دل کو بھی اس ساز نے اپنی لپیٹ میں لیا۔ وہ تھم گئی تھی۔ کیفے میں موجود ہر چیز کی طرح۔

کھڑکی سے گرتی دھوپ کی طرح۔

دیواروں سے لپٹی خاموشی کی طرح۔

اور بہتی ہوا کی اٹھکیلیوں کی طرح۔

گو کہ کیفے کی ہر چیز ہی کسی جادو کے زیر اثر تھی۔ تار سے نکلتی دھن اس کی دھڑکنوں سے چھیڑ خانی کرنے لگی تھی۔ زمین پر مضبوطی سے جمے پاؤں بلاوجہ ہی ہوا میں اڑان بھرنے کو مچلنے لگے تھے۔ سماعت اس ساز کی مٹھاس کو اپنے اندر جذب کرنے کو بے قرار تھی اور آنکھیں [illegible]یں۔

digest library.com

"یہ موسیقار کیفے کے سامنے بیٹھا وائلن بجا رہا تھا۔ میں نے اسے اندر بلا لیا۔ اور اب مجھے لگتا ہے میں نے غلطی نہیں کی۔" کیفے کی مالکن اور اس کی دوست ایلا نے قریب آ کر اسے اطلاع بہم پہنچائی۔

یہ کیفے ہر سال آج کے دن چند گھنٹوں کے لیے ریزرو کیا جاتا تھا۔ جہاں اولڈ ہوم اور یتیم خانے کے بچوں کو کھانے پر مدعو کیا جاتا تھا۔

آنکھیں کسی بھولے بسرے منظر کو دہرانے کا اہتمام کرنے لگی تھیں۔ حال کے سفید کینوس پر ماضی کی سیاہی نے ڈیرہ جمانا شروع کیا تھا۔ بہار کے فسوں خیز منظر پر خزاں کے تکلف وہ نقوش ابھرنے لگے۔ کرداروں کی ترتیب۔ رنگوں کے اسٹروک ہر چیز اپنی ہیئت بدل کر ایک جانی پہچانی تصویر میں ڈھل گئی تھی۔

"ایک تو تم آرٹسٹ لوگ کب سدھرو گے۔ جہاں بھی آرٹ دیکھا سب کچھ بھول بھال کے رک گئے۔" مصنوعی غصے سے اپنی بات اجالا تک پہنچاتا وہ اس کے برابر آن ٹھہرا تھا۔ جو سڑک کنارے بیٹھے ایک بوڑھے موسیقار کو گٹار کے تاروں سے الجھتے فرصت سے دیکھ رہی تھی۔

"مجھے زندگی اس بوڑھے موسیقار کے ساز سے نکلی ایک خوب صورت دھن لگتی ہے۔ جو سماعت میں اترتے ہی ہر دکھ و پریشانی کو کسی رسیلے گیت میں

ڈھال کر انسان کے لیے نجات دہندہ بن جاتی ہے۔" بات کرتے اجالا نے اس چہرے کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھا تھا۔ جہاں غصے کی جگہ ایک دھیمی سی مسکان سجی تھی۔

"زندگی ہر اس پل میں حسین ہے جب محبت کرنے والے ساتھ ہوں۔" اس نے اجالا کے کان میں سرگوشی کی۔ اور اس سرگوشی پر دو دل ایک ہی دھن پر جھوم اٹھے تھے۔

تالیوں کی گونج پر ماضی نے دوبارہ حال میں جست لگائی۔ اور سڑک کنارے بیٹھا بوڑھا موسیقار۔ قہقہہ لگاتے دو محبت کرنے والے۔ اور روما کی فضا میں سانس لیتی محبت سب کچھ فضا میں تحلیل ہو گیا تھا۔

ساز کے ساتھ سب کی دھڑکنوں کو اپنی انگلیوں پر لپیٹتے ہاتھ آہستہ آہستہ تھمتے بالآخر رک گئے۔ موسیقار نے بند آنکھیں کھول کر اپنے سامعین کی جانب دیکھا اور سر جھکا کر تالیوں کی صورت ملی داد کو وصول کیا۔ کیفے میں موجود ہر ذی روح مسکراتے چہرے اور پیٹتے ہاتھوں سے اس کے ٹیلنٹ کو سراہ رہا تھا۔ سوائے اس ایک چہرے کے جہاں حیرت و غم کے ملے جلے تاثرات تھے۔ سمندر کے رنگ جیسی نیلی آنکھوں میں ٹھہری لہریں بہنے کو بے تاب تھیں۔ طلسم پھونکتا موسیقار اب خود پتھر کا ہونے لگا تھا۔ آوازیں محبت کے خاموش پردے کی اوٹ میں رک کر حیرت زدہ ان دو لوگوں کو تک رہی تھیں جو آشنا نہیں تھے۔ پر ان میں کہیں آشنائی کا ایک گہرا رشتہ تھا۔ جو محبت ہونے سے ڈرتے تھے۔ پر ان کے بیچ چپکے سے محبت آن ٹھہری تھی۔

اجالا نے نظروں کا زاویہ بدلا اور پلٹ کر دروازے کی جانب بڑھی۔ جس کے کھلنے سے اطلاعی گھنٹی پھر سے جھنجھنا اٹھی تھی۔ جس کی آواز نے موسیقار کے دل کو بے چین کیا۔

☆☆☆

وائلن کو جلدی سے باکس میں بند کر کے کندھے پہ لٹکاتا وہ تیز قدموں سے باہر کی جانب لپکا۔ ٹھنڈی ہوا نے آنکھوں میں نرمی لیے موسیقار کی اس محبت بھری عجلت کو دیکھا تھا۔

کالے پتھروں کی زمین پر قدموں کا ایک جہا رش اور شور تھا۔ لوگوں کی بھیڑ کو چیرتے وہ تقریباً بھاگتا ہوا اس جل پری کے پیچھے لپکا۔ جو ایک بار پھر سے اس بھری دنیا میں گم ہونے جا رہی تھی۔ بالآخر چند لمحات بعد اسے ہوا کے سنگ بہتا اس کا اسکارف نظر آ گیا تھا۔ پھولے تنفس کے ساتھ، قدموں کو اسی رفتار سے چلاتے وہ اس تک پہنچا۔

"کیا آپ کو کسی نے بتایا ہے کہ آپ کا محفل سے اٹھ جانا، اس کی تمام رونق کو ماند کر دیتا ہے۔" الفاظ بمشکل اس کے منہ سے ادا ہوئے۔

اس کی آواز پر اجالا کے قدموں کو زمین نے آگے بڑھنے سے روکا۔ ٹھہر کر اپنا رخ اس کی جانب موڑتے وہ اس کی حالت دیکھ کر ذرا سا مسکرائی۔ جو ہوا کو پھیپھڑوں میں بھرتا خود کو نارمل کرنے کی بھرپور کوشش میں تھا۔ کندھے سے وائلن باکس اتار کر نیچے رکھتا وہ فٹ پاتھ کے بیچ و بیچ رک گیا تھا۔ پیدل چلنے والے اب ان کے دائیں بائیں راستہ بنا کر گزر رہے تھے۔

"اور آپ کو کسی نے بتایا ہے کہ کسی اجنبی کے پیچھے بلاوجہ بھاگنا خود کو تکلیف میں ڈالنے کے مترادف ہے۔"

اجالا نے کندھے پر لٹکے بیگ سے پانی کی بوتل نکال کر اس کی جانب بڑھائی۔ جسے "شکریہ" کہہ کر تھام لیا گیا۔ اب وہ کچھ دور ایک خالی جگہ دیکھ کر اس طرف پیش قدمی کر چکی تھی۔ فٹ پاتھ کی ٹھنڈی اینٹوں پر بیٹھ کر اس نے بیگ سے اسکیچ بک اور پنسل نکالی اور اطراف میں دیکھتی کوئی چہرہ ڈھونڈنے لگی۔

"یہ آرٹسٹس اتنے اداس کیوں رہتے ہیں یا دوسرے لفظوں میں اداسی کی تخلیق ہوتی ہی ایسے لوگوں کے لیے ہے جو اپنے فن سے لوگوں کے

چہروں پر مسکراہٹ لائیں، پر اپنے چہرے کے لیے ایسا کوئی بھی رنگ تخلیق کرنے سے قاصر رہیں۔"

موسیقار نے کچھ فاصلے پر بیٹھ کر تمہید باندھی تھی۔ نغمہ شروع کرنے سے پہلے اسے سامع کی سماعت کو سروں کے ساتھ باندھنے کی شروعات کرنی تھی۔ اور وہ یہ ہی کر رہا تھا۔

سڑک پر ٹھہرے چہروں کے سیلاب میں کھوئی اجالا آواز پر چونکی تھی۔ اس نے سر کو دائیں جانب حرکت دی۔ گہری سبز آنکھیں اس کے رخ پھیرنے کی منتظر تھیں۔ جن میں جذبوں کا ایک جہان آباد تھا۔ ترتیب سے چلتی دھڑکنیں منتشر ہوئیں۔ لبوں پہ ٹھہری بات ذہن کے پردے پر واپس چلی گئی تھی۔ اس نے یک بیک نظریں چرائیں اور دوبارہ اسکیچ بک میں مصروف ہوگئی۔

"مجھے ایک اسکیچ بنوانا ہے۔" بات کرنے کے لیے راہ ہموار کی گئی۔

"تصویر۔" یک لفظی جواب نے راستہ مسدود کیا۔

موسیقار نے دائیں بائیں نظر گھمائی اور کچھ فاصلے پر ایک دکان کی طرف بڑھ گیا۔ اجالا نے حیرت سے اس کے اس عمل کو دیکھا اور کندھے اچکا دیے۔ وہ یقیناً کسی مشہور شخصیت کا اسکیچ بنوانا چاہتا ہو گا۔ اس نے نظریں پھیریں اور سڑک پار بیٹھے ایک ادھیڑ عمر جوڑے کی محبت کو کاغذ پر اتارنے لگی۔ اس کے ہاتھ برق رفتاری سے کاغذ کے سینے پر محبت اتارنے میں مگن تھے۔ تب ہی موسیقار کے قدموں کی آہٹ اس کے قریب آ کر تھمی۔ اس نے وائلن باکس اٹھا کر کندھے پر ڈالا اور فٹ پاتھ سے اتر کر اجالا کے سامنے آن ٹھہرا۔ یوں کہ ساری دنیا اس کے پیچھے چھپ کر آنکھوں سے اوجھل ہوگئی تھی۔

"اس چہرے کا اسکیچ بنا دیں۔" ہاتھ سامنے کیے وہ مخاطب ہوا۔

لکیریں کھینچتے ہاتھ روک کر اجالا نے سر اٹھایا۔ آنکھوں میں ٹھہری کوفت حیرت میں ڈھل گئی۔ اس ہاتھ میں پکڑے شیشے میں اجالا کا عکس واضح تھا۔ پھر اس کی بے یقین نظریں موسیقار کی طرف اٹھیں۔

"آنکھوں کی اداسی کو ماضی کی کسی خوشی سے حذف کر دیں۔ لبوں کے سکوت کو کسی قہقہے کی گونج عطا کر دیں۔ اور چہرے پر جمے خوف کو محبت کے رنگ دان کر دیں۔ باقی سب پرفیکٹ ہے۔"

وہ سامنے کھڑا اسے اس کی ہی تصویر بنانے کے لیے ہدایات دے رہا تھا۔ سڑک پر چلتے بے شمار لوگوں کی بے ہنگم آوازیں۔ زمین کو دھمکاتے قدموں کا شور۔ ہوا کی سرگوشیاں۔ سب کچھ دل کی بے ترتیب شور مچاتی دھڑکن کے سامنے مدھم ہوتا جا رہا تھا۔ نیلگوں سمندر پہ چھایا سکوت مرتعش ہونے لگا۔ دل کے نہاں خانوں میں دفن محبت سر اٹھانے کی کوشش میں ہلکان تھی۔ بوجھل پلکیں اٹھیں لیکن سامنے دنیا تھی۔ موسیقار اسے ایک نئی کہانی، نیا چہرہ بنانے کی ترغیب دیتے اپنی راہ مڑ گیا تھا۔

"کیا ہم پہلے مل چکے ہیں۔؟" سکوت ٹوٹتے ہی اجالا نے ارد گرد دیکھا اور بلند آواز میں کہا۔ دور جاتے قدم تھم گئے تھے۔

موسیقار نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ اسے بتانا چاہتا تھا کہ وہ ہر اس لمحے میں ملتے ہیں۔ جب وہ اس کے تخیل کے پردے پر آن رکتی ہے۔ اور یہ کہ وہ کبھی اس کے تخیل سے اوجھل نہیں ہوئی۔ لیکن نا چاہتے ہوئے بھی وہ نفی کی گردان کرتا مڑ گیا۔

ہواؤں میں بڑھتی ٹھنڈک نے اجالا کو یکدم ہی بے چین کیا۔ سامنے بیٹھے ادھیڑ عمر جوڑے میں اس کی دلچسپی بالکل صفر ہو چکی تھی۔ اس نے اسکیچ بک کا صفحہ پلٹا اور نئے سرے سے ایک تصویر بنانے لگی۔ ذہن کے پردے پر دو آنکھیں جگمگائی تھیں۔ اور ان میں لہراتا ایک دلکش عکس بھی۔

☆☆☆

ہوا نے خوشی سے جست لگائی اور اڑان بھرتی تریستویئر کی گلیاں پار کرنے لگی۔ ریستورانوں سے اٹھتی مہک۔ لوگوں کی چہل پہل۔ آوازیں۔ ان

سب کو پیچھے چھوڑے کچھ دور ایک گلی کی نکڑ پر بنے ریستوران کے گلاس ڈور سے اندر داخل ہوئی۔

"پیراڈائیز لاسٹ" کا اندرونی ماحول عام دنوں سے قدرے مختلف تھا۔ کیفے ہال میں مدھم روشنی کا بسیرا تھا اور آرکسٹرا پر کوئی محبت بھرا گیت، سننے والوں کے دل لبھا رہا تھا۔ ہال میں ترتیب سے لگی میزیں اور ان کے گرد چنی کرسیوں پر تقریباً ہر عمر کے لوگ براجمان تھے۔ میزوں پر کافی اور سامان ضیافت کے ساتھ ساتھ سفید گلاب بھی نظر آرہے تھے۔ گلابوں کی مسحور کن بھینی مہک سارے ہال کو مہکائے ہوئے تھی۔

"تم جب بھی مجھے یاد کرو یا میرا دن مناؤ تو اس دن ہر محبت کرنے والے کو تحفتاً پھول دینا۔ کیونکہ خوشبو سے بڑا محبت کا پیمبر کوئی نہیں ہے۔" سرفراز نے کاؤنٹر کے پیچھے دیوار پر لگی تصویر کو دیکھا اور ہاتھ میں پکڑے آخری سفید گلاب کو۔ جسے کیفے میں داخل ہوتے ایک جوڑے کو پیش کرتے اس نے محبت کی بات کا پاس رکھا تھا۔

☆☆☆

سرما کے کئی دن بالکل خاموشی سے زندگی سے تحلیل ہو گئے تھے۔ گھر سے کلینک اور کلینک سے واپس گھر آتے جاتے وہ لاشعوری طور پر لوگوں کی آنکھیں دیکھنے کی عادی ہو چلی تھی۔ قدموں کی آہٹیں اسے بلا ارادہ ہی چونکانے کا سبب بن جاتیں۔ اکثر کافی پیتے، کھانا کھاتے یا کینوس کے سامنے کھڑے سماعت میں کوئی اجنبی لہجہ سرگوشیاں کرنے لگتا۔ اور دل کی دھڑکن بلا ارادہ کوئی تان بننے لگتی۔

یہ بھی ایک خاموش صبح تھی۔ کمرے کی کھڑکی سے منعکس ہو کر سورج کی کرنیں فرش پر رقصاں تھیں۔ ہوا کا ہولے ہولے بجتا ساز کھڑکی کے سامنے لٹکے پردوں کو اپنے سنگ اڑائے پھر رہا تھا۔ کمرے کی ہر شے ساکت اور خاموش اس حسین صبح کے منظر میں گم تھی۔ سوائے بیڈ پر نیم دراز اجالا کے۔ جو اس حسن سے نظریں پھیرے، سامنے دیوار پر موجود اسکیچ کو گھورنے میں مصروف تھی۔ اسکیچ تکمیل شدہ اور فریم میں سج کر کمرے کی رونق بڑھا رہا تھا۔ گہری سبز آنکھوں میں نقش اجالا کا عکس ان میں بخوبی واضح تھا۔ لیکن پچھلے کئی لمحات سے وہ اپنے عکس کے علاوہ کچھ اور رنگوں کو بھی بغور دیکھ رہی تھی۔ جو دل و نگاہ کی پہچان میں آنے کے باوجود اسے نظریں چرانے پر مجبور کر رہے تھے۔

اب اس کی نظروں نے دیوار پر سجی ایک اور تصویر کی طرف رخ کیا۔ یہ تین لوگوں پر مشتمل ایک فیملی فوٹو تھا۔

digest library.com

سرفراز احمد، رفیعہ سرفراز اور ان کی اکلوتی بیٹی اجالا سرفراز۔ اور ان کا ہنستا مسکراتا چھوٹا سا آشیانہ۔ جہاں رنگوں اور پھولوں سے محبت ان کی اولین ترجیح تھی۔ جہاں دیواروں سے سر ٹکائے بیلیں جھولتی رہتیں اور رنگ پورے گھر کو مہکائے رکھتے۔ جہاں قہقہوں کی گونج دکھ و پریشانی کی آواز کو ہمیشہ دبائے رکھتے۔ پھر ان آنکھوں نے وقت کو پلٹا کھاتے دیکھا اور وہ تصویر تین ٹکڑوں میں بٹ گئی۔ ہنستا مسکراتا آشیانہ بجھے چراغ کی مانند سسکیاں بھرنے لگا۔ چار دیواری میں کھلکھلاتے قہقہے۔ رنگوں سے مہکتا آنگن۔ اور محبت سے سجے، چہرے سب دھول کی مانند بکھر گئے۔ اور وہ دھول گاہے گاہے آنکھوں میں چبھن پیدا کیے رکھتی۔ آنکھوں میں ٹھہرے کئی چہرے اور یادیں پانی کی صورت بہنے لگتیں۔ اس نے زور سے آنکھیں بند کر کے کھولیں اور لمبا سانس بھرتی بستر سے اتر گئی۔

آج کلینک سے چھٹی ہونے کے باعث اس کا ارادہ کولوسیم جانے کا تھا۔ موسم کی مناسبت سے کپڑے زیب تن کیے، دروازے کو تالا لگائے وہ سڑک پر آ گئی تھی۔ روما کی چمکتی سویر اب دوپہر کی طرف قدم بڑھا رہی تھی۔

"مجھے حیرت ہوتی ہے کہ ہم دو الگ دنیاؤں کے باسی ایک دوسرے سے ٹکرا کیسے گئے؟" ڈھلوانی

زمین پر آہستہ آہستہ پاؤں دھرتی وہ مین شاہراہ کی جانب جارہی تھی۔ جب ایک یاد اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ساتھ چلنے لگی۔ یہ اس کی زندگی کا چوتھا کردار تھا۔ جس کی تصویر اس کے گھر کی کسی دیوار پر نہیں تھی پر اس کے دل کی ہر دیوار پر بھی اس ایک تصویر کی ہی چھاپ نظر آتی تھی۔

"دو دنیائیں کیسے؟۔ ہم ایک ہی شہر کے دو باسی ہیں تو ہماری دنیا بھی ایک ہی ہوئی۔" اجالا نے ہاتھ جھٹکنے کے بجائے مضبوطی سے ہتھیلی بند کی اور مسکرائی۔

"دو دنیائیں مطلب مختلف ڈیپارٹمنٹس۔" وقار نے مسکراتے ہوئے اسے مطلب سمجھایا۔

"تمہاری ہر بات عجیب ہوتی ہے یا مجھے لگتی ہے؟" اجالا نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا تھا۔ وہ یونیورسٹی کے دو ڈیپارٹمنٹس کو الگ دنیاؤں میں تشکیل دے رہا تھا۔

"اگر میں عجیب بات نہ کروں تو اس نیلگوں سمندر کا تلاطم خیز نظارہ کبھی دیکھنے کو نہ ملے۔" ہنسنے کے سبب اس کی آنکھوں میں آئے پانی کی طرف اشارہ کیا گیا تھا۔

اجالا کے ہونٹ تھوڑے سمٹ کر ایک دوسرے میں مکمل پیوست ہو گئے۔ اس بار اس نے ہاتھ جھٹک کر ماضی کو پیچھے دھکیلا اور سامنے کھڑی ٹرام کی طرف قدم بڑھائے۔ کچھ دیر زمین کے سینے کو اپنے پہیوں سے روندنے کے بعد ٹرام کولوسیم کے عین سامنے تھم گئی۔

سفید اسنیکرز کالے دھلے ہوئے پتھروں پر نمودار ہوئے۔ سورج کی آب و تاب کے باوجود فضا میں ٹھنڈک کی رمق محسوس کی جاسکتی تھی۔ جو وقتاً فوقتاً پچھلے کئی دنوں سے ہونے والی بارشوں کا نتیجہ تھی۔ چند قدم چلنے کے بعد وہ ایک کافی شاپ کے سامنے رک چکی تھی۔ کولوسیم کے باہر ان گنت ریستوران آباد تھے۔ جہاں مہینے کے تیس دن ایک سا رش دیکھنے کو ملتا تھا۔ لیکن آج اس تاریخی عمارت میں انسانوں کا ایک سیلاب تھا۔ جو پورے کولوسیم کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھا۔ چند لمحات بعد اس کا انتظار ختم ہوا اور وہ کپ ہاتھ میں پکڑے کولوسیم کے اندرون حصے کی طرف چل پڑی۔ جہاں ایک دروازے سے داخل ہونے کے لیے اسے سکیورٹی کلیئرنس کے لیے رکنا پڑا۔ اس نے کوفت سے اپنے آگے کھڑے لوگوں کو دیکھا۔ ایک لمبا سانس بھر کے اس نے ہاتھ میں پکڑی ٹھنڈی کافی کا سپ لے کر دل و دماغ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ انتظار مشکل سہی لیکن اس کا من پسند تھا۔

☆☆☆

کولوسیم کے اندرونی حصے میں جنگلے سے ٹیک لگائے وہ پچھلے کئی لمحوں سے آتے جاتے لوگوں کو فرصت سے تک رہا تھا۔ بلیو جینز کے ساتھ سفید ڈریس شرٹ پہنے، بالوں کو جیل سے اچھی طرح سیٹ کیا گیا تھا۔ چونکہ آج حکومت کی طرف سے فری سنڈے تھا۔ یعنی کولوسیم دیکھنے کے لیے لوگوں کو کسی بھی انٹری ٹکٹ کے بغیر اندر جانے کی اجازت تھی۔ اس لیے کولوسیم کے اندر اور باہر سیاحوں کے علاوہ روما کے مقامی لوگ بھی پرندوں کے غول کی مانند قابض ہو رہے تھے۔

کوفت سے لوگوں کے چہروں کو تکتے اس کی نظر ایک شناسا چہرے پر ٹھہر گئی تھی۔ ایک ہاتھ میں کافی کا کپ گرفت میں لیے، دوسرے ہاتھ میں موبائل تھامے، نظریں اسکرین پر جمائے وہ مکمل طور پر خود میں مگن تھی۔ ایان کے لب مسرت سے وا ہوئے۔ جس کا ماحول یکدم پرلطف بہار جیسا ہو گیا تھا۔ اس کے قدم اس بہار کی ٹھنڈک محسوس کرنے کے لیے اسی طرف بڑھنے لگے۔

"آپ کو بھی شاید میری طرح اطالیہ کا حسن اکیلے دیکھنا زیادہ پسند ہے۔"

اپنی دھن میں چلتے اجالا نے سامنے کسی کی موجودگی کو محسوس کرتے یکدم اپنے قدم روکے تھے۔ جس وجہ سے ہاتھ میں پکڑی کافی چھلک کر نہ

صرف اس کا ہاتھ بلکہ سامنے والے کی شرٹ کو بھی داغ دار کر گئی تھی۔ اجالا نے غصے سے اسے دیکھا۔ کچھ کہنے کو کھلتے ہونٹ حیرت کے باعث اسی پوزیشن پر ساکت ہو گئے تھے۔ آنکھوں میں ٹھہرا غصہ بدلتے رنگوں میں پناہ لینے لگا۔ جبکہ مقابل کے چہرے پر خوشی اور آنکھوں میں عجیب بے ساختہ پن تھا۔ جس نے اجالا کی متحیر آنکھوں کو جکڑا اور اس کا اعتماد متزلزل ہونے لگا۔ ادھر ادھر دیکھتی وہ ایان کے اطراف سے نکلتی چلی گئی۔

"آپ کو کم از کم معذرت تو کرنی چاہیے یا میری شرٹ خراب ہونے پر رومال ہی پیش کر دینا چاہیے۔" ایان نے اجالا کے پیچھے قدم بڑھائے اور ہاتھ سے اپنی شرٹ جھاڑتے دہائی دی۔ زینے طے کرتے وہ کولوسیم کے عرشے پر جا رہے تھے۔

"کس نے کہا تھا کہ آپ سامنے آ کر براجمان ہو جائیں۔؟ غلطی آپ نے کی ہے تو معذرت بھی خود سے خود ہی کریں۔" اجالا نے قدم روکے بغیر اپنی بات پر زور دے کر کہا۔

بھیڑ زیادہ ہونے کی وجہ سے راستے میں رکنا خطرناک ہو سکتا تھا۔ اس لیے اس نے اپنی آواز بنا رکے اونچی رکھی۔ اس کی بات پر ایان مسکرایا۔

"اگر میں سامنے براجمان نا ہوتا تو آپ کو اس آدمی سے ضرور معذرت کرنی پڑتی جس سے آپ ٹکرانے والی تھیں۔"

ایان کی بات پر اجالا تھمی اور پلٹ کر اسے دیکھا۔ زینے ختم ہو گئے تھے۔ پر باتیں باقی تھیں۔

"پیچھا کر رہے ہو میرا۔؟" کافی کا گھونٹ بھرتے اس کی بات نظر انداز کی گئی۔

کولوسیم کا عرشہ بھی ہر طرف سے لوگوں کے گھیرے میں تھا۔ سیاحوں کے ساتھ آئے ٹور گائیڈز انہیں اس عظیم الشان عمارت کی تاریخ سے مستفید کر رہے تھے۔

"نہیں......" خاموشی کا ایک مختصر وقفہ۔ "میں ساتھ چلنا چاہتا ہوں۔"

بات پوری کرتے سینے پہ ہاتھ باندھے اس نے اجالا نے کو دیکھا۔ جو بات کا مطلب جان کر نگاہیں پھیر گئی تھی۔ ایان کے لب ذرا سے کھلے۔ دائیں گال کا گڑھا بادلوں سے جھانکتے چاند کی طرح ذرا سی چھب دکھا کے معدوم ہوا۔

خاموشی کا ایک طویل وقفہ۔ لوگوں کا ہجوم۔ آوازیں۔ اس سب کے باوجود کسی کی نظروں کی تپش اسے اپنے چہرے پر محسوس ہو رہی تھی۔

"میں پانچ سال کی تھی۔ جب میں نے پہلی بار اپنے والدین کے ساتھ اس پراسرار عمارت میں قدم رکھا تھا۔" اجالا کی آواز نے خاموشی کی دیوار میں رخنہ ڈالا۔ ایان کی ساری حسیں بیدار ہوئیں۔

کولوسیم کی بیرونی عمارت انڈے سے مشابہ ہے جبکہ اندرونی حصہ گولائی میں ہے۔ جہاں اوپر والے حصے میں جگہ جگہ چبوترے بنائے گئے ہیں۔ وہ دونوں بھی اس وقت ایک چبوترے پر کھڑے تھے۔ ایان اجالا کو جبکہ اجالا باہر سڑک پر لوگوں کے مشاغل دیکھ رہی تھی۔ دونوں اپنے اپنے پسندیدہ نظاروں میں محو تھے۔

"پھر متعدد بار میں یہاں آئی۔ اپنے ساتھ چلنے والے ہر شخص کے ساتھ۔"

سورج عین کولوسیم کے اوپر چمک رہا تھا۔ نیلی چھتری پر سفید روئے نمودار ہونے لگے۔ درختوں نے آہستہ آہستہ بادلوں کے سنگ رقص شروع کیا۔

"ماما...... بابا...... نینی اور مسٹر جوزف......"

"اور۔"

سڑک پر چلتی بگھیاں اور ان میں بیٹھے لوگ وہاں گزرے لمحوں کو یادگار بنانے کی تگ و دو میں مصروف تھے۔

"اور۔؟" ایک بے چینی نے ایان کے دل کو اپنے حصار میں لیا۔

"اور۔ وقار۔" اس نے چہرہ ایان کی جانب موڑا۔ گلے میں ٹھہرے اسکارف کو ہاتھ میں لپیٹتے اس کی مخروطی انگلیوں میں ایان کا دل بھی لپٹتا جا رہا

تھا۔

ہیزل گرین۔ نیلی آنکھیں۔ دو رنگ آپس میں مدغم ہونے لگے۔ ہیزل گرین رنگ غالب آنے لگا تھا۔ جب نیلے رنگ نے آنکھیں جھپک کر اس رنگ کو پیچھے دھکیلا۔ آنکھیں بند کر کے کھولی گئیں۔

"میں ہمیشہ خواہش کرتی تھی کہ کاش میں اس دور میں جنم لیتی جب اس شاندار عمارت کی پہلی اینٹ زمین کے سینے میں نصب کی گئی تھی۔" اجالا ہر بار کی طرح سحر زدہ ہونے لگی۔ لیکن اس مرتبہ یہ سحر اس بلند و بالا عمارت کا نہیں تھا۔

ہیزل گرین آنکھیں۔ خوب صورت مسکراہٹ۔ رخسار کا گڑھا۔ عمارت کا قدیم حسن اس خوب صورتی میں گڈمڈ ہونے لگا۔ اجالا نے ایک گہری سانس لی۔ وہ اس سحر میں مبتلا نہیں ہونا چاہتی تھی۔ یہ جانے بغیر کہ وہ سحر اسے پوری طرح اپنی گرفت میں لے چکا تھا۔

"ہاں اور تمہیں بھی اس اکھاڑے میں کسی جرم کی سزا میں پھانسی پر لٹکا دیا جاتا۔" سنجیدگی کو مزاح کا رنگ دینے کی کوشش کی گئی۔

اس کی بات پر اجالا کی سنجیدگی نے بھی مسکراہٹ میں پناہ لی۔

"ویسے اس دور میں روما میں محل بھی آباد تھے اور ان میں شہزادیاں بھی رہتی تھیں۔" تاریخ کے [illegible] صورت پہلو کی یاددہانی کرواتے موسم کے تغیر کو [illegible] نیلے آسمان پر پھیلی سیاہی سارے رنگوں کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی۔ کندھے پر [illegible] پرس کھول کر رومال [illegible] دو قدم کا فاصلہ طے کر کے وہ ایان کے مقابل رکی۔

"یہ لو رومال۔" ہاتھ میں پکڑا سفید رومال اس کی جانب بڑھایا۔ چہرے پہ چھائی سنجیدگی میں شرارت جھانک رہی تھی۔

ایان نے مسکراتے ہوئے رومال گرفت میں لیا۔

اجالا پاس سے گزرتی زینوں کی طرف بڑھی۔

"آگے کی کہانی تو سناتی جاؤ۔"

"وقار کون تھا۔؟" "اب کہاں ہے۔؟" دیوار سے چہرہ جھکا کر اس نے اونچی آواز میں پکارا۔ اطراف میں چلتے پھرتے لوگ اس کی طرف حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

اس کی آواز پر توجہ دیے بغیر، قدم قدم کولوسیم سے باہر جاتی اجالا بلاوجہ مسکرا رہی تھی۔ آج پہلی بار وہ کولوسیم سے واپسی پر اداس نہیں تھی۔ اور آج پہلی بار کولوسیم بھی اداس نہیں تھا۔ کیونکہ اس اداس لڑکی نے پہلی دفعہ یہاں سے مسکراتے ہوئے رخصت لی تھی۔

دیوار سے پیچھے ہو کر ایان نے ہاتھ میں پکڑے رومال کو دیکھا۔ جو بڑی خوب صورتی سے واپس کیا گیا تھا۔ اور ایک نظر اپنی سفید شرٹ پر موجود اس سوکھے داغ کو۔ اس نے مسکرا کر اس داغ پر ہاتھ پھیرا۔

digest.library.com

"داغ تو چاند میں بھی ہے اور وہ اچھا لگتا ہے۔" کولوسیم کی اونچی دیواروں نے حیرت سے ان دو اجنبیوں کو دیکھا جو آشنائی کی سیڑھیاں طے کرتے اجنبیت کی دیواروں کو گراتے جا رہے تھے۔

☆☆☆

بادلوں نے قطرہ قطرہ پگھل کر کولوسیم کو بھگونا شروع کیا۔ ٹپ ٹپ برستی بوندوں میں تیزی آتی جا رہی تھی۔ سفید تتلی پر گرتی بوندیں اسے تازگی بخش رہی تھیں۔ کولوسیم میں کھڑے لوگوں نے چھتریاں تاننی شروع کیں اور جو ایسے موسم کا سوچے بغیر گھر سے نکلے تھے انہوں نے خارجی رستے پر دوڑنا شروع کیا تاکہ واپسی کے لیے سواریاں مل سکیں۔

شٹل میں سفر کرتے ایان نے کھڑکی کے شیشے سے پانی اور زمین کے ملاپ کو خوش گواریت سے دیکھا۔ آج قدرت کے ساتھ ساتھ روما کا موسم بھی اس کے دل کی زمین نم کر رہا تھا۔

شٹل اسٹاپ پہ رکی۔ گیلی زمین پر پاؤں دھرتے ہی بوندیں اسے حصار میں لے چکی تھیں۔ تریستیویئر کی گلیاں اور مکان بارش میں دھل کر

نکھرتے جا رہے تھے۔ سہ پہر کا سماں اس وقت آدھی رات کا منظر پیش کرتا لوگوں کو دہلا رہا تھا۔ اسٹریٹ پولز کی روشنیاں جل اٹھی تھیں۔ رات کو دن کا پیرہن اوڑھانے کے لیے قمقموں کو اس موسم سے لڑنے کی ضرورت تھی۔ تاکہ راہگیر راستہ نا بھول جائیں۔

پیراڈائیز لاسٹ کے سامنے پہنچ کر اس کے قدموں کی تیزی ختم ہوگئی۔ پر بارش کی تیزی ابھی بھی برقرار تھی۔ جو آج اطالیہ کے باسیوں پر رحم کرنے کے حق میں نہیں تھی۔

☆☆☆

کھڑکی کے سامنے کرسی ڈالے وہ قدرت کے اس حسین منظر سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ یہ روما میں برسنے والی پہلی بارش تھی۔ ایسے بہت سے موسم آئے اور اپنی خوب صورتی بکھیرے چلے گئے لیکن آج سے پہلے تک اس نے سارے موسم کھڑکی بند کر کے گزار دیے تھے۔ لیکن آج اسے یہ بوندیں اپنے سحر سے آزاد کرنے کے بجائے جکڑتی جا رہی تھیں۔ اجالا کے ہاتھوں میں ایک فریم شدہ اسکیچ تھا۔ جس پر وہ پیار سے ہاتھ پھیرتی آنکھوں، گالوں اور ہونٹوں کو باری باری چھو رہی تھی۔ اس عمل کو دہراتے اس کے ہاتھوں کو ایک پیار بھرا لمس محسوس ہو رہا تھا۔

"دیکھیں ماما، بابا میں نے آپ کی تصویر بنائی ہے۔" بارش کی آواز میں ایک چھوٹی سی بچی کی چہکار شامل ہوئی۔

"ارے واہ۔ یہ تو بہت زیادہ خوب صورت بنی ہے۔" اس کا چھوٹا سا ہاتھ چوم کر آنکھوں سے لگایا گیا۔ بابا نے اسے گود میں بٹھا کر بال سنوارے۔

"لیکن۔ یہ اسکیچ کی ماما کی ناک اتنی موٹی کیوں لگ رہی ہے۔" اسکیچ بک ہاتھ میں پکڑے بابا نے اس کی تصویر میں پہلی خامی نکالی تھی۔

"بالوں کا رنگ۔" دوسری خامی۔

"ہاتھوں کی انگلیاں۔" پھر تیسری۔

"میری آنکھوں کا رنگ۔" آواز اور چہ... کو مصنوعی حیرت اوڑھائی گئی۔

"بابا۔" اس نے ناک چڑھائی۔ اب ضبط جواب دے چکا تھا۔ مستقبل کی مصورہ نے پھلایا اور اس پھولے منہ کو دیکھ کر دو قہقہے در و د... چونکا گئے۔

تیز ہوا سے کھڑکی کے کواڑ آپس میں ٹکرا... اس آواز نے قہقہوں کو نگلا۔ اجالا چونک کر اس ... سے باہر نکلی۔ ارد گرد ایک خالی پن تھا۔ وہ چاہ کر آج تک اس خالی پن کی عادی نہیں ہو پائی تھی۔

"آپ نے جانے میں بہت جلدی کر... ماما......" اس نے تصویر کی طرف خفگی سے دیکھ...

"آپ کو یاد رکھنا چاہیے تھا کہ اس دنیا میں بیٹیوں... واحد سہیلی ان کی ماں ہوتی ہے۔"

کرسی سے اٹھ کر وہ کھڑکی کے پاس آ گئی۔ جہاں رنگ برنگ کنول کے پھولوں کی مہک خوش گوار احساس دے رہی تھی۔ کھڑکی کی دیواروں سے لپٹی بیلیں بارش میں مسرور نظر آ رہی تھیں۔

"میں جب بھی اپنے ارد گرد کسی کو تلاش کرتی ہوں، تو مجھے سوائے اپنے سائے کے اور کوئی نظر نہیں آتا۔" کیا واقعی ایسا تھا۔ یک بیک اس کی آنکھوں میں دو عکس آن ٹھہرے۔ اس نے حیرت سے آنکھیں بند کر کے کھولیں۔ انہیں بار بار جھپکا۔ لیکن آنکھوں میں جمی تصویریں وہیں تھیں۔ اس نے پریشانی سے سر کو جنبش دی اور دل و دماغ کا دھیان بٹانے کو ہاتھ باہر نکال کر بارش کو ہتھیلی میں تھامنے کی کوشش کرنے لگی۔ یہ جانتے ہوئے کہ دماغ کو تو بھٹکایا جا سکتا ہے مگر دل کو نہیں۔

☆☆☆

پیراڈائیز لاسٹ کے دروازے پر کلوزڈ کا بورڈ آویزاں تھا۔ ایان نے حیرت سے گھڑی پر وقت دیکھا جہاں چھوٹی سوئی چار اور بڑی سوئی بارہ کے ہندسے پہ کھڑی تھی۔ ایان نے دروازے کی اطرافی دیوار پر لگی گھنٹی بجائی اور انتظار کرنے کے دوران

اپنے کپڑے جھاڑنے لگا۔ بھاگنے کے باوجود وہ کافی حد تک بھیگ چکا تھا۔ سر پر پہنی کیپ اتار کر ہاتھ میں پکڑی۔ جس سے پانی کی بوندیں زمین پر گر رہی تھیں۔ اس نے بالوں میں ہاتھ پھیرا جن میں ہلکی سی نمی ضرور تھی مگر گیلے پن سے بچت ہو گئی تھی۔ گھنٹی دوبارہ بجائی۔ اس بار انتظار کا دورانیہ بہت مختصر تھا۔ قدموں کی آواز نے اسے الرٹ کیا۔

"بارش میں تو سکون لینے دیا کرو ہم بوڑھے لوگوں کو۔" دروازہ کھلتے ہی سرفراز کا چہرہ ظاہر ہوا۔ جن کی کوفت بھری آواز ایان کو شرمندہ کر گئی۔

"ارے ایان بیٹا۔ آؤ، آؤ۔ اندر آؤ۔" اس بار پشیمانی نے سرفراز کے چہرے کا احاطہ کیا۔ جسے مسکراہٹ کی تہہ میں چھپایا گیا۔ ایان اندر داخل ہو کر آگے چلنے لگا۔

"مجھے تو لگا تھا کہ میرا انتظار بہت طویل ہونے والا ہے۔" دروازہ بند کر کے سرفراز اس کے پیچھے چلتے کہہ رہے تھے۔

"آج آپ نے کیفے نہیں کھولا۔؟" کاؤنٹر کے قریب جا کر ایان نے ارد گرد دیکھ کر سوال کیا۔ جہاں میز پر کرسیاں اوندھی پڑی تھیں۔ جس سے صاف ظاہر تھا کہ آج کیفے کا مالک آرام کرنے کے موڈ میں ہے۔

"آج کل طبیعت کچھ بیزار ہے بچے۔ دل ہی نہیں کرتا لوگوں کو دیکھا یا ان سے ملا جائے۔" وہ اس سے کچھ فاصلے پر کھڑے اپنی اندرونی حالت بتا رہے تھے۔

"ایسے موسم تو انسان کی طبیعت پر خوش گوار اثرات مرتب کرتے ہیں۔" ایان نے جل تھل کرتے مینہ کی طرف اشارہ کیا۔

"ایک وقت تھا بیٹے جب میرا بھی ان موسموں سے محبت بھرا تعلق تھا۔ لیکن اس بیتے وقت نے سب کچھ دھول کر دیا۔ وہ جوان آنکھوں میں تھا......" آنکھوں کا بنجر پن مزید گہرا ہوا۔ "اور وہ بھی۔ جو اس دل میں تھا۔" دل میں ایک ٹیس ابھر کر معدوم ہوئی۔

"خیر۔ تم اوپر کمرے میں چلو میں کافی لے کر آتا ہوں۔ تمہیں اس وقت اشد ضرورت ہے۔" اس کے ہولے ہوئے کپکپاتے جسم کی جانب اشارہ کیا گیا۔

ایان خجالت سے مسکراتا کیفے ہال کے آخر میں گولائی میں اوپر جاتے زینوں کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

زینے ختم ہوتے ہی آگے ایک مختصر سی راہداری تھی۔ چند قدموں کی راہداری کا اختتام ایک چھوٹے سے عرشے پر ہوا۔ بارش کی تیز رم جھم بوندوں میں تبدیل ہو گئی تھی۔ لیکن آسمان پر اب بھی کالی گھٹاؤں کا راج تھا۔ ایان نے سے سانس لے کر تازہ ہوا کو نتھنوں میں گزارا۔ مٹی کی خوشبو سے ساری فضا معطر تھی۔ چند لمحے وہ یونہی بازو دائیں بائیں پھیلائے، آنکھیں بند کیے ہوا کا لمس محسوس کرتا رہا۔ پھر اس نے آنکھیں کھولیں اور بائیں جانب بڑھ گیا۔ جہاں ایک بند دروازہ تھا اور اس کے پار کا جہان ایان کی نظروں سے اوجھل تھا۔ اس نے ہینڈل گھما کر دروازہ کھولا۔ ایک چھوٹی سی دنیا اس کے سامنے نمودار ہوئی۔

یہ ایک چھوٹا مگر صاف ستھرا کمرا تھا۔ دہلیز میں ایان نے ایک ہی نظر میں پورے کمرے کا جائزہ لے ڈالا۔ سامنے والی دیوار میں ایک کھڑکی تھی۔ جس کے آگے لکڑی کی میز اور ایک کرسی پڑی تھی۔ میز کے ساتھ ہی ایک سنگل بیڈ ڈالا گیا تھا۔ جس پر بچھا بے شکن بستر رہنے والے کی نفاست کا پتا بتا رہا تھا۔ کمرے کی دائیں دیوار میں ایک چھوٹی سی دیوار گیر الماری بنی تھی، الماری سے تھوڑے سے فاصلے پر آتش دان کے سامنے دو کرسیاں اور ایک میز رکھی تھی۔ جہاں سردی کے دنوں میں بیٹھ کر کافی اور باتوں سے لطف اندوز ہونا ایک الگ ہی کشش رکھتا ہے۔ آتش دان کے اوپر ایک مینٹل شیلف بنی تھی۔ جس پر ترتیب سے چنی گئی کتابیں اس بات کی غماز تھیں کہ مکین مطالعہ کا شوقین ہے۔ غرض کہ چند اشیاء پر مشتمل ہر لحاظ سے وہ ایک آرام دہ کمرا تھا۔

ایان اندر داخل ہو کر شیلف کی طرف بڑھا۔ کمرے کی فضا میں کتابوں کی بوسیدہ خوشبو رچی تھی۔ جو کتابوں کے رسیا لوگوں کے لیے ہر پرفیوم سے مہنگی اور نایاب خوشبو ہے۔ ہاتھ بڑھا کر وہ شیلف میں پڑی کتابیں الٹ پلٹ کرنے لگا جب اس کی نظر ایک البم پر پڑی جو کتابوں کے آخر میں رکھی تھی۔ البم جو جسامت میں باقی کتابوں سے بڑی ہونے کی وجہ سے وہ ان سب میں ممتاز نظر آ رہی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر البم اٹھائی اور آتش دان کے سامنے رکھی کرسیوں میں سے ایک پر براجمان ہو گیا۔ البم کی بیرونی جلد پر ایک کارڈ چسپاں تھا جس پر جلی حروف میں 'پیراڈائیز لاسٹ' کے الفاظ درج تھے۔ اس نے ان الفاظ پر ہاتھ پھیرا اور البم کھولی جہاں پہلے صفحے پر ایک جملہ درج تھا۔

"جنت سے نکلنے والے آدم کو ہمیشہ اپنے فیصلوں کی جنت میں جلنا پڑتا ہے۔"

digest library.com

ایان نے اس جملے کو زیر لب دو تین بار دہرایا۔

ایک عجیب سی اداسی نے اس کا محاصرہ کیا۔

"کبھی کبھی ہماری زندگیوں میں ایسی تاریک کہانیاں رقم ہوتی ہیں جنہیں زبان زد عام کرنے کا خوف جسم سے خون خشک کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔"

سرفراز کی آواز کمرے کی فضا میں بکھر کر معدوم ہوئی۔ ہاتھ میں تھامی ٹرے درمیانی میز پر رکھ کر انہوں نے ایان کے سامنے والی کرسی سنبھال لی۔

"عزت، نام، شہرت۔ سب کچھ خاک میں مل جانے کا خدشہ۔" بات کے آخر میں انہوں نے لمبی سانس بھری۔ جیسے اپنی عزت اور شہرت خاک میں مل جانے کے خوف کو زائل کیا ہو۔

"یہ البم تمہیں ساری کہانی سنا دے گی۔" سرفراز نے گرم سیال سے حلق تر کرتے البم کی جانب اشارہ کیا۔

ایان نے سر ہلاتے صفحہ پلٹا۔ یہ ایک چھوٹے سے گھر کا اسکیچ تھا۔ جس میں گھر کا پچھلا حصہ ڈرا کیا گیا تھا۔ جو ایک باغیچہ تھا۔ وہاں چاروں طرف مختلف اقسام کے پھول نظر آ رہے تھے۔ باغیچے کے بیچ گھاس پر دھرے بنچ پہ ایک نوجوان جوڑا براجمان تھا۔ لڑکی کسی بات پر کھلکھلا رہی تھی جبکہ لڑکا پرشوق نظروں سے اس کی ہنسی کو آنکھوں میں جذب کر رہا تھا۔

"یہ میں اور رفیعہ ہیں۔ بہت شوق تھا اسے ہر طرف سبزہ اگانے کا۔ جب تک وہ زندہ رہی تب تک ہر موسم میں ہمارا گھر صرف بہار کا منظر ہی پیش کرتا رہا۔ اور اس کا جانا......" الفاظ کی کمی نے جملے کا ربط بگاڑا تھا۔ جسے سامع نے شدت سے محسوس کیا۔ "......خزاں مکین بن جائے تو بہاریں بھی خوف زدہ ہو کر پاس سے گزر جاتی ہیں۔" ان کی آواز میں اس خزاں رسیدہ پتے جیسی اداسی تھی۔ جس پر بہار اپنا آپ ثبت کیے بغیر گزر جائے۔

صفحہ پلٹنے سے پہلے ایان نے اس عورت کی آنکھوں کو غور سے دیکھا۔ کسی کی آنکھیں ان آنکھوں سے بہت مشابہ تھیں۔ اگلی کئی تصاویر میں ان کے مختلف پوز خوب صورتی سے ڈرا کیے گئے تھے۔ ترش کافی کو حلق میں انڈیلتے وہ اس البم کی ہر تصویر بغور شوق دیکھ رہا تھا۔ کھڑکی سے باہر نظر آتا آسمان ابھی تک اندھیرے کی زد میں تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ اطالیہ کے لوگوں کو روشنی کے لیے مصنوعی قمقموں پر انحصار کرنا پڑے گا۔

اگلے صفحے پر ایک اور خوب صورت تصویر اس کی آنکھوں کو لبھانے کے لیے موجود تھی۔ جس میں اس جوڑے کے ساتھ ایک پانچ سالہ بچی نظر آ رہی تھی۔ جس کی آنکھوں کا رنگ نیلا تھا۔ بچی کے چہرے پر بہت خوب صورت مسکراہٹ تھی۔ ایک مکمل اور خوشحال خاندان۔

"یہ میری اکلوتی بیٹی اجالا ہے۔ یہ ہماری شادی کے پانچ سال بعد پیدا ہوئی تھی۔ اس لیے رفیعہ نے اس کا نام اجالا رکھا۔ پیارا نام ہے نا؟"

اس نام پر ایان کے دل نے بیٹ مس کی۔ اس نے سرفراز کی جانب دیکھا۔ بات کرتے ان کے

لہجے میں بیک وقت اداسی اور خوشی تھی۔ ایان کو دھوپ چھاؤں کا یہ حسین امتزاج بہت اچھا لگا۔
اگلے چند صفحات پر ان تینوں کے مختلف اسکیچز تھے۔
"یہاں اجالا سات سال کی تھی۔ اس نے اسپیچ میں پہلی ٹرافی جیتی تھی۔"
وہ ساتھ ساتھ ایان کو ہر تصویر کے بارے میں بتاتے جا رہے تھے۔ ایان پوری توجہ سے تصاویر دیکھتے ہوئے سرفراز کو سن بھی رہا تھا۔ پھر اس نے دو تین صفحات مزید پلٹنے چاہے، جو پھٹے ہوئے تھے۔ البم میں ان کی باقیات ٹکڑوں کی صورت موجود تھی۔ جو یقیناً صفحات کو کھینچتے ہوئے البم میں جڑے رہ گئے تھے۔ ایان نے سوالیہ نظروں سے سرفراز کی طرف دیکھا۔
"یہ اسکیچز اتنے اچھے نہیں تھے۔ اس لیے ان کی موجودگی البم کی زینت خراب کرتی محسوس ہو رہی تھی۔"
ایک بہانہ سے گھڑتے ہوئے انہوں نے اپنی پیشانی مسلی تھی۔ اور ایان نے یقین کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ حالانکہ وہ متکلم کا جھوٹ جان چکا تھا لیکن وہ ایک اچھا سامع تھا۔ جسے سن کر کریدنا سخت ناپسند تھا۔
اگلی تصویر نے ایان کے تراشیدہ لبوں کی مسکراہٹ کو سکیڑ دیا۔ یہ ہسپتال کے ایک کمرے کا منظر تھا۔ جہاں بستر پر لیٹی عورت کے جسم میں جگہ جگہ سوئیاں نصب تھیں اور ایک انیس بیس سالہ لڑکی گلاس ڈور کے سامنے غمگین کھڑی آنسو بہا رہی تھی۔ تصویر مکمل ہو گئی تھی۔ آنکھوں کی زمین نے رنگ بدلا۔ حیرت کی جگہ دکھ و تکلیف اکٹھی ہونے لگی۔ وہ اجالا تھی، اجالا سرفراز۔ اس تکلیف دہ کہانی کے ایک سرے نے ایان کی کہانی کو ساتھ باندھ لیا تھا۔
"رفیعہ کو برین ٹیومر ہو گیا تھا۔"
سرفراز کی آواز پر ایان نے پشت چھوڑی اور افسردہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔ کہانی اب غمگین موڑ پر تھی، جبکہ قاری کو اختتام جاننے کی جلدی تھی۔ کہ آیا کہانی کے آخر پر "اور پھر وہ سب ہنسی خوشی رہنے لگے۔" جملہ لکھا گیا تھا یا نہیں۔
لیکن مزید کچھ کہنے کے بجائے اس نے اگلی تصویر کی طرف توجہ دی۔ جہاں ایک اور اسکیچ ایان کو کہانی کا سرا تھمانے کے لیے موجود تھا۔ اس تصویر میں وہ ہی نوجوان آدمی جوانی ادھیڑ عمری میں تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں۔ اور ایک جانب اس عورت کے سرد جسم کے سامنے اجالا بیٹھی تھی۔
ایان نے ناسمجھی سے سرفراز کی جانب دیکھا۔ جن کی آنکھیں سرخی مائل رنگ اوڑھنے لگی تھیں۔
"ایک آرٹسٹ کے پاس اتنا پیسہ نہیں تھا کہ وہ اپنی متاع حیات کا علاج کروا سکتا۔ وہ تڑپ رہی تھی۔ لحہ لحہ اس کی رگوں سے زندگی زائل ہو رہی تھی اور میں......"
گلے میں کچھ اٹکنے لگا یا شاید گزرے وقت کے بہت سے کانٹے حلق میں اتر آئے تھے۔ جنہیں اگلنا مشکل تھا اور نگلنا جان کا عذاب۔ کمرے کی فضا یکدم بوجھل ہو گئی۔
"پھر میں ایک ایسے فیصلے کا مرتکب ہوا جس نے سب کچھ خاک میں ملا دیا......" آنکھوں کی نمی نے شرمندگی کو ڈھانپا۔ لیکن وہ پھر بھی واضح رہی۔ آواز میں، چہرے پر۔ نمی کی صورت۔"
میرا گھر۔ ہماری زندگیاں۔ میری بیٹی۔ اور سب سے بڑھ کر۔ ہمارا رشتہ۔"
ایان نے البم ایک طرف ڈال کر ان کا ہاتھ تھاما۔ کمرے میں ٹھہری ہر شے اداسی کی لپیٹ میں آنے لگی تھی۔ کہانی کار سر جھکائے اپنے بکھرے ٹکڑے جوڑنے کی کوشش میں تھا۔ ایان کے پاس دلاسا دینے کو الفاظ نہیں تھے۔ کچھ نقصانات کے سامنے الفاظ بے وقعت ہو جاتے ہیں۔ بے معنی۔ ہر احساس سے خالی۔
"رفیعہ کی زندگی کے دام بہت زیادہ تھے اور میں خالی ہاتھوں کو کشکول بنائے ان گلیوں (جوا

خانہ) میں چلا گیا۔ جہاں کسی عام انسان کا جانا اسے ہمیشہ کے لیے اپنی دنیا سے دور کر دیتا ہے۔ جہاں کی معفر صحت ہوا جسم سے سانس کھینچ لیتی ہے۔ اور میرا سانس بھی کھینچ لیا گیا تھا لیکن اس فضا نے نہیں۔"

خاموشی ایک بار پھر سے دیوار کی مانند حائل ہوئی۔ اندر کی فضا باہر کی نسبت گرم تھی۔ تپش دیتی۔ آکسیجن کو کم کرتی ہوئی۔

"کشکول بھر کے الٹ دیا گیا تھا۔ اچانک ان گلیوں میں بھاری بوٹوں (پولیس ریڈ) کی آوازیں ابھریں۔ اور آہستہ آہستہ سب کچھ ان کے بوجھ تلے دبتا چلا گیا۔ میرے ہاتھ۔ کشکول۔ اور سب سے بڑھ کر رفیعہ کی زندگی۔" آنکھوں سے دھاریاں بہتی گال بھگو رہی تھیں۔

ایان نے نم پلکیں اٹھا کر اس لاغر وجود کو دیکھا جو ہچکیوں کو دبانے کے لیے سر جھکا گیا تھا۔ رونا تکلیف دہ نہیں ہے۔ تکلیف دہ وہ فیصلے ہوتے ہیں جن پر عمل پیرا ہونے کے بعد ہر سود بھی زیاں میں بدل جاتا ہے۔ اور انسان خالی ہتھیلیوں کو دیکھتے تقدیر کے اس کاری وار کے سامنے سر جھکانے پر مجبور ہو جائے۔

رشتوں کی محبت انسان سے ہر غلط کام کروانے کی طاقت رکھتی ہے۔ لیکن وہ غلط کام ہمیشہ غلط رہے گا۔ اسے ہم بھی درست کہہ کر جسٹیفائی نہیں کر سکتے۔ ایان نے صرف سوچنے پر اکتفا کیا۔

سرفراز کا کانپتا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر وہ ہولے ہولے دبانے لگا۔ آسمان پہ چھائے بادل انگڑائی لیتے پھر سے بیدار ہو چکے تھے۔ روما کی فضا ایک بار پھر سے بھیگنے جا رہی تھی۔ لیکن کمرے کی فضا میں ان آنکھوں کی نمی غالب تھی۔

☆☆☆

زندگی معمول کے مطابق آگے بڑھ رہی تھی۔ ہر صبح سورج ایک نئی امید اور بہت ساری نئی کہانیوں کو اپنے ہمراہ لیے آسمان کے سینے پر براجمان ہوتا۔ اور شام کو بہت سی کہانیوں کے انجام طے کرتا، امیدوں کو توڑتا نیلی چادر میں پناہ گزیں ہو جاتا۔ یہ بھی بہار میں ڈھلتی ایک ایسی ہی شام تھی۔ نارنجی آسمان نے تھال کو اپنی بانہوں میں چھپا چکا تھا۔ کلینک سے نکل کر وہ پتھریلی روش کو روندتی آگے بڑھ رہی تھی۔ اس کا رخ ٹائبر دریا کی طرف تھا۔ سر اٹھا کر وہ گاہے گاہے آسمان کو تکتی پرندوں کی قطاریں دیکھتی۔ کوئی آنکھوں میں انتظار لیے راستے تکتا ہو تو گھر جانے کی جلدی بھی ہوتی ہے لیکن۔ اس کی آنکھوں میں شام جیسی حسرت اتر آئی تھی۔ اس نے ایک حسرت بھری سانس روما کی فضا میں تحلیل کی۔ اندھیرا پھیلتے ہی راستے اور چوراہے روشن ہو گئے تھے۔ اور اتنی روشنی آنکھوں کو خیرہ کر دینے کو کافی تھی۔ اس کے قدم مین شاہراہ پر رک چکے تھے۔ سیاہی اپنے پر پھیلاتی جا رہی تھی۔ لیکن اس نے پروا کیے بغیر ٹرام کی جانب قدم بڑھائے۔ جو اسے ٹائبر دریا پر لے جانے کے لیے تیار تھی۔

☆☆☆

ستارے آسمان کے سینے پر محو گردش تھے۔ کالی چادر پہ ٹنکا چاند پوری آب و تاب سے روشنی بکھیر رہا تھا۔ جس کے سبب اندھیرے پھیکے پڑ رہے تھے۔ جینز کی جیبوں میں ہاتھ اڑسائے ایان ٹائبر دریا پر بنے سینٹ اینجلو برج پر کھڑا دریا کے دونوں کناروں کو بغور دیکھ رہا تھا۔ جو صدیوں سے ایک دوسرے کے ساتھ محو سفر تھے، لیکن ان کے درمیان اجنبیت کی بہتی دیوار آج بھی موجود تھی۔ دل و دماغ ابھی تک الجھن کا شکار تھے۔ جن میں پچھلے دنوں سنی کہانی کی بازگشت ابھی بھی جاری تھی۔

دن کی نسبت رات کے پہلے پہر سینٹ اینجلو برج پر خاموشی کا راج تھا۔ کیونکہ دائیں جانب سینٹ اینجلو کیسل کے باہر اکا دکا موجود لوگ اب واپسی کے سفر پر پاؤں دھر رہے تھے۔ دریا کا بے رنگ پانی فاصلوں پر لگے قمقموں کے عکس سے قوس قزح میں ڈھلا ہوا تھا۔ ہوا کی اٹکھیلیوں سے پانی میں بہا کرتی کھڑی روشنی کی پریاں محو رقص تھیں۔ کچھ دیر فصیل

سے گردن جھکائے اس رقص سے لطف اندوز ہونے کے بعد ایان نے اردگرد نظر دوڑائی اور دائیں جانب اس کی نگاہ ایک زاویے پر ٹھہر گئی تھی۔

"محبوب کو ایک نظر دیکھنے کے سوا بھی آنکھوں کا کوئی مصرف ہو سکتا ہے بھلا؟"۔ چہرے پر آئی خوشی نے اداسی کو پرے دھکیلا۔

اس سے کچھ فاصلے پر کھڑا وجود بلاشبہ اجالا سرفراز ہی تھی۔ وہ پل کی فصیل سے نیچے جھانکتی اردگرد سے بالکل بے خبر پانی کو محویت سے تک رہی تھی، اب پیچھے ہٹ کر فصیل کے عرشے پر چڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ پاؤں میں پہنے اسنیکرز اس کے لیے خاصے مددگار ثابت ہو رہے تھے۔ ایان نے نیچے جھانکا اور ہلکی سی جھرجھری لی۔ ہوا کے سنگ بہتے جھاگ اڑاتے پانی کی رفتار کافی تیز تھی۔

"کیا یہ خودکشی کی کوشش کر رہی ہیں؟"۔ اس کی آواز میں حیرت تھی۔ اور آنکھوں میں استعجاب۔ آس پاس کسی ذی روح کا سایہ بھی نہیں تھا۔ بار بار کوشش کرتی بالآخر وہ کامیابی سے ہمکنار ہو چکی تھی۔ اس نے فصیل کے چوڑے عرشے پر قدم جمائے اور ڈرتے ڈرتے کھڑی ہو گئی۔ ایان کے قدم اس کی طرف بڑھنے لگے۔

"اگر میں پانی میں گر گئی تو پھر ہمارا سامنا قیامت کے دن ہی ہوگا۔" وہ بھی ایک خاموش رات تھی۔ اجالا کے پاس ایک سایہ نمودار ہوا۔

"تمہارا وہم ہے اجالا سرفراز، کہ میں تمہیں خود سے پیچھے چھڑانے دوں گا۔ میں بھی اسی پانی میں کود کر امر ہو جاؤں گا۔ اور پھر۔" وقار نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ پانی اور ہوا کے شور میں ان کی آوازیں صاف سنی جا سکتی تھیں۔

"اور پھر۔؟" اجالا ابھی بھی پانی میں دیکھ رہی تھی۔ جو شفاف تھا۔ ان کے رشتے کی طرح۔

"پھر ہم دونوں بھوت بن جائیں گے اور لوگوں کا جینا حرام کریں گے۔" اس کے جواب پر اجالا کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ جس کی گونج آہستہ آہستہ خنک ہوا میں تحلیل ہو گئی۔

اس ہولناک خاموشی میں قدموں کی چاپ پر، اس نے مڑ کر دیکھنے کی کوشش کی۔ جب اچانک اس کا پاؤں ہلکا سا مڑا۔ توازن بگڑنے کے باعث وہ گرنے کو ہی تھی۔

اردگرد کی [illegible] ہوئی...... آسمان سے جھانکتے ستاروں نے آنکھیں ڈھانپیں...... ایان کے دل کو دھچکا لگا...... اجالا کا اپنا دل بھی ڈوب گیا۔ اور وہ اس لمحے کو آخری جان کر آنکھیں میچ گئی۔ لیکن یک بیک ایک ہاتھ مضبوطی سے اس کا بازو مقید کر چکا تھا۔ اجالا نے اس گرفت کو محسوس کیا۔ فضا کی ٹھہری سانسیں پھر سے رواں ہوئیں۔ ستاروں کی روشن آنکھوں کی چمک بڑھی۔ کہانی کے اصل کردار ایک بار پھر سے روبرو آ چکے تھے۔ حسین حادثے نے راستے یکجا کر دیے تھے۔

اجالا نے آنکھیں کھولیں اور پلٹ کر دیکھا۔ وہاں کوئی اس کا ہاتھ تھامے کھڑا تھا۔ یاد نے حقیقت کا روپ دھارا۔ ہاتھ کو مضبوطی سے تھامے اس نے چھلانگ لگائی اور مضبوط زمین پر قدم جمائے۔ خوف کے باعث اس کا تنفس تیز چل رہا تھا۔ رخ پھیر کر وہ چند لمحے گہرے گہرے سانس لینے میں مصروف رہی۔ کچھ دیر پہلے ایڈونچر کا شوق پتلی گلی سے بھاگ چکا تھا۔

"ویسے خودکشی کرنے کے اور بھی بہت سے طریقے ہیں۔ پبلک پلیس پہ کوئی نہ کوئی آپ کو اس ارادے سے باز رکھ ہی لیتا ہے۔" ایان کے چہرے کا اعتماد بحال ہو چکا تھا۔ چند لمحے پہلے کے خوف کے تاثرات زائل ہوئے تو چہرے پر ایک شرارت بھری مسکان پھیلی۔

"کیا۔ خودکشی اور اجالا سرفراز۔ کیوں؟۔ میں نے کون سا گناہ کیا، کسے دھوکا دیا جو میں اپنی جان لوں؟"۔ پھولی سانس کے ساتھ وہ بولی تو اس کی آواز خاصی مدھم تھی۔ گو کہ دھڑکن کی رفتار اب بھی تیز تھی۔ لیکن منتشر تنفس قابو میں آ چکا تھا۔

digest.library.com

"تو یقیناً آپ رات کے پہلے پہر آبی جانوروں کو سیشنز دے رہی تھیں۔ ویسے کون کون سے نفسیاتی مسائل تشخیص ہوئے۔؟" ایان اس کا ہاتھ تھامے ساتھ قدم ملا کر چلتا دریافت کر رہا تھا۔ ان کا رخ پل کے دائیں جانب تھا۔

اجالا کے قدم رک کر ایان کی طرف مڑے۔ ہاتھ چھڑا لیا گیا۔ ماتھے پہ بل واضح تھے لیکن ہونٹ مسکراہٹ میں ڈھلنے لگے۔ اس کی نیلی آنکھوں کے سمندر میں ایان کا دل ڈوبا۔ اور پھر ابھر نہیں سکا۔ اس نے نگاہوں کا ارتکاز بدلا۔

"آپ میرے ساتھ کیوں چل رہے ہیں۔؟" تین چار سیڑھیاں اتر کر وہ ایک پتھریلے زینے پر بیٹھتی پوچھ رہی تھی۔

"تاکہ آپ دوبارہ گرنے لگیں تو آپ کو بچا سکوں۔" اس کے پیچھے کھڑے ایان نے مدھم آواز میں کہا۔

آفتاب کی لودیتی کرنوں نے اس چہرے کا احاطہ کیا تھا۔ سرسراتی ہوا کان میں سرگوشی کرتی گدگدانے لگی تھی۔ چہرے پر کئی رنگ عیاں ہوئے تھے۔ حیرت...... غصہ...... شرارت...... اور...... شناسائی۔

☆☆☆

"میں ماہر نفسیات بن کر جاننا چاہتی تھی کہ وہ کون سے محرکات ہیں جو لوگوں کو ایک دوسرے کا ساتھ چھوڑنے پر مجبور کر دیتے ہیں؟۔ وہ کون سی وجوہات ہیں جو محبت جیسے خوب صورت جذبے کو نفرت میں تبدیل کرتی ہیں۔" آئس کریم کھاتے اجالا نے گفتگو کا آغاز کیا۔ لیکن اسے حیرت نہیں ہوئی کہ میٹھا ذائقہ زبان کو ترش محسوس ہو رہا تھا۔

"پھر کیا جانا آپ نے؟" ایان نے سامنے کھڑے چیری بلاسم کے درخت کو دیکھا۔ جس کے نازک پھول ہوا کی سختی سے زمین بوس ہو رہے تھے۔ بہار کا یہ منظر ہر خوب صورتی کو مات دینے کے لیے کافی تھا۔

"انسان اس دنیا میں صرف ایک جذبہ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ محبت کا جذبہ۔ باقی تمام جذبے نفرت، حسد، جلن یہ سب انسان کی اپنی سوچ کے عکاس ہیں۔"

اس کی نظریں دور اودے دھندلکوں میں جلتی روشنیوں پر تھیں۔ جبکہ اس کی اپنی آنکھوں میں جلتے دیے وقت کی تیز ہوا سے دھوئیں کی شکل اختیار کر چکے تھے۔

"لیکن کتنی عجیب بات ہے نا کہ ہم محبت جیسے آفاقی جذبے کو لیٹ ڈاؤن کرنے کے لیے ان جذبات کا سہارا لیتے ہیں جن کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہے۔" زرد روشنیوں میں اس کی شفاف رنگت بھی پیلی پڑ رہی تھی۔ کمر پہ گری سنہری آبشار سے ہوا کی شرارتیں جاری تھیں۔

"پرانے زمانے کی محبت جدید دور سے زیادہ اچھی تھی۔ تب لوگ محبوب سے بچھڑ کر زندہ رہنا گناہ سمجھتے تھے۔" اس نے بات کرتے چہرے پہ جھولتی لٹیں کان کے پیچھے اڑسیں۔ حلق نمکین پانی سے تر ہونے لگا تھا۔ ہوا کی سرسراہٹ کوئی گیت بننے لگی تھی۔ اداس گیت۔

"لوگ اب بھی مر جاتے ہیں اجالا۔" ایان کے تصور میں یک بیک لاغر جسم اور دو بھیگی آنکھوں نے بسیرا کیا۔ اسے پھر سے وہ پژمردہ چہرہ یاد آیا تھا۔ جس کی تکلیف اسے پچھلے کئی دنوں سے بے چین کیے ہوئے تھی۔ "پر ہم صرف سانس کے رکنے یا جسم کی تدفین کو ہی موت گردانتے ہیں۔ جبکہ ہم جانتے ہیں کہ محبوب لوگوں کا بچھڑنا ہمارے اندر زندگی کو مار کر ہمیں چلتی پھرتی لاش میں تبدیل کر دیتا ہے۔"

دریا کنارے کھڑے بوسیدہ درختوں پر پرندوں کا شور اٹھا۔ خاموشی شور کے سامنے سرنگوں ہوئی۔ دور کسی غیر مرئی نقطے کو تکتی اجالا نے ایان کی جانب دیکھنے سے اعتراض کیا۔ وہ اس کی ہر بات سے متفق ہونے کے باوجود اقرار کرنے سے خوف زدہ تھی۔

"اور ایسی موت سانس رکنے سے زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے۔ جس میں سانس تو چلے پر زندگی کی رمق محسوس نہ ہو۔ آنکھوں میں بصارت ہونے کے باوجود محبوب چہروں کے اوجھل ہونے سے بینائی

چھن جانے کی اذیت صرف محبت کرنے والے ہی سمجھ سکتے ہیں۔" پگھلی آئسکریم کو ایک جانب رکھ دیا گیا۔ زبان نے ذائقے سے مکمل انحراف کر لیا تھا۔

"ہر شخص کہیں نہ کہیں کسی دوسرے کے لیے اس کی وہ پیراڈائیز ہے جس کے لاسٹ ہونے کے بعد انسان اپنی پچھتاوے کی دوزخ میں جلنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔" اس نے خاموش ہو کر ایک ہاتھ کے ہیلے پر ساکت بیٹھی اجالا کی جانب دیکھا۔ جو ایک خاموش سامع کی طرح سن رہی تھی۔

"اور اس دوزخ میں جلنے سے بچاؤ کی کیا تدبیر ہے؟" اجالا کو اپنی ہی آواز غیر شناسا محسوس ہوئی۔ پشیمانی میں لپٹی ہوئی۔ اندیشوں میں جکڑی ہوئی۔

"رابرٹ فراسٹ کہتا ہے کہ زندگی صرف آج اور اسی لمحے میں ہے۔ جب ہم آزادی سے سانس لے رہے ہوں۔ اور جانتی ہیں آزادی سے سانس لینے کے لیے کیا ضروری ہے۔؟" ایان کی مدھم اور رواں آواز نے ہر جانب سکوت طاری کر دیا۔

اجالا کو یکدم رومال پر لکھے دو الفاظ 'کارپ ڈائم' یاد آئے۔ اس نے بے چینی سے ایان کو دیکھا جیسے یہ سکوت اسے جھنجوڑ رہا ہو۔ بے کلی دل و دماغ پر دھند کی طرح قابض ہو رہی تھی۔ اسے زندگی میں پہلی دفعہ خاموشی بری لگی تھی، بہت بری۔

"آزادی سے سانس لینے کے لیے ضروری ہے کہ ہم گزرے زمانے کو بھول جائیں۔ ماضی کی تلخیاں، کٹھنائیاں، تکالیف جو ہم پر عذاب کی طرح نازل ہوئیں۔ گلے شکوے جنہوں نے ہم سے ہمارے عزیز رشتے دور کر دیے...... سب فراموش کریں اور دیکھیں کہ تنفس کی بحالی میں آئی ساری رکاوٹیں دور ہو جائیں گی۔ پھولوں سے دوستی ہو گی اور رنگ پھر سے مہکنے لگیں گے۔ ستاروں سے چمکتا آسمان، چاند کی روشنی، بادل، بارش، ہوا، بہار و خزاں۔ ہر موسم دل کے موسم کے سنگ بہنے لگے گا۔ ماضی کے خوف اور مستقبل کے اندیشوں کو پیچھے چھوڑ کر اس لمحے سے لطف اٹھاؤ اجالا سرفراز۔"

دو ہاتھ کا فاصلہ سمٹتا گیا۔ ایان کا شانہ اجالا کے بالکل قریب تھا۔ اس نے آہستگی سے سر اس شانے پر رکھ دیا۔ لڑیوں کی صورت بہتے آنسو اس کی شرٹ بھگوتے رہے۔ اس شفاف پانی میں دل کا بوجھ، میل، نفرت سب کچھ بہتا جا رہا تھا۔ وقت کا پہیہ اپنی رفتار سے گھوم رہا تھا لیکن ایان کو محسوس ہوا کہ جیسے ساری دنیا کی گردش تھم گئی ہے۔ ہر چیز ساکن حالت میں کھڑی ہے، جیسے کہ اس کا دل۔

اجالا نے سر اٹھایا اور شرمندہ سی چہرہ صاف کرنے لگی۔ تب ہی پتھریلے زینے سے اٹھ کر ایان اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اجالا نے اس کی جانب دیکھا۔ نیلی آنکھوں میں موجزن سمندر ساکت تھا لیکن طوفان کے بعد کا فسوں جوں کا توں تھا۔

"چاند اور ستارے ہمیں دیکھ کر تھکن کا شکار ہو چکے ہیں۔" اس نے اپنا ہاتھ بڑھاتے شرارت سے کہا۔

اجالا نے خفگی سے ہاتھ تھام کر اس کے ساتھ قدم ملائے۔ اداس گیت مدھم ہوتے تھم گیا تھا۔ شور مچاتے پرندے چپ کی چادر میں پناہ گزیں ہو چکے تھے۔ خاموش فضا میں ان کے سانس لینے کی مدھم آواز قدموں کی چاپ میں گم ہو رہی تھی۔ کچھ دیر مسلسل چلتے رہنے کے بعد وہ اس بند دروازے کے سامنے کھڑے تھے۔ جس کی دوسری جانب کی دنیا میں یقیناً تغیر رونما ہونے والا تھا۔ الوداعی کلمات کہہ کر اجالا دروازے کی جانب مڑی۔

"میرے بابا کی وفات کے بعد میری ماں نے اپنے ایک دوست سے شادی کر کے مجھے اکیلا چھوڑ دیا تھا۔"

ایان کی آواز پر اس کے قدموں کے ساتھ مسکراتے لب بھی ساکت ہوئے۔

"میں بہت دنوں تک اس بات پر حیران رہا کہ میری ماں مجھے کیسے چھوڑ سکتی ہے لیکن پھر قدرت دوبارہ انہیں میرے دروازے پر لے آئی۔ اور میں نے کسی بھی حساب کتاب کے بغیر انہیں معاف کر دیا۔" ایان نے دو جملوں میں اپنی پوری زندگی اس کے گوش گزار کی تھی۔ اور یہ کہانی سنانے کا مطلب

اجالا اچھے سے جان گئی تھی۔

"اور میری ماں کا نام مسز روزینہ ابراہیم تھا۔" وہ متحیر سی پلٹی، لیکن ایان اپنی بات کہہ کر رکا نہیں تھا۔ اس کے ہونٹ گولائی میں ڈھلے اور رابرٹ فراسٹ کی نظم کارپ ڈائم کی دھن بجانے لگے۔

happyhappy,happy,"Be
of day the seize And
pleasure."""

فضا میں بکھری دھن اجالا کی سماعت تک بھی رسائی پا چکی تھی۔ اسے اپنی ایک مریضہ روزینہ یاد آئیں، جو اکثر و بیشتر اجالا کی بنائی پینٹنگز خریدتی تھیں۔ اسے اندازہ لگانے میں مشکل پیش نہیں آئی تھی کہ ایان ابراہیم کا اجالا سرفراز سے بار بار ٹکرانا اتفاق نہیں تھا۔ یا اگر یہ اتفاقات تھے تو آج سے پہلے تک اجالا سرفراز کو اتفاقات اتنے حسین نہیں لگے تھے۔ اس نے روشنیوں میں غائب ہوتے ایان کو آخری نظر دیکھا۔ اور دروازے کی جانب مڑ گئی۔

☆☆☆

اگلی صبح روما کے لوگوں کے لیے پچھلے دنوں جیسی ہی تھی۔ چمکتی، گرم اور کام سے بھرپور۔ شہنشاہ خاور روما کے باسیوں کو اپنی تپش سے پگھلا دینے کے لیے آسمان پر پوری شان سے براجمان تھا۔ ہوا کھڑکیوں سے جھانکتی لوگوں کے کاموں میں مداخلت کرنے میں مگن تھی۔ کھڑکی کے آگے لٹکے پردوں کو غصے سے پرے کرتے اس نے بستر پر دراز وجود کے گالوں کو گدگدایا۔ نیم وا آنکھوں کو پوری طرح کھولے اجالا نے مصنوعی خفگی سے ہوا کی شرارت کو دیکھا اور بستر چھوڑتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

کچھ دیر بعد وہ تریستیویئر کی گلیوں کو پیچھے چھوڑتے، تیز قدموں سے آگے بڑھ رہی تھی۔ گلیوں میں بنی دکانوں کے کھلے دروازوں سے دکاندار اور گاہکوں کی تکرار کی آوازیں سماعت کو بھلی محسوس ہو رہی تھیں۔ ریستورانوں سے کافی اور بریڈ سے بنے ناشتے کی اشتہا انگیز خوشبوئیں پاس سے گزرتے لوگوں کی بھوک بڑھا رہی تھیں۔ گلیوں کی نکڑیں تاش کھیلتے بوڑھوں کی ہنسی سے گونج رہی تھیں۔ اور وہ ہر چیز سے بے نیاز اپنی منزل کی طرف رواں تھی۔ جو چند قدم کی دوری پر اسے خوش آمدید کہنے کو بانہیں پھیلائے کھڑی تھی۔ اس مستطیل عمارت کے سامنے کھڑے ہو کر اجالا نے ایک گہری سانس لی اور دروازہ دھکیلتی اندر داخل ہوئی۔ ہاتھوں کی لرزش۔ دل کی دھک دھک کانوں کو بھی دہلا رہی تھی۔

"خوش آمدید۔"

گھنٹی کی آواز پر کاؤنٹر کے پیچھے کھڑے شخص نے آنے والے کو دیکھا اور جوش سے کہتے الفاظ ٹوٹ کر لبوں پر ٹھہر گئے۔ حیرت نے خوشی کا رنگ اوڑھا۔ ہاتھوں کی حرکت تھم گئی۔ آنکھوں کی پتلیاں، پھڑپھڑاتے لب، دل کی دھڑکن، ہر چیز ان دو لوگوں کی طرح جامد ہو گئی تھی۔ جو صدیوں بعد ایک دوسرے کے سامنے تھے۔ گزرے لمحے۔ تلخ و خوش گوار یادیں بہت کچھ ان کے بیچ آن کھڑا ہوا تھا شاید مٹ رہا تھا۔ آنکھیں ایک دوسرے کو تکتی جیسے صدیوں کی پیاس مٹانے میں مگن تھیں۔

چند لمحوں بعد اجالا کی نظر نے سرفراز کے چہرے سے پیچھے دیوار پر لگی پینٹنگ تک سفر کیا۔ بھاری قدم بمشکل کاؤنٹر تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ کاؤنٹر کے سامنے ایک کرسی پر براجمان ہو کر وہ سر جھکا گئی تھی۔ سفر مشکل نہیں تھا لیکن تھکن زمانوں بھر کی تھی۔ سرفراز نے تیز قدموں سے چلتے، دروازے پر اوپن کے بجائے کلوزڈ کا بورڈ آویزاں کیا اور واپس کاؤنٹر کے پیچھے آ گیا۔

"یاد ہے۔ یہ پینٹنگ مجھے کتنی بری لگتی تھی۔"

اس نے سر اٹھا کر سرفراز کی جانب دیکھا جو پیالوں کو بھوری کافی سے بھرنے میں مصروف تھے۔ کپ بھر چکے تھے۔ کافی کے ساتھ ساتھ خوشی سے بھی۔ انہوں نے سر ہلایا اور ایک کپ اجالا کے سامنے رکھ کر نشست پر براجمان ہو گئے۔ ان کے قدم بمشکل ان کا وجود گرنے سے سنبھالے ہوئے تھے۔ بہت زیادہ خوشی

digest library.com

ورغم میں یہ ہی کیفیت ہوتی ہے۔ انسان کے قدم اس کا بوجھ سنبھالنے سے انکاری ہو جاتے ہیں۔

"کیونکہ رفیعہ نے زبردستی تمہیں گود میں بٹھا رکھا تھا۔"

"جبکہ میں اپنے کھیل میں بے طرح مصروف تھی۔ اور یہ خلل مجھے بری طرح کھلا تھا۔" سرفراز کی آدھی بات اجالا نے پوری کی تھی اور دونوں کے قہقہوں سے کینٹین کے در و دیوار کھلکھلا اٹھے تھے۔

یاسیت پھیلنے لگی تھی۔ مدت سے اداس ٹھہرے لمحے نے گزرنے کی ٹھانی۔

"میں جانتی تھی کہ آپ ان گلیوں میں صرف ما کے علاج کے لیے گئے تھے۔" خاموشی کے ایک مختصر وقفے کے بعد اجالا نے سر جھکا کر اعتراف کیا۔

سرفراز نے ایک لمبی سانس خارج کی۔ ایک تھکن زدہ سانس۔ جس کے بعد ایک سکون رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا۔ کافی کی بھینی مہک نے چہار سو مہکا دیے تھے۔

"وقار کا منگنی ختم کرنا۔ ماما کی ڈیتھ۔ اس سب کے بعد میرا ذہن صرف یہ ہی سوچ سکا کہ آپ قصوروار ہیں بابا۔" اس نے سر اٹھا کر قبول کیا تھا پانی سے لبریز نیلی آنکھیں کانچ جیسی لگ رہی تھی اور بدگمانی کا کانچ تڑخ ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو گیا تھا۔ "لیکن میں بھول گئی تھی کہ بعض اوقات تقدیر کے حادثات اس قدر کاری ہوتے ہیں کہ ہمیں اپنے حواس سلب ہوتے محسوس ہوتے ہیں۔ اور ہم اپنے عزیز از جان رشتوں کو کھو کر قسمت کے کیے نقصان کو انسانوں کے ذمے ڈال دیتے ہیں۔ یہ سوچے بغیر کہ محبت کرنے والے تو جان دے کر بھی محبوب کی زندگی بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔"

سرفراز نے حیرت سے سر اٹھایا۔ خوشی نے عرصے سے اس چہرے پر قابض اداسی کو نوچ پھینکا۔ انہیں اپنی بصارت جھوٹتی محسوس ہوتی۔ کانپتے ہاتھ سے انہوں نے اجالا کا ہاتھ تھاما۔ سالوں سے جمع گلے شکوے آنکھوں کے ذریعے بہہ رہے تھے۔ منظر دھل کر نکھر گیا تھا۔ کھڑکی سے گرتی سورج کی کرنیں ماضی کے ہر اندھیرے کو اپنی لپیٹ میں لے کر ختم کر چکی تھیں۔ اب وہاں سب کچھ تھا۔ خوشی امید اور ہمیشہ کا ساتھ۔

☆☆☆

"میں جانتا ہوں تم مجھ سے خفا ہو۔ پچھلے سات سالوں میں، میں ایک بار بھی تم سے ملنے نہیں آ سکا۔ کس منہ سے آتا۔؟ زندگی میں ہر طرف اندھیرا تھا۔ آنکھیں اجالے کی ایک کرن کو ترس گئی تھیں۔" بات کرتے انہوں نے مٹی کے ڈھیر پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔ آنسو گالوں پر لڑھک کر گریبان میں گر رہے تھے۔ "مسٹر اور مسز جوزف سے ملاقات ہو گئی ہو گی تمہاری۔ ہمارے بعد ان دونوں نے ہی اجالا کا خیال رکھا تھا۔ مسٹر جوزف جاتے وقت اپنا کافی ہاؤس مجھے سونپ گئے تھے۔ ان کی امانت سنبھال رہا ہوں۔"

بیتے سمے کی ساری باتیں بتائی جا رہی تھیں۔ لیکن سامع خاموش تھا۔ اور یہ خاموشی متکلم کے لیے جان کا روگ تھی۔ جسے جھیلنا مشکل تھا، بہت مشکل۔

"رات میں نے اجالا کا اسکیچ بنایا۔" ہاتھ کی پشت سے آنسو صاف کر کے سرفراز نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر سامنے کیا۔ جس پر ایک چہرہ خوب صورتی سے ڈرا کیا گیا تھا۔

"میرے اندر کا آرٹسٹ مجھے واپس مل گیا ہے رفیعہ۔ سب کچھ مل گیا ہے۔ بس تم نہیں ہو۔"

آخری بات پر زبان میں لرزش آ گئی۔ آنکھیں صاف کرتے وہ پھر سے رو دیے تھے۔ تبھی ایک ہاتھ خاموشی سے ان کے کندھے پہ آن ٹھہرا۔ سرفراز نے سر اٹھائے بغیر اس ہاتھ کو تسلی سے تھپکا۔ قبر کی مٹی کو پیار سے چھوا اور اس ہاتھ کو مضبوطی سے تھامے شہر خاموشاں سے باہر چل دیے۔

☆☆☆

یہ تریستیونیر میں ایک مقامی نمائشی عمارت تھی۔ نیلے آسمان سے گرتی سنہری کرنیں اسے اپنے حصار میں لیے ہوئے تھیں۔ باہر سے پرسکون کھڑی عمارت کا اندرونی ہال اس کے برعکس منظر پیش کر رہا

تھا۔ ہال کی دیواریں آج صرف ایک ہی مصور کے مسودے اپنے جسموں پر سجائے چمک رہی تھیں۔ ہال میں مقامی لوگوں کے ساتھ سیاح بھی ان رنگ برنگی تصویروں کو دیکھنے اور سراہنے میں مگن تھے۔ جن پر صرف ایک نام کندہ تھا۔ یو ایس اجالا سرفراز۔

آج کئی سالوں بعد بلآخر اسے اپنے سوال کا جواب مل گیا تھا۔ کہ اس کی ساری پینٹنگز ایان ابراہیم ہی کیوں خریدتا تھا۔ ساکت لب یکدم ہی مسکراہٹ کی لپیٹ میں آئے تھے۔ کچھ دور کھڑے سرفراز صاحب نے اس مسکراہٹ کو طمانیت سے دیکھا اور اس کے دائمی ہونے کی دعا مانگی تھے۔

☆☆☆

یہ رات کا پہلا پہر تھا۔ سفید بادلوں کے چھوٹے چھوٹے گچھے نما روئے فلک پر محو گردش تھے۔ سنہری تھال کے سینے سے گر کر بکھرتی چاندنی میں ہر شے منور اور اجلی محسوس ہو رہی تھی۔ ایک سحر تھا جو سارے ماحول کو اپنی نرم گرفت میں جکڑے ہوئے تھا۔ وہ دونوں آج بھی ٹائبر دریا کے پل پر کھڑے نیچے بہتے پانی پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔ چند قدم کے فاصلے پر۔ مگر ساتھ ساتھ۔ خاموش۔ لیکن ایک دوسرے کو سنتے ہوئے۔ روشن آسمان پر ان گنت جگنو اپنی نرم روشنیاں زمین کی گود تک پہنچا رہے تھے۔ چاند کی ساکت تصویر بہتے پانی میں رقصاں تھی۔ ہوا کی مدھر سرگوشیاں ان دو لوگوں کو گدگداتی، چھیڑ خانی کرتی آگے بڑھ رہی تھیں۔ ایک فسوں تھا یا شاید جادو۔ جس کے سحر میں ان کہے جذبوں کی بازگشت سنی جا رہی تھی۔

"تم نے دوبارہ پوچھا نہیں کہ وقار کون تھا؟" اجالا نے نظریں اس کی جانب پھیرتے ایک لایعنی بات سے گفتگو کا آغاز کیا۔ ہوا کی سرگوشیوں میں کسی محبت بھرے گیت کی لہریں تھیں۔ جس کی ان سنی لے پر دو دل محو رقص تھے۔

"مجھے ادھوری کہانیاں سننا بالکل پسند نہیں۔" لمحہ بھر اس کی طرف دیکھ کر منہ پھیرتا ایان اس بات پر جیلس ہوا تھا۔

اس ادا پر اجالا کے دل کی دھڑکنیں تھم تھم کر رواں ہوئی تھیں۔ ایک بے ساختہ قہقہے سے روما کی فضا کھنکھنا اٹھی تھی۔ ایان کی سماعت نے اس نقرئی قہقہے کو اپنے اندر تک اتارا اور سرشار ہوئی۔

"میری پہلی پینٹنگ کب خریدی تھی تم نے۔؟" اجالا نے اس کے ناراض چہرے پر نظریں جماتے ایک پیکٹ اس کی طرف بڑھایا۔

"امم۔ یاد نہیں۔" پیکٹ ہاتھ میں لیتے جان بوجھ کر اس کی بات کو ٹالا گیا۔ جبکہ اس کی مسکراہٹ میں پوشیدہ جھوٹ کو اجالا سے بہتر کون جانتا تھا۔

پیکٹ سے کاغذ ہٹاتے ہی ایان کی آنکھیں حیرت و بے یقینی میں ڈھلیں۔ فریم شدہ پینٹنگ میں ایان کی سبز آنکھیں تھیں اور ان میں چمکتا اجالا کا عکس۔ مصور کے ہاتھوں نے محبت کو جلا بخش دی تھی۔

اگر یہ اقرار تھا تو ایان کو اس سے زیادہ خوب صورت اقرار دیکھنے کو نہیں ملا تھا۔ اس کے ہاتھ بے ساختہ پینٹنگ کی سطح کو چھونے لگے۔ فضاؤں نے اس اقرار کو عقیدت سے دیکھا اور بوسہ دیا۔ زمین سے فلک تک محبت کی بازگشت تھی۔ چھن کر گرتی چاندنی نے ان چہروں کو نظروں میں بھر رکھا تھا۔

"ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ۔ وقار میرا منگیتر تھا۔" وہ پل سے نیچے جاتے راستے پر قدم بڑھا چکے تھے۔ جب اجالا کی آواز نے گمبھیر خاموشی کو توڑا۔

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی ایان اپنی سماعت کا راستہ روک چکا تھا۔ اس کا ہاتھ ہٹانے کی کوشش کرتے وہ اسے اپنی ادھوری کہانی سنا رہی تھی۔ فضا کی آنکھیں اس خوب صورت منظر سے اپنی بینائی کو تقویت پہنچا رہی تھیں۔ گزرتے پل اس کہانی کے اختتام پر خوش تھے۔

لیکن ٹھہرو۔ یہ اختتام نہیں تھا۔ روما کی محبت بھری فضا میں سانس لیتی ایک نئی کہانی کا جنم تھا۔ اور کہانیاں ایسے ہی تو جنم لیتی ہیں۔ کہ جہاں محبت کی راہ گزر پر چلنے والوں کو منزل مل ہی جاتی ہے۔

☆☆

عقیلہ ہاشمی

بھروسا

digest library.com

"اماں! چائے کی پتی ختم ہو گئی ہے منگوا دیں۔"

حمیدہ بیگم نے کچن میں قدم رکھا تو مائدہ (بڑی بہو) پتی کا خالی ڈبا ہاتھ میں پکڑے قریب چلی آئی۔

"اے گھر کے سودے میں تو اس بار تین پیکٹ آئے تھے۔ مہینہ ختم ہوا نہیں پتی پہلے ختم کر ڈالی تم دونوں نے۔" خالی ڈبے پر نظر پڑتے ان کا پارہ ہائی ہو گیا۔

"اماں! بات تو آپ ایسے کر رہی ہیں جیسے چائے صرف ہم دونوں ہی پیتی ہیں، ماشاءاللہ سے بھرا پورا گھر ہے بڑے تو بڑے بچے بھی چائے پینے کے لیے تیار رہتے ہیں اور الزام آجا کے ہمارے اوپر۔"

خالی ڈبا پٹخنے کے انداز میں شلف پر رکھ کر وہ بھی گلہ کیے بغیر نہ رہ سکی۔

یہ ان کا شیوہ تھا کوئی بھی کام خراب ہوتا فوراً الزام دونوں بہوؤں پر ڈال دیتیں۔

"اگر اتنی ہی ہماری تکلیف ہے تو چھوڑ دیتے ہیں ہم چائے۔ ایک چائے ہی تو تھی جو پی لیتے تھے۔ ورنہ تو اس گھر میں پینے کو اور کیا ہے۔"

مائدہ کی زبان ان بیس سالوں میں اب ساس کے سامنے اتنی چلنے لگی تھی کہ وہ انہیں سچی بات سنا سکتی ورنہ تو ساری زندگی انہوں نے صرف انہیں کان لگا کر سنا ہی تھا۔

"اے تم تو کوئی بات نیچے گرنے ہی نہیں دیتیں۔ میں کیا کہہ بیٹھی۔ ساری زندگی کبھی کوئی حساب کتاب نہیں مانگا تم سے لیکن اب تو تم لوگوں کو بھی گھر کے حالات کا پتا ہے مہنگائی کا کیا عالم ہے وہ بے چارے کمانے والے تو دن رات محنت کر کے لاتے ہیں اور گھر میں بیٹھی عورتیں اگر دونوں ہاتھوں سے لٹانے لگیں تو پھر لگ گئی نیا کنارے۔"

اس نے پتی کیا مانگی، اماں کو ایک نیا موضوع مل گیا تھا۔ اب سارا دن اسی پر سیر حاصل بحث ہوتی تھی۔

"اماں! باتیں بعد میں سنا لیجیے گا۔ پہلے پیسے دیں میں منے کو بازار بھیج کر پتی منگوا لوں چائے لیٹ ہو گئی تو ناصر خوامخواہ میں سارا غصہ میرے اوپر اتار دیں گے۔"

ناصر کا مزاج ایسا تھا ذرا سی بھی بھنک پڑ جاتی کہ کوئی چیز منگوانے والی ہے تو ابھی سارے کام چھوڑ کر مائدہ کی مٹی پلیت کر ڈالتا کہ "حد ہوتی ہے لاپروائی کی بھی۔ تمہیں پتا ہی نہیں کوئی چیز ختم ہوئی ہے اور تم اب صبح صبح بتا رہی ہو۔"

اسی بات سے بچنے کے لیے اس نے خاموشی سے ساس کو آگاہ کیا تھا جن کے ہاتھ میں گھر کا سارا خرچا تھا لیکن وہ بھی خاموشی سے بات کہاں سنتی تھیں۔ پورے گھر کو سنا کر چیز منگوا کر دیتی تھیں۔

پیسوں والی تھیلی نکالتے ہوئے اب ان کے غصے کا لیول بڑھنے لگا تھا۔ "پیسے کوئی درختوں پر نہیں اگتے جو دونوں ہاتھوں سے لٹاتی بھی رہو تو خیر ہے۔ جائے گا میاں اور توڑ کر لے آئے گا۔" مڑا ہوا سو کا نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے وہ مسلسل بولے جا رہی تھیں۔

"یہ......!" اس نے سو روپے کو یوں دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو اس کے تو چار ساشے بھی نہ آئیں گے۔

"ہاں تو جاؤ منگوا لو منے سے پتی۔ اب کیا ایک کلو کا پیکٹ منگوا کے دوں اس وقت۔ ابھی گزارہ کرو، شام کو صفدر آئے گا تو سودا منگوا دوں گی۔" حمیدہ بیگم اس کے ہاتھ میں نوٹ تھما کر کچن سے چلی گئی تھیں۔

"اے باجی۔ توبہ ہے جو خالہ جی کی زبان بھی تھکتی ہو کچن میں آتے ہی نان اسٹاپ بولتی جائیں گی اور بیٹوں کے سامنے ایسی معصوم بن کر بیٹھ جاتی ہیں جیسے منہ میں زبان ہی نہ ہو۔" رجو نے حمیدہ بیگم کے جاتے ہی کانوں کو ہاتھ لگایا۔

"اچھا۔ تو تو چپ کر" وہ پیسے ہاتھ میں تھامے منے کو جگانے کمرے میں چلی گئی۔ اسے جگانے میں بھی ابھی سو جتن کرنے تھے۔

☆☆☆

"بھابھی! سرف کہاں پڑا ہے"

جویریہ (دیورانی) نے مشین میں کپڑے ڈالے تو دیکھا سرف کا پیکٹ خالی پڑا منہ چڑا رہا تھا۔

"وہیں ہوگا جویریہ، میں کون سا ساتھ لے کر پھرتی ہوں۔ کچن کے کیبن میں سارا سودا رکھا ہوتا ہے۔"

صبح چائے کی پتی پر اس کی ساس کے ہاتھوں اچھی خاصی عزت افزائی ہو گئی تھی پھر جاتے ہوئے ناصر ہاف فرائی انڈے کو فل فرائی بنا ڈالنے پر خوب باتیں سنا کر آفس روانہ ہوا تھا۔ اس لیے آج اس کا موڈ خراب تھا۔

"وہاں نہیں ہے بھابھی، تب ہی، تو پوچھ رہی ہوں، میں نے تو مشین میں پانی ڈال کر کپڑے بھی ڈال دیے ہیں۔" جویریہ فکرمندی سے بولی۔

آج کھانا بنانے کی باری مائدہ کی تھی، اس نے سوچا وہ رجو کو ساتھ لگا کر کپڑے دھو ڈالے لیکن عین وقت پر سرف غائب تھا۔

"خدا کے لیے جویریہ، آہستہ بولو اگر اماں نے سن لیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔"

وہ جانتی تھی سارا نزلہ اس کے سر گرنا تھا۔ ساس کے بعد گھر کی بڑی وہ تھی۔ گھر کا سودا سلف لا کر اس کے حوالے کیا جاتا تھا کہ وہ طریقے سے اسے رکھے، استعمال کروائے یا ختم ہو جانے کی صورت میں پہلے سے آگاہ کرے۔ یہ بھی اسی کی ڈیوٹی میں شامل تھا۔

وہ کمرے سے نکل کر جویریہ کے ساتھ سرف دیکھنے کچن میں چلی آئی، واقعی جس کیبن میں سرف رکھا تھا باقی چیزیں تو وہیں تھیں لیکن سرف غائب تھا۔

"مجھے تو لگتا ہے جویریہ، تمہیں دھوکا ہوا ہے یہ بھی تو ہوسکتا ہے پیکٹ استعمال ہو گیا ہو۔"

"لیکن بھابھی، جس دن سے سودا آیا ہے میں نے تو ایک ہی دن کپڑے دھوئے تھے پھر بھلا دونوں پیکٹ کیسے ختم ہو سکتے ہیں۔"

بات اس کی بھی صحیح تھی لیکن اب مائدہ کو بول کر معاملے کو اچھالنا نہیں تھا۔ حمیدہ بیگم کے ہاتھ بات پہنچ جاتی تو جو بے عزتی رہ گئی تھی وہ دگنی ہو جاتی۔ منے کو بازار بھیج کر جویریہ کو سرف منگوا کر دینے سے بات تو چھپی رہ گئی لیکن شام تک وہ اس گتھی کو سلجھانے میں الجھی رہی کہ آخر سرف گیا تو گیا کہاں؟

☆☆☆

"مائدہ! میری جرابیں کہاں ہیں؟" ناصر نے جوتا پہننے سے پہلے مائدہ کو آواز دے کر اپنی جرابوں کا پوچھا۔

"وہیں الماری میں ہوں گی ناصر۔ سارے جوڑے کل ہی تو رکھے ہیں۔"

وہ بچوں کو اسکول کے لیے تیار کر رہی تھی گڈو کو الگ سے منہ میں ناشتا ٹھونسنا پڑتا تھا اوپر سے ناصر کو ہر چیز پلیٹ میں رکھ کر پیش کروانے کی عادت تھی۔

"وہاں نہیں ہے تو تمہیں آواز دی ہے۔ اگر مجھے مل جاتیں تو میرا دماغ خراب تھا کہ تمہیں بلاتا۔" غصہ تو ماں کی طرح اس کی ناک پر دھرا رہتا تھا۔

وہ فوراً بچوں کو وہیں چھوڑ کر الماری کی طرف بڑھی۔ سارے کپڑے الٹ پلٹ کر ڈالے جرابوں کا نام و نشان نہ تھا۔

"ملیں؟" ناصر سر پر کھڑا اب اسے گھور رہا تھا جس نے اتنی دیر سے وہیں پر ہیں کی رٹ لگا رکھی تھی۔

"یہیں پر تو رکھی تھیں۔ میں کہہ دیتی ہوں ناصر، اس گھر میں کوئی جن ہے کوئی بھی چیز اپنی جگہ پر نہیں ملتی۔"

اس کا ایسا سوچنا تو بنتا تھا کبھی سرف تو کبھی چائے کی پتی اور اب جرابیں غائب تھیں۔

"کوئی جن ون نہیں یہاں۔ یہ جو تمہارے دو تین جن یہاں چوبیس گھنٹے پھرتے ہیں، ان کے ہوتے ہوئے کوئی اور جن ہو سکتا ہے یہاں۔" اس نے کل والے جوتوں سے پرانی جرابیں نکال کر پہنتے ہوئے اس کی بات کاٹی۔

"جاؤ، اب ناشتے کا کچھ کرو، نہیں تو تمہارا یہ جن وہاں بھی پہنچ جائے گا۔"

اس کے شک کو ہوا میں اڑاتے ہوئے وہ اپنی تیاری کرنے لگ گیا۔

☆☆☆

گھر سے آئے روز چیزیں غائب رہنے لگی تھیں۔ کبھی اچانک سے سرف غائب ہو جاتا تو کبھی ڈبے میں چائے کی پتی نہ ہوتی۔ مائدہ اور جویریہ یہ صورت حال دیکھ کر پریشان ہو گئی تھیں۔ کسی اور سے بات کرتیں تو وہ الٹا ساری بات ان دونوں پر الٹ دیتا جیسے ناصر نے مائدہ کو چپ کروا دیا تھا ویسے ہی وسیم نے جویریہ کو جھوٹا ثابت کر دیا۔

"یار! خدا کے لیے تم نا اپنی یہ دقیانوسی باتیں اپنے تک ہی رکھو بھلا آج کے دور میں ایسا ممکن ہے۔ سارا قصور تمہارا اور مائدہ بھابھی کا ہے دونوں انتہائی لاپروائی سے کام کرتی ہو۔"

چھوٹا بھائی تو ناصر سے دو ہاتھ آگے تھا۔ اماں کی زبان بولتا تھا۔ اس کا بھی یہی خیال تھا سارا کیا دھرا ان کی بیویوں کا تھا۔ جنہوں نے گھر کو چوں چوں کا مربہ بنا رکھا تھا۔ کوئی سلیقہ نہ تھا، گھر کی ایک ایک چیز بکھری پڑی تھی۔ مہینے کا سودا آتا تو وہ چار دن ڈرائنگ روم میں کھلا پڑا رہتا جس بچے کا دل چاہتا وہاں سے جو چیز نکال لے جاتا۔ اتوار بازار سے سبزی فروٹ آتا تو وہ الگ پیروں میں رلتا۔ بچے کھیلتے ہوئے آلو پیاز اچھالتے پھر دہائی دی جاتی کہ

کوئی چیز نہیں ملتی۔ چیزوں کو ان کی صحیح جگہ پر رکھو تو چیزیں ملتی ہیں۔ یہ بات جب حمیدہ بیگم کرتیں تو دونوں کانوں کو ہاتھ لگا لیتیں کہ اللہ ایسی ساس دشمن کو بھی نہ دے۔

"میں تو کہتی ہوں اگر رجو اس گھر میں نہ ہو تو تم لوگ تو کھانا پکانے سے بھی جاؤ۔ گنتی کا ایک ایک کام کرتی ہو دونوں، باقی سارے کام تو وہ سنبھالتی ہے۔"

رجو اس گھر کی اکلوتی ملازمہ تھی جو جنوں کی طرح کام کرتی تھی، کام بھی جنوں کی طرح کرتی اور کھاتی بھی جنوں کی طرح تھی۔

"اماں! کچھ تو خدا کا خوف کریں۔ وہ تو برتن اور صفائی کے علاوہ تیسرے کام کو ہاتھ نہیں لگاتی۔ اور آپ کہہ رہی ہیں سارا گھر وہ سنبھالتی ہے......"

ساس کا سفید جھوٹ اور کوئی تو برداشت کر سکتا تھا مائدہ کے لیے ہضم کرنا مشکل تھا وہ فوراً منہ پر بول پڑتی۔ "ہمیں تو سارا دن کچن سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ اور آپ کے گلے ختم نہیں ہوتے دوڑ بھاگ کے منہ ہی دھو لیں تو بڑی بات ہے۔"

جل کے ہی تو رہ گئی تھی وہ۔ سارا دن بیل کی طرح کام کام اور بس کام کرنے کے بعد بھی کوئی قدر نہ تھی۔

"کچن سے فرصت نہیں ملتی......" اماں نے اسی کے اسٹائل میں منہ بنایا۔ "کچن میں کیا آلو بوئے ہیں جو سارا دن اس کے سر پر کھڑے ہو کر پانی دینا پڑتا ہے۔ کبھی اپنے بچوں کو روٹی بنا کر دیتی ہو کوئی احسان نہیں کرتیں میرے اوپر۔ میرے کام تو سارے رجو کرتی ہے۔ کپڑے وہ دھوئے، استری وہ کرے۔ میرے سر میں تیل لگانا ہے تو رجو کو بلاؤں۔ میں تو کہتی ہوں رجو اس گھر میں نہ آئے تو یہاں تو کوئی مجھے پوچھنے والا ہی نہ ہو۔"

ان کی آنکھوں پر رجو کی محبت کی پٹی بندھی تھی۔ جو دونوں بہوئیں چاہ کر بھی نہ اتار سکتی تھیں۔

☆☆☆

"دیکھا بھابھی، ہم سے زیادہ تو یہاں رجو کی قدر ہے۔" جویریہ نے سنا تو گلہ کرنے بیٹھ گئی۔

"ہم سے زیادہ اس پر بھروسا کرتی ہیں ابھی کل الماری کی چابی نہیں مل رہی تھی تو بڑے فخر سے بتا رہی تھیں رجو نے ڈھونڈ کر دی ہے۔"

"بڑی مکار ہے۔ اماں کا بھروسا جیتنے کے لیے ڈرامہ کیا ہوگا۔ جو لوگ اس طرح بھروسا جیتتے ہیں نا، وہی ایک دن بھروسا توڑتے بھی ہیں۔ تم دیکھ لینا اماں کو دھوکا بھی وہی دے گی تب ان کی آنکھیں کھلیں گی ہمارے تمہارے بتانے پر نہیں مانیں گی۔"

رجو کی چالاکیاں وہ دونوں اچھے سے جانتی تھیں لیکن ساس اس کے خلاف کچھ سننے کو تیار نہ تھیں۔ مائدہ کو تو پکا یقین تھا گھر میں جو بھی چیز غائب ہوتی اس میں رجو کا ہی ہاتھ تھا لیکن حمیدہ بیگم کو بتا کر مار کھانی تھی۔ وہ تو ان دونوں سے زیادہ اس پر بھروسا کرتی تھیں۔

☆☆☆

بچوں کو گرمیوں کی چھٹیاں ہوئیں تو مائدہ اور جویریہ ایک ساتھ میکے چلی گئیں۔ حمیدہ بیگم بھی خوش تھیں کہ ایک ساتھ گھر کا خرچا کم ہو گیا اور چڑیا گھر کا منظر پیش کرتا گھر بھی پرسکون ہو گیا تھا۔ ناصر اور وسیم صبح کے آفس گئے رات کو لوٹتے۔ رجو ایک دفعہ صفائی کر کے جاتی تو پھر دو دن صفائی کی ضرورت نہ پڑتی۔

اس روز وہ صفائی کر کے برتن دھونے لگی تھی۔ جب حمیدہ بیگم نے اسے پہلے اپنے کپڑے استری کرنے کا کہا۔ کپڑے لے کر وہ باتھ روم میں نہانے چلی گئیں۔

رجو کو پتا تھا یہ نہانے گئی ہیں اب گھنٹے سے پہلے باہر نہیں آنے والی ہیں۔ اس نے کچن کے کیبن سے شاپر نکال کے سودے والا کیبن کھولا چھوٹے شاپر لے کر چینی، پتی، مرچیں، نمک ڈال کے بڑے شاپر میں ڈالنے لگ گئی۔ وہ اکثر میدان صاف دیکھ کر اسی طرح چیزیں غائب کرتی تھی۔ بڑا سا شاپر بنا کر بھی

وہ چیزیں لے کے رفو چکر ہو جاتا۔ گھر سے اکثر چیزیں غائب ہوتی دیکھ کر حمیدہ بیگم کا سارا شک خود دونوں بہوؤں پر تھا، رجو کے بارے میں انہیں کبھی شک نہ ہوا تھا۔ وہ ان کے بھروسے والی تھی۔

حمیدہ بیگم باتھ روم میں نہانے گئیں تو کپڑے اتارنے سے پہلے دیکھا وہاں صابن غائب تھا۔ وہ الٹے پیروں صابن لینے کچن میں چلی آئیں۔ رجو کا منہ سامنے کی طرف تھا وہ پوری محویت سے شاپر بنا رہی تھی، اسے گمان بھی نہ تھا کہ حمیدہ بیگم واپس بھی آ سکتی ہیں ادھر رجو تیزی سے نمک مرچوں کے شاپر بناتے دیکھ کر حمیدہ بیگم حیرت سے وہیں جم گئیں۔ یہ سب کیا تھا وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں یہ سارے کام رجو کرتی تھی۔ رجو نے ان کے بھروسے کی دھجیاں اڑادی تھیں۔

"ٹھہر جا آستین کی سانپ تیری تو......" حمیدہ بیگم غصے سے بل کھاتی اس کی طرف بڑھیں۔

"تو میری ناک کے نیچے چوری کرتی رہی اور میں کم عقل سارا الزام اپنی بہوؤں کو دیتی رہی۔ تجھے تو میں پولیس کے حوالے کر کے رہوں گی۔"

حمیدہ بیگم نے لپک کر اس کی چوٹی قابو میں کر لی۔

رجو اس اچانک حملے کے لیے بالکل بھی تیار نہ تھی۔ اس کا خیال تھا حمیدہ بیگم ابھی گھنٹے سے پہلے باہر نہیں آنے والی ہیں، میدان صاف ہے۔ وہ پوری تسلی سے کام کر رہی تھی، یہ تو سوچا ہی نہ تھا ایسا بھی ہو جائے گا۔ حمیدہ بیگم نے اسے قابو تو کر لیا تھا لیکن وہ جوان تھی۔ ایک بوڑھی عورت کے قابو میں آسانی سے نہیں آ سکتی تھی۔ اس نے پوری طاقت سے ایک ہی جھٹکے میں اپنے آپ کو ان کے ہاتھ سے چھڑا کر باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔ حمیدہ بیگم ایک ہی جھٹکے میں زمین پر جا گری تھیں۔ ساتھ والے کیبن سے سر ٹکرایا اور سر سے خون جاری ہو گیا۔ وہ تو شکر ہے کچھ دیر میں وسیم گھر چلا آیا فوراً اماں کو اٹھا کر ڈاکٹر کے پاس لے

☆☆☆

"اماں! آپ ٹھیک تو ہیں ناں۔ زیادہ چوٹ تو نہیں آئی۔" مائدہ اور جویریہ نے سنا تو دوڑی چلی آئیں۔

"چوٹ تو بڑی گہری آئی ہے میری بچیوں۔ اس کمبخت ماری نے میرے بھروسے کو توڑا ہے۔ سر کا زخم تو کچھ دنوں میں بھر جائے گا لیکن بھروسے کا زخم کبھی نہیں بھر پائے گا۔"

حمیدہ بیگم بہوؤں کے سامنے شرمندہ تھیں۔ رجو نے ان کا بھروسا توڑا تھا۔

"تم دونوں مجھے معاف کر دو۔ میں تم لوگوں کو غلط سمجھتی رہی حالانکہ غلط سراسر وہ رجو تھی۔"

ساس کو معافی مانگتے دیکھ کر مائدہ اور جویریہ کو انہیں [illegible] تھا وہ اماں [illegible] ڈری تھیں، ہاں رجو کی حقیقت آشکار ہونے پر وہ دونوں خوش تھیں۔

"چھوڑیں اماں دفع کریں اسے۔ اب آگے دیکھ بھال کر کام والی ماسی کا انتخاب کرنا ہے۔ ایسے ہی منہ اٹھا کر کسی کو کام پر نہیں رکھ لینا۔" مائدہ نے خوش دلی سے اپنے خیالات ساس کے ساتھ شیئر کیے۔

"کام والی ماسی کا خیال اب دل سے نکال دو۔ شکر کرو اماں کی جان بچ گئی۔ وہ پتا نہیں ان کے ساتھ کیا کر جاتی۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے وسیم ٹائم پر گھر چلا آیا۔" ناصر نے کام والی ماسی کا سنا تو جھٹ سے بیوی کی بات کاٹ دی۔

"اس بار تو بھروسا ٹوٹا ہے ایسا نہ ہو اگلی بار کوئی بڑا نقصان ہو جائے۔" ناصر کے ساتھ ساتھ وسیم بھی بول رہا تھا۔

مائدہ اور جویریہ ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئیں۔ وہ آنکھوں ہی آنکھوں اپنے شوہروں کی باتیں سن کر کے علاوہ اور کیا کر سکتی تھیں۔ زبان سے کچھ نہیں کہہ سکتی تھیں دونوں صورتوں میں نقصان تو ان کا ہی ہوا تھا۔

☆☆

digest library.com

Digest Novels Lovers Group ❤❤

فرح بخاری

غمالِ وفا

پچھلی قسط کا خلاصہ

رابیل نوریا کو ابارشن کروانے کے لیے ہاسپٹل لے کر جاتی ہے لیکن ڈاکٹرنی صاف انکار کر دیتی ہے کہ بچے کے ساتھ ساتھ ماں کی جان بھی جاسکتی ہے۔ اس لیے وہ ایسا کام نہیں کرسکتی۔

حسن بانو دوسرے دن نوریا کے لیے ناشتا لائیں تو نوریا کے سب کچھ بتا دیا کہ اس لڑکے کا نام جاذب تھا اور کہتا تھا شادی میں رکاوٹ اس کی غربت ہے تو نوریا نے بھابھی کا زیور چوری کر کے اسے دے دیا تھا۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا کہ سب نے مل کر بھابھی کے ساتھ بھی برا کیا اور افسر سے بھی اس نے جھوٹ بولا سزا تو ملنی ہی تھی۔

حسن بانو بچے کو ختم کرنے کا ارادہ چھوڑ دیتی ہیں کہ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔

اریبا ایک معصوم صحت مند بچی تھی پانچویں جماعت میں تھی لیکن ساتویں جماعت کی لگتی تھی۔ اس کی دوست

ناولٹ

محسنہ کی بکری نے دو بچے دیے تھے، اپنی دوست مریم اور شبینہ کے ساتھ وہ اس کے بکری کے بچے دیکھنے جاتی ہے۔ واپسی میں مریم اور شبینہ اپنے گھر چلی جاتی ہیں۔ وہ اکیلی واپس اپنے گھر آ رہی ہوتی ہے کہ کوئی اسے بے ہوش کر کے گاڑی میں ڈال دیتا ہے۔ اور ایک بنگلے میں لے جاتا ہے۔ پھر تھوڑی دیر بعد بچی کے ساتھ زیادتی کر کے وہ اسے بے ہوشی میں ہی سڑک پار کے علاقے میں ایک ویران جگہ پر پھینک دیتا ہے اور خود بنگلے میں واپس آ کر سو جاتا ہے۔

رعنین اور وردہ باتیں کر رہی ہوتی ہیں کہ باہر فائرنگ کی آواز آتی ہے اور کوئی چیخ کر کہتا ہے کہ باہر نکالو اس بے غیرت کو۔ وہ سردار یعقوب کے گھر والے ہوتے ہیں اور انفر خان کو مارنے آتے ہیں کہ انفر نے سردار یعقوب کی بیٹی ارمینا کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ نیم مدہوشی کے عالم میں ارمینا نے اسے پہچان لیا تھا کیونکہ وہ انفر خان کی شادی میں آئی تھی۔

سردار یعقوب کے بندے انفر خان کو ڈھونڈتے نیرزا کے گھر بھی پہنچ جاتے ہیں وہاں بھی سب کو علم ہو جاتا ہے۔

تاج بسمینہ کی پھوپھو کا بیٹا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لیکن بسمینہ کے ساتھ یہ حادثہ ہونے کے بعد تاج کی ماں تاج کی شادی بسمینہ کے ساتھ کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ یہ سب تاج میران کو بتاتے ہوتے بہت افسردہ تھا۔ وہ میران سے کہتا ہے کہ اسے بسمینہ پر یقین ہے لیکن اس کی ماں بسمینہ کو قصوروار سمجھتی ہے۔

ابراہیم خان میران کی حویلی میں رات کے اندھیرے میں پہنچتے ہیں اور میران سے کہتے ہیں کہ سردار یعقوب نے انفر خان کے بدلے میں رعنین کو مانگا ہے۔ اور سردار یعقوب اس سے نکاح کرے گا۔

بارہویں قسط

''اوہ۔۔۔ تو؟'' میران کا تجسس انتہا کو پہنچ گیا۔ وہ تو انفر کے متعلق کسی بری خبر کی توقع کر رہا تھا، اور یہ چاچا کیا کہہ رہے تھے۔ اب رعنین کو کیا ہوا تھا۔

''کیا...... یعنی...... کیا کہنا پڑا آپ کو...... ہوا کیا ہے؟'' میران کی دھڑکنوں کی طرح اس کے جملے بھی بے ربط ہو گئے۔

''میران۔ میں نے انہیں یہ کہہ دیا کہ میری بیٹی پہلے ہی کسی کے نکاح میں ہے۔ اور یہ مجھے اس لیے کہنا پڑا تا کہ وہ نکاح شدہ لڑکی کو ساتھ لے جانے کی جرات نہ کر سکیں......'' ابراہیم خان نے خود ہی اپنے جھوٹ کی وضاحت کی''لیکن انہوں نے آگے سے پوچھنا شروع کر دیا کہ کب ہوا۔ اور کس سے۔ وہ چلا رہے تھے میرے سر پر۔ اور میں نے تو بنا سوچے یونہی کہہ دیا تھا۔ مجھے اندازہ ہی نہیں تھا کہ اس جھوٹ کے جواب میں اگلے سوالوں کی بھرمار کر دیں گے۔ انہوں نے میری بات کو جھٹلایا اور کہا کہ ہم نہیں مانتے۔ تت۔ تو میں نے کہہ دیا کہ میرا بھتیجا ہے میران۔ ابھی دبئی سے آیا ہے۔ اسی کے ساتھ ہوا ہے۔''

ابراہیم چاچا نے چور نگاہوں سے میران کی طرف دیکھا اور وہ پے در پے کے واروں پر بے یقین، گم صم سا انہیں دیکھ رہا تھا۔

''آ...... آ...... پ نے کہا کہ۔ میرا نکاح۔ رعنین سے ہو چکا ہے؟ اور اس بات کا آپ کو فائدہ کیا ہو گا؟''

''فائدہ ہوا نا۔ جیسے ہی تمہارا نام لیا۔ وہ بھی شل ہو گئے۔ مجھ سے بات کرنے یعقوب کا بھائی محبوب خان اور بیٹا ولی خان آئے تھے۔ انہیں بھی حیرت کا ایسا جھٹکا لگا کہ یعقوب سے بات کرنے

digest library.com

واپس اپنی حویلی پلٹ گئے۔۔لیکن یعقوب کو شاید یقین نہیں آیا۔اس نے اسی وقت کال ملا کر کہا کہ کل صبح لڑکے سے ملیں گے۔نکاح نامہ دیکھیں گے۔اور جھوٹ سچ کا فیصلہ ہوگا۔"

"ہوں......" میران نے ایک گہرا سانس باہر کو نکالتے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی۔ابراہیم چاچا تو آج اس کی جان نکالنے کے درپے لگ رہے تھے۔پہلے اس کے یہ سوچ کر ہوش اُڑے کہ شاید وہ لوگ رعنین کو اٹھا لے گئے ہیں۔اب یہ دوسرا معمہ۔

" اور اب جب وہ کل صبح واپس آئیں گے......تو؟"

"یہی بات ہے بیٹا۔اسی لیے تو مجھے رات کے اس پہر یہاں آنا پڑ گیا۔میں یہ معافی چاہتا ہوں میران۔ رابیل تمہارا رشتہ لائی تھی لیکن اقصر راضی نہیں ہوا۔ تو۔ میران۔مجھے تو تب بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔اور میں نے تو معاف بھی دل سے کیا تھا۔بس اولاد کے سامنے انسان مجبور ہو جاتا ہے۔اقصر نے صاف کورا جواب دے دیا تھا۔میران ۔اب تم ہی ہمیں اس مشکل سے نکال سکتے ہو بیٹا۔ دیکھو۔ میں رعنین کی شادی تم سے کرنے کو تیار ہوں ۔ لیکن ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔صبح ہمارے پاس جب کوئی ثبوت نہیں ملے گا تمہارے نکاح کا۔تو وہ رعنین کو اٹھا لے جائیں گے۔" وہ بولتے چلے گئے۔اور میران کے پاس جواباً سوالیہ دو آنکھیں تھیں۔وہ بس انہیں دیکھ رہا تھا کہ۔اس سے آگے کیا؟

"میران......" اگر تم راضی ہو بیٹا۔تو ہمیں آج ابھی ......" تمہارا اور رعنین کا نکاح پڑھوانا ہوگا۔اور!"

"اور......!"

"اور تم دونوں کو یہاں سے نکلوانا بھی پڑے گا......" وہ تو......سب سوچ کر آئے تھے۔اسی لیے روانی سے جاری رہے" کیونکہ اگر مولوی صاحب نکاح پڑھوا دیں تو شرعاً تم دونوں کا رشتہ بن جائے گا لیکن صبح ان کو دکھانے کے لیے نکاح نامہ ہمارے پاس پھر بھی نہیں ہے۔بس اسی لیے میں رعنین اور تمہیں کہیں اور بھجوا دوں گا۔"

"ایک منٹ......" میران نے ہاتھ اٹھا دیا۔" تو مطلب میں بھی کل سے مفروری کی زندگی گزاروں۔ اور میرا گھر۔یہ حویلی۔میرا کالج کا خواب......" اس کا ذہن بھی اب رعنین کے حصار سے نکل کر کچھ کچھ کام کرنا شروع ہو چکا تھا۔

"نہیں بیٹا۔۔پر میری مجبوری یہ ہے کہ صبح ان کو دکھانے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں ہے۔اگر تم دونوں شہر نکل جاؤ۔وہاں باقاعدہ شادی کر لو۔کل کو واپس بھی آجاؤ تو کم از کم وہ رعنین والا بھاؤ دینا تو بند کر دیں گے۔"

"لیکن آپ کہہ رہے تھے کہ نکاح مولانا صاحب پڑھوائیں گے۔تو آپ ثبوت کے طور پر ان کو کیا دکھائیں گے؟"

"رعنین اگر تمہارے ساتھ یہاں سے چلی گئی تو مجھے کچھ دکھانے کی فکر ہی کیا کرنی۔بس میں خود مطمئن ہو جاؤں گا کہ اپنی بیٹی ایک اچھی جگہ رخصت کر دی۔"

"لیکن یوں تو وہ پھر سے اقصر کی جان کے درپے ہو جائیں گے۔"

"کیا کروں بیٹا۔مجھے بتاؤ۔کیا کروں۔کیا اپنی معصوم بچی کو بیٹے کی غلطی کی بھینٹ چڑھا دوں۔ اقصر نے تو اپنی جان ویسے بھی چھپ کر بچالی ہے۔"

"پھر تو یعنی زندگی بھر وہ بھی روپوش رہے گا۔ آپ اس کی واپسی کی راہ بھی بند کر رہے ہیں۔"

"نہیں۔مجھے لگتا ہے۔ابھی ان کا غصہ زیادہ ہے۔کچھ وقت گزرنے پر حالات معمول پر آنے لگیں گے۔چند سال بھی عافیت سے گزر گئے تو میں اسی بچی سے اقصر کا نکاح پڑھوا کر اسے عزت سے اپنی بہو بنا لاؤں گا۔لیکن یہ بات ابھی ان کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔"

"لیکن۔میں نے سنا ہے۔آپ رعنین کا رشتہ شیر عالم سے طے کرنے والے تھے۔" میران کا لہجہ

کچھ چبھتا ہوا سا تھا۔

یہ بات سلطانہ پھوپھو نے رابعل کو بتائی تھی۔

ابراہیم سن کر بری طرح شرمندہ ہو گئے۔

"یہ صلاح بھی الفر کی تھی۔ اس کا دوست ہے شیر عالم تو......"

"تو دوست اب مشکل میں کام کیوں نہیں آرہا؟"

میران چاہ کر بھی اپنا لب و لہجہ درست نہیں کر پا رہا تھا۔ اور وجہ یہ بھی کہ سامنے بیٹھے ابراہیم چاچا سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ میران کے ذہن میں اس وقت کتنے بے شمار سوال اور کتنی گرہیں جن کا اس ایک رات اور اتنے مختصر وقت میں کھلنا آسان نہیں تھا۔

"بیٹا۔ میں نے کہا نا کہ یہ بات یعقوب کی فیملی اور ہماری فیملی کے علاوہ کسی کو معلوم ہی نہیں ہے۔ میں شیر عالم کو نہیں بتا سکتا جو کچھ الفر نے کیا۔"

"جی۔ اور مجھ پر بھروسے کی وجہ تو بڑی سیدھی ہے۔ ہمیشہ میں ہی سب کو ایک آسان شکار کے طور پر سامنے کھڑا مل جاتا ہوں۔ وردہ کے ساتھ بعینہ یہی حادثہ ہوا تو الفر کو بھی میں ملا تھا اپنی جان بچانے کے لیے۔"

"لیکن بیٹا......"

"کیا آپ کو ابھی بھی کوئی شک باقی ہے کہ وردہ کا مجرم الفر نہیں کوئی اور ہوگا؟"

"میں یہ نہیں کہہ رہا۔"

"کل تک مجھے اس بات کا افسوس تھا چچا جان...... کہ نوریا کو حاصل کرنے کے لیے الفر نے میرا استعمال کیا۔ جھوٹی صلح کا ڈھونگ رچا کر اپنا مطلب حاصل کیا اور مجھے ٹشو پیپر کی طرح پھینک دیا۔ لیکن اصل افسوس تو آج شروع ہوا ہے۔ الفر یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں وردہ کا مجرم نہیں تھا۔ محض دنیا کو دکھانے کے لیے مجھے معاف نہ کرنے کا ڈرامہ کرتا رہا۔ اور حتیٰ کہ جب موقع آیا کہ وہ جرم جسے چھپانے میں نادانستہ طور پر میں اس کے کام آگیا تھا۔ وہ دل میں ذرا سا انصاف پاتے اس کا ازالہ کرنے کی کوشش کرتا۔ اور جب اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے معاف کر ہی چکا تھا تو اس صلح کو برقرار رکھتا۔ اپنی بہن کا ہاتھ مجھے دیتے بھی دل میں منصف ہوتا کہ میران اس کی بہن کو ڈیزرو کرتا ہے۔ کیونکہ نہ صرف وہ اس کی جگہ کتنے سالوں سے اس کے کیے کی سزا پاتا رہا ہے بلکہ دراصل شریف اور بے قصور بھی ہے۔ لیکن اس نے یہاں بھی اپنی خود غرضی ترک نہیں کی۔"

"بیٹا۔ میں سب مانتا ہوں۔ اس کا کوئی قصور قابل معافی نہیں۔ اس کی طرف سے میں معافی مانگتا ہوں۔"

"کس کس سے معافی مانگیں گے چچا جان۔ باہر افضل خان بیٹھا ہے۔ اس سے مانگ سکتے ہیں معافی؟"

کیا مطلب۔ اس سے کس بات۔

"بسمینہ بے قصور ہے چچا جان۔ الفر نے اس کے ساتھ زیادتی کی۔ اس بے چاری کو حمل ہو گیا تو اس کی شادی ایک بوڑھے سے کر کے اسے جلدی سے رخصت کر دیا۔ اور اس بے چارے باہر بیٹھے اس کے مکروہ چہرے سے انجان، بندے پر بھی یہ کہہ کر احسان لگایا کہ اس نے دنیا سے اس کی بچی کا برا کردار چھپا لیا۔"

"تو بسمینہ بھی......" ابراہیم چچا جیسے اب سوچ میں مبتلا ہوئے۔ اگرچہ بسمینہ کی شادی کے موقع پر انہیں اس حقیقت سے بے خبر رکھا گیا تھا کہ بچی امید سے ہے لیکن جب اس کے سسرالیوں نے اسے واپس میکے بھیج دیا اور اب باقاعدہ طلاق بھی ہو گئی تو اس کے شوہر نے طلاق کی وجہ صاف صاف سب پر ظاہر کر دی تھی تاکہ کل کو پیدا ہونے بچے کو اس کی اولاد نہ سمجھا جائے۔

"میران۔ میں کہاں جاؤں۔ کیا کروں۔ کیا رشنین کو اس بچی کے باپ کے حوالے کر دوں۔ لیکن اب تو اس جھوٹ کے بعد شاید وہ بھی شک میں پڑ جائے کہ پتا نہیں لڑکی منکوحہ ہے یا کنواری۔"

"آپ لوگ ہمیشہ یہی تو کرتے ہیں۔ برسوں پہلے اس نے ورردہ میرے گلے ڈال دی۔ آج آپ بتا مجھ سے پوچھے رعنین میرے سر تھوپ رہے ہیں۔ یہی ہے میری اوقات۔ میری حیثیت۔" وہ غصے سے اٹھ کر دور چلا گیا تھا۔

رعنین سے شادی کا بھاؤ جس انداز میں مسلط کیا گیا۔ اسے ایک بار بھی نہیں لگا کہ یہ اس کی اور رعنین کی شادی کی بات ہو رہی ہے۔ اور وہ خوش ہو بھی کیسے سکتا تھا۔ یہ کیا طریقہ تھا بھلا۔ اپنا گھر چھوڑ کر راتوں رات یہاں سے بھاگنے کے مشورے دیے جا رہے تھے۔ نو سال پہلے بھی تو وہ بے قصور ہوتے ہوئے اسی طرح منہ چھپا کر بھاگا تھا۔ آج ایک بار پھر اس سے اس کا شہر اس کا گھر چھیننے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ وہ یہ سوچ کر کیسے خوش ہوتا کہ اسے رعنین مل رہی تھی۔ اور مل کہاں رہی تھی۔ یہ تو ایک بار پھر انصر کو بچانے کی کوشش تھی۔ وہ انصر جو اس کا بھی اصل مجرم تھا۔ اور اس پر بھی ابھی پچھلی شام انکشاف ہوا تھا۔ آج اپنے دشمن سے بجائے بدلہ لینے کے اسے اس کی جان بچانے کے لیے کہا جا رہا تھا۔ اس کا بس چلتا تو یعقوب خان کی کلاشنکوف وہ خود پوری انصر پر خالی کر دیتا۔

"میں مانتا ہوں۔ مجھ سے بھی وہی غلطی ہوگئی۔ لیکن جو ہوا میران بہت گھبراہٹ اور پریشانی میں ہوا۔ میں تم سے انصر کے کیے کی معافی بھی اب نہیں مانگوں گا۔ اس کے قصور اتنے زیادہ اور اتنے گھناؤنے ہیں کہ شاید تم عمر بھر اسے معاف نہ کر سکو۔ لیکن تم مجھے تو معاف کر سکتے ہو نا۔ میں بس اولاد کی محبت میں اندھا ہو کر سوچ رہا تھا۔ تمہیں اتنی رات کو بے آرام کیا۔ اس کے لیے بھی معذرت۔ تم آرام کرو۔ ہم چلتے ہیں۔"

"لیکن چچا جان۔ اگر صبح وہ رعنین کو زبردستی لے گئے تو......" میران کی نرم طبیعت ابراہیم چچا کے معافی مانگنے پر پسیج گئی تو وہ مجبور ہو کر پوچھ بیٹھا۔

"نہیں ان شاء اللہ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ میں فردوس کے بھائیوں کو فون کرتا ہوں۔ رعنین کا ماموں نجیب اللہ آج کل بالاکوٹ میں ہے۔ یہاں سے زیادہ دور بھی نہیں۔ اسے کہتا ہوں ابھی آ کر رعنین کو لے جائے۔ فوری طور پر رعنین کسی محفوظ جگہ چلی گئی تو شاید میرا ذہن بھی کچھ بہتر کام کرنے لگے گا۔" وہ اپنے سر پر ٹوپی سنبھالتے دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ اور وہ خالی ذہن لیے انہیں جاتے دیکھ رہا تھا۔

digest library.com

"[illegible] میری [illegible] ہے" میران کی آواز ایکدم واضح اور بلند تھی۔

ابراہیم خان کے قدم رُکے، اور پھر انہوں نے پلٹ کر میران کو دیکھا۔ انداز سوالیہ اور پُرتعجب تھا۔ انہیں یقین ہی نہیں آیا تھا کہ میران نے حامی بھرنے کا اشارہ دیا ہے۔ اب سے کچھ دیر قبل اس نے جتنے بھی اعتراض اُٹھائے سب جائز بھی تھے اور اتنے تکلیف دہ تھے کہ آخر میں خود ابراہیم خان کو لگنے لگا تھا کہ میران کو واقعی رعنین سے شادی نہیں کرنی چاہیے۔ اُن سب کی طرف سے میران کو واقعی بہت بار تکلیف پہنچائی گئی تھی۔ ان کے جرم قابل معافی نہ تھے۔ وہ محض سوالیہ نظروں سے میران کو دیکھ رہے تھے۔ میران نے ہاتھ سے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا، جیسے بات طویل اور آرام سے بتانے کی ہو۔ ابراہیم خان واپس پلٹ آئے اور ٹوپی سر سے اتار کر قریب رکھ لی۔ انہیں تو اب میران کو سننا تھا۔ نجانے کس شرط کی بات کر رہا تھا۔

"مجھے انصر کا اقبالِ جرم چاہیے۔ اس نے زیادہ لمبی تمہید باندھی ہی نہیں۔

ابراہیم خان نے چونک کر سر اُٹھایا۔ وہ تو بیٹے کو بچانے کی خاطر یہ سب کر رہے تھے۔ اور میران تو کچھ پولیس، عدالت۔

"لیکن اگر ہم نے انصر کو پکڑوا دیا تو قانوناً بھی اس کا بچنا ناممکن ہے۔ بات تو ایک ہی ہے۔" وہ چپ نہ رہ پائے۔

"آپ سمجھے نہیں چچا جان......" میران نے

ایک گہرا سانس لیا۔ "مجھے الفر کی طرف سے ایک وائس ریکارڈنگ چاہیے کہ وردہ، یسمینہ اور اس بچی اریبا کا مجرم وہی ہے۔ چونکہ اس کے باقی گناہ ہمیں معلوم نہیں تو وہ اللہ بہتر جانتا ہے یا الفر خود۔ جن زیادتیوں کا پردہ قدرت فاش کرنے پہ تلی ہے، میں صرف انہی کی بات کروں گا۔ مجھے یہ ریکارڈنگ صرف اپنے لیے چاہیے۔ میں نہیں چاہتا مجھ سے متعلقہ لوگ میرے بارے میں مزید کسی شک شبہے میں رہیں۔ مجھے کلیرٹی چاہیے۔ بس اتنی سی بات ہے۔"

"آں، صحیح۔" ابراہیم خان بات سمجھ میں آنے پر سر ہلانے لگے۔ پھر کچھ دیر تو خاموش رہے جیسے کسی سوچ بچار میں ہوں۔ اور میران ان کی خاموشی کا مطلب بھی اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ وہ خود تو یقیناً الفر کی موجودہ رہائش کے متعلق جانتے تھے لیکن میران کو معلوم نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔

"چاچا جان۔ آپ آرام سے سوچ بچار کرلیں۔ ابھی تین بجے ہیں۔ صبح کی اذان ہونے میں ابھی کچھ وقت باقی ہے۔ آپ گھر جائیں۔ مشورہ کرلیں۔ پھر جیسا آپ کو مناسب لگے۔" میران کو تو ریکارڈنگ سے مطلب تھا۔ وہ چاہے یہاں بیٹھ کر بنائیں یا گھر جا کر۔ کیا فرق پڑتا تھا۔

ابراہیم خان بھی نئی تجویز سن کر جلدی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ گھر جا کر واقعی ان کے لیے بہت آسان تھا۔

"میں ان شاء اللہ اذان سے پہلے تمہیں بتاتا ہوں۔" وہ فوراً ہی باہر نکل گئے۔

☆☆☆

صبح کی نماز پڑھ کر وہ دوبارہ بستر میں گھس جاتی تھی۔ حالانکہ سلطانہ پھوپھو کی بڑبڑاہٹ نیند میں جاتے وقت تک اس کے پیچھے رہتی تھی۔

"فجر کی نماز کے بعد سو جانا رزق میں تنگی کا باعث ہوتا ہے۔ اس وقت تو چرند پرند بھی رزق کی دانے دنکے کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں۔ ہاں بھئی، پر ان کو کیا پروا......! کھانا کیسے ملتا ہے۔ دانے دانے کے لیے کیسے ترسنا پڑتا ہے۔ دو رکعتیں ادا کیں اور لو جی۔ پروردگار کی ذات پہ احسان کر کے لمبی تان رہے ہیں ہم تو......"

وہ بس بولتی چلی جاتیں۔ پر رعنین کو اب یہ تقریر بھی لوری لگنے لگی تھی۔ وہ نماز پڑھ کر کان لپیٹے بستر میں گھس آئی لیکن پھوپھو سلطانہ کی آواز بلکہ لوری آج مِس کی۔ اس نے سر نکال کر جھانکا وہ تسبیح پڑھ کر بالکل گم صم بیٹھی تھیں۔ اسے لگا شاید وردہ کی وجہ سے پریشان ہیں۔

اور اس معاملے میں کہاں اس کے پاس کوئی تسلی تھی۔ وہ کمبل میں منہ دیے بھی سو نہ سکی۔ آج لوری نہ تھی تو نیند بھی بھلا کہاں آئی تھی۔

"یہ سو کیوں گئی۔ اس کو لے آؤ سلطانہ۔" کمرے میں اس کی امی کی آواز سنائی دی۔ لہجہ سرگوشی بھرا تھا۔

"وہ لوگ آ گئے؟" سلطانہ پھوپھو کی آواز ان سے بھی کم تھی۔

رعنین کی بھنویں جڑ گئیں۔ یہ کیا باتیں ہو رہی تھیں۔

"وقت بہت کم ہے۔ ابھی خان اونچی آواز لگائیں گے کہ پردہ کرو۔ اس کو کیا تب اٹھائیں گے۔" وہ اب بستر کے نزدیک آ رہی تھیں۔ رعنین نے پلکیں بھینچیں کیونکہ امی نے کمبل کھینچا تھا۔

"اُٹھو رعنین۔ اور پھوپھو کی بات سنو۔ میں ذرا چائے بنا لوں۔"

"سلطانہ۔ اس بے وقوف کو بتاؤ کہنا۔ ٹیم (ٹائم) نہیں ہے۔" وہ کمرے سے نکل گئیں۔ اور سلطانہ جائے نماز سے اٹھ کر اس کے پاس آ بیٹھیں۔

"اٹھ کر بیٹھو شاباش۔ اور دھیان سے سنو۔" انہوں نے رعنین کا بازو تھاما اور اس مرتبہ وہ بھی پریشان ہو کر اٹھ بیٹھی۔

"کیا ہوا ہے پھوپھو۔"

"بس سمجھو۔ اچھا ہی ہو رہا ہے۔ لیکن تم کچھ بھی آگے سے بولو گی نہیں۔ جو کہوں چپ چاپ ماننا ہوگا۔ تمہارے بھلے کی بات ہے۔"

"کیا بات ہے پھوپھو۔ اس کا دل تو سننے سے پہلے ہی دھک دھک کرنے لگا۔"

"وہ جو بچی تھی افشین کی بھتیجی۔ ارمینا۔ جس قصے کی وجہ سے انصر بھاگا......" سلطانہ کو الفاظ ہی نہیں مل رہے تھے۔ رعنین نے زور سے تائید میں سر ہلا کر ان کی مشکل آسان کی۔

"اس کا باپ یعقوب۔ بدلے میں لڑکی مانگ رہا تھا۔ اپنے لیے۔ نکاح میں رکھنا چاہتا تھا۔ کہتا ہے یا انصر کا سر لیں گے یا اس کی بہن۔"

انہوں نے پہلی بات سے بتانا شروع کیا اور رعنین آنکھیں پھیلائے انہیں دیکھ رہی تھی۔ یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ بات اس کے متعلق ہوگی۔ وہ سمجھی انصر کے بارے میں کوئی بات ہے۔

"پھر......؟" وہ انہیں ہونق پن سے دیکھ رہی تھی۔

"تمہارے باپ نے تمہیں بچانے کے لیے جھوٹ بول دیا کہ تمہارا نکاح پہلے ہی ہو چکا ہے۔"

"ہا؟" اس کا منہ کھلا۔ "تو؟"

"تت۔ تو یہ کہ اب اس جھوٹ کو سچ کرنا ہے۔ گھر پر مولوی صاحب آرہے ہیں۔ اگر صبح تک شادی ظاہر نہ کی تو تمہیں اٹھا لیں جائیں گے۔"

"ہائے...... کیا مطلب؟" ایسے تو کوئی بم نہیں پھوڑتا جیسے انکشاف پھوپھو کیے جا رہی تھیں۔

"تم جلدی سے کچھ اچھا سا پہن لو۔ کنگھی کرو۔ بلکہ بس چادر اوڑھ لو۔"

"امی......!" وردہ دھیمے لہجے میں بولتی اندر داخل ہوئی تو دونوں نے چونک کر اسے دیکھا

"ایک سوٹ کیس تو کم پڑ رہا ہے۔ دوسرا اپنے والا نکال رہی ہوں اسٹور روم سے۔"

"اتنے سامان کو سنبھالیں گے کیسے۔ ایک سوٹ کیس تو اُس کا بھی ہوگا نا۔ مرد کا کیا ساز و سامان نہیں ہوتا۔ وہ بھی تو تیاری کر رہا ہوگا۔"

"کک۔ کون......" وہ اب پھٹی آنکھوں سے وردہ کو دیکھ رہی تھی۔ لیکن اس کی ہلکی مسکراہٹ پر تو غش سا آنے لگا۔ اتنی بڑی خبر سن کر کم از کم وردہ کی طرف سے ہنسی۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے پھوپھو۔ سوٹ کیس کیوں۔ اور مولوی صاحب کس کو لیے آ رہا ہے؟"

اس نے حواس باختہ ہو کر پھوپھو کا کندھا ہی بھینچ ڈالا۔

"وخ اللہ......" سلطانہ نے کندھا چھڑوا کر ماتھے پہ ہتھیلی پٹخی۔ "مولوی کا کام دلہا لانا نہیں ہوتا؟" وہ بس نکاح پڑھوائے گا۔"

"دلہا ہمارے پاس موجود ہے۔" وردہ کی پھر وہی شرارتی ہنسی۔

سلطانہ نے گھور کر وردہ کی جانب سر اٹھایا تو اس نے چہرا فوراً سپاٹ کیا۔ لیکن بعد میں رعنین کو چپکے سے آنکھ ماری۔ اور ابرو پراسرار گلی کی جانب اچکایا۔

"امی! آپ۔ ذرا اس کا سوٹ کیس جو میں نے تیار کیا ہے۔ اس کو چیک کر آئیں پلیز۔" اس نے ماں کو زبردستی شانوں سے تھام کر کھڑا کیا۔ "پہلے آپ دیکھ آئیں۔ پھر میں رعنین کو بھی لاتی ہوں۔"

وہ خود ہی انہیں دروازے تک چھوڑ آئی۔ لیکن رعنین نے بھی اسی دوران بیڈ سے جمپ لگائی اور وردہ تک پہنچی۔ وہ امی کو بھیج کر اب پلٹ کر اسے مسکراتی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"کوئی بڑی ہی تگڑی منت مانی تھی۔ ہاں۔ بلکہ۔ کیا پتا۔ اس نے مانی ہو۔" وہ پھر ابرو اس جانب اٹھا رہی تھی۔

"کیوں میرا ہارٹ اٹیک کروانا چاہتی ہو۔ کیا ہو رہا ہے یہ سب۔ بتاؤ نا پلیز!"

"تمہارا نکاح......"

"جلدی سے پردہ کرو......" فردوس ایک سفید کڑھائی والی چادر اٹھائے اندر آئیں۔ اور آتے ہی

اسے رعنین پر ڈال دیا۔ وہ خود بھی بڑی سی شال اوڑھے ہوئے تھیں۔ ”وردہ تم بھی اسی چادر کے اندر آجاؤ مڑا۔ باہر نہیں جاسکتیں۔ تمہارے ماما برآمدے تک آچکے ہیں۔ انہوں نے سرگوشی کر کے دونوں کو پلنگ کی جانب دھکا دیا۔ اور خود بھی پلنگ پر چڑھ بیٹھیں۔ وردہ اور رعنین ایک ہی سفید چادر کے اندر بیٹھی ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں۔ بولنے کی گنجائش نہ تھی کیونکہ کمرے میں مردوں کی آوازیں آ گئی تھیں۔

”بسم اللہ کریں مولوی صاحب۔“

ابراہیم ساتھ ساتھ وقت بھی دیکھ رہے تھے۔ ابھی ابھی اذان ہوئی تھی وہ سب مسجد سے نماز پڑھ کر یہیں آگئے تھے۔ دن کی روشنی ابھی نہیں نکلی تھی۔ اور انہیں اُن دونوں کو روانہ بھی کرنا تھا۔ مولوی صاحب نے گلا کھنکار کر سامنے رکھے پرچے میں نام پڑھے۔

رعنین خان ولد ابراہیم خان کیا تمہیں میران خان ولد تاجور خان سے حق مہر پانچ لاکھ سکہ رائج الوقت نکاح قبول ہے؟“ مولوی صاحب کی آواز پر سانس روکے وہ چادر کے اندر سامنے بیٹھی وردہ کو ایک ٹک دیکھ رہی تھی۔ میران خان کے نام پر اس کے لبوں پہ آتی مسکراہٹ وردہ کے لیے اس زندگی کی سب سے خوب صورت گھڑی تھی۔ لیکن مسکراتی ہوئی رعنین ابھی چپ تھی۔ اس نے گھور کر ٹہوکا دیا تو وہ شرارت سے ہنسی تھی۔ مولوی صاحب نے دوبارہ ہی الفاظ دوہرائے تو وردہ نے اسے چٹکی کاٹی جس پر سی کی آواز اور قبول ہے ایک ساتھ منہ سے نکلے۔ کچھ دیر بعد میران کی جانب سے قبول ہے کی آواز سنائی دی اور پہلی مرتبہ رعنین کو خیال آیا کہ میران بھی کمرے میں موجود ہے۔

”مبارک ہو، خان۔“

مولوی صاحب نے شاید اس کے بابا کو مبارک دی تھی۔ کمرے میں فردوس اور سلطانہ کی آواز اُبھری تو پتا چلا کہ مرد چلے گئے۔ اس نے چادر ہٹا کر ماں کی طرف دیکھا تو وہ پہلے مسکرائیں لیکن پھر پلکیں اچانک ایسے بھیگیں کہ وہ کمرے سے باہر نکل گئیں۔

”کون کون آیا تھا اماں۔“ وردہ اپنی ماں سے سوال کر رہی تھی۔

”زیادہ کسی کو بتانا ہی نہیں تھا۔ تمہارے ابراہیم ماما، اور مولوی صاحب کے ساتھ گواہ کے طور پر افضل اور عالمگیر تھے۔ ۔اور اب تم دونوں جلدی سے بھاگو۔ فٹافٹ بیگ تیار کرو۔ کار ریڈی کھڑی ہے۔ افضل لے جائے گا۔“

”کہاں؟“ رعنین ابھی پچھلے شاک سے بھی کہاں نکلی تھی۔

”اے مڑا۔ یہ تو بتایا بھی نہیں......“ انہوں نے ماتھے پہ ہاتھ مارا ”تم دونوں شہر جا رہے ہو صبح۔ اس یعقوب خان کو تھوڑی بتا سکتے ہیں کہ ابھی نکاح ہوا ہے۔ وہ تو کاغذ مانگتا ہے۔ کاغذ تو ہمارے پاس ہے نہیں نا۔ تو وہ زبردستی اٹھا نہ لے جائیں۔ اس لیے تم دونوں ادھر سے نکل رہے ہو۔ بعد کا بعد میں سوچیں گے۔“ وہ جلدی سے بتاتے ہوئے باہر نکل گئیں ۔اور رعنین نے وردہ کی طرف دیکھا۔ کمرا خالی ہوتے ہی جس نے خوشی بھری ایک چیخ مارتے زور سے آکر اسے گلے لگالیا۔

”خواب تو نہیں ہے؟“ رعنین کا چہرا اندرونی خوشی سے دمک رہا تھا تو آنکھوں کا تحیر بھی بہت واضح تھا۔

”کوئی خواب نہیں ہے۔ اور اب نکلو یہاں سے۔ کپڑے وغیرہ دیکھ لو جلدی سے۔“

وہ اسے کھینچتی ہوئی باہر لے آئی۔ اس کے کمرے میں پلنگ پر سوٹ کیس کھلا پڑا تھا۔ رعنین نے بھی خود کو حاضر دماغ کرتے اگلے مرحلے پر سوچنا شروع کیا۔ سوٹ کیس سے کچھ غیر ضروری کپڑے نکال کر کچھ سوٹ الماری سے نکالے۔ ڈریسنگ ٹیبل سے کچھ ضروری چیزیں سمیٹیں۔ الماری کے نچلے خانے سے کچھ جوتے چپلیں شاپر میں لپیٹ کر سائیڈ میں ٹھونسیں۔ ایک پرس دو باؤچ۔ موبائل۔ وہ تیز نظروں سے پورے کمرے کو دیکھ رہی تھی۔

"کمی بیشی تمہارا خان پوری کر دے گا۔ ماما شور مچا رہے ہیں۔ دن کی روشنی نکل رہی ہے۔" وردہ نے سوٹ کیس ٹنگ ٹنگ کر کے بند کیا اور کھینچ کر باہر نکل گئی۔

رعنین نے "تمہارا خان" پر در آتی ہنسی ہونٹوں میں بھینچی اور سفید چادر اوڑھ کر کمرے سے ہی منہ چھپالیا۔ سامنے یقیناً اس کے بابا کھڑے ہوں گے۔ وہ اپنی ہنسی سے اتنا ڈر رہی تھی کہ فیس کرنا مشکل تھا۔ تب ہی چہرا ہی چھپالیا۔ باہر نکلی تو سلطانہ پھوپھو اور امی بغل گیر ہوئیں۔ اتنی صبح گھر میں اور کوئی بھی نہیں تھا۔ بابا کے غصے کے ڈر سے وہ کھل کر ماں سے مل بھی نہیں پائی۔ کار گیٹ کے عین باہر کھڑی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر افضل چاچا اور میران [illegible] بیٹھے تھے۔ عالمگیر نے بیگ پیچھے ڈکی میں ایڈجسٹ کیا۔ اور اسے بابا نے پچھلی سیٹ پر بٹھا دیا۔ اور ساتھ ہی کار کو ہاتھ سے بجا کر روانہ ہونے کا اشارہ دیا۔ انہیں یعقوب خان کے آدمیوں کا کچھ بھروسا نہیں تھا۔ وہ چاہتے تھے یہ دونوں جلد از جلد یہاں سے بہت دور نکل جائیں۔ اور رعنین کو تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ لوگ کہاں جا رہے ہیں۔

کار ابھرتے دن کی نیم روشنی میں، مین روڈ پر چڑھی اور رخ مانسہرہ کی جانب ہو گیا۔ وہ اب چادر کے اندر سے میران کو دیکھ رہی تھی۔ لیکن وہ سامنے دیکھتے ایکدم چپ چاپ تھا۔ سائیڈ پوز بھی واضح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کسی کسی وقت افضل سے کوئی بات کرتا تو چہرا اس جانب ہو جاتا اور وہ باوجود چادر کے اندر ہونے کے گھبرا کر نیچے دیکھنے لگتی۔ ذہن کے پاس سوچنے کے لیے اس وقت کتنا کچھ تھا۔ لیکن انہی لمحوں میں یہ بھی بے کار سا ہو جاتا ہے۔ وہ پیچھے جا کر اپنی اور میران کی آخری ملاقات یاد کرنے کی کوشش کرتی تو کچھ گڈمڈ، بے ربط جملے چلے پڑتے، آخری لمحہ باوجود کوشش کے ہاتھ میں نہ آ رہا تھا۔ جو کچھ ابھی ابھی پیش آیا تھا اس پر سوچے بھی کچھ سمجھ میں نہ آتا کہ میران سے اس سب پر کیا بات کی گئی ہو گی۔

نکاح کا جھوٹ بولنے کے بعد آخر دلہا کے طور پر میران کا نام کس کی تجویز رہا ہو گا۔ کیا میران کی طرف سے کچھ۔ یا ان کے ہاں سے کوئی۔ وہ کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھی۔ اور اب آگے منزل۔ اس کا بھی تو کچھ اتا پتا نہ تھا۔ وہ کہاں جا رہے تھے۔ کتنی مدت کے لیے جا رہے تھے۔ میران کیا سوچ رہا تھا۔ لیکن یہ ملی جلی سوچیں بھی باوجود کئی الجھنوں کے رعنین کے لیے بڑی خوش کن تھیں۔ میران کے ساتھ شروع ہونے والا سفر اب چاہے جیسا بھی ہو، اس کی زندگی کا حسین ترین سفر تھا۔ کاش اس سفر کی عمر اللہ پاک نے بہت طویل رکھی ہو۔ اس نے پلکیں موند کر اپنے اور اپنے ساتھی کے لیے خوشیوں کی دعا مانگی۔ اور بہت دل [illegible]

digest library.com

سفر کرتے بڑی دیر گزر گئی تھی۔ آس پاس بے شمار بدلتے مناظر تھے لیکن وہ تو بس خالی الذہنی سے گرے قمیص کا کالر، کان کی لو، گردن اور پشت کے بالوں کو دیکھ دیکھ تھک نہ رہی تھی۔ منزل آنے تک اسی زاویے کو دیکھتے چلے جانا کسی کے لیے بھی اکتا دینے والا عمل ہو سکتا تھا۔ لیکن وہ کہیں بھی اور نہ دیکھ پا رہی تھی۔ دن کی روشنی بہت دیر ہوئی مکمل ہر سو اپنا احاطہ کر چکی تھی۔ مانسہرہ آ کر گزر گیا تو اسے خود ہی آئیڈیا ہوا کہ شہر سے مراد مانسہرہ نہ تھا۔ ان کی کار اب اسلام آباد کی جانب رواں تھی۔ ایبٹ آباد، حویلیاں اور اب ہری پور بھی گزر گئے تھے۔ منزل یقیناً اسلام آباد تھی۔ کچھ ہی دیر میں شہر کے آثار شروع ہو گئے۔ وہ اسے اسلام آباد ہی سمجھ رہی تھی۔ لیکن وہ اسلام آباد سے پہلے ٹیکسلا جانے والے راستے کو اتر گئے تھے۔ میران کی منزل دراصل ٹیکسلا میں زرگل کا گھر تھا۔

☆☆☆

"ام۔ ماں۔ اماں......" وہ ایک بھیانک خواب سے ہڑبڑا کر اٹھی تو سانس بھی گہرے گہرے لے رہی تھی۔ ارد گرد دیکھ کر سمجھنے کی کوشش کی۔ زبیدہ بھاگ کر کمرے میں آئی۔ بسمینہ گھبرائی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ زبیدہ نے ماتھا چھوا اسے

تو ٹھنڈے پسینے آرہے تھے۔
"کیا ہوا مینے؟" اس نے پیار سے بیٹی کو اپنے ساتھ لگایا۔
"کیا ہوا۔؟" افضل بھی ناشتا کر کے اب نکلنے والا تھا، اندر آ گیا۔
"خاب اِچ ڈر گئی شید۔"
"ہلا۔ آرام کرو بچے۔"
"بابا۔ رعنین باجی۔ اونوں بلا دیو۔" اس نے پیچھے سے پکارا تو افضل رُکا۔ پھر پلٹ کر پہلے زبیدہ کو دیکھا پھر بسمینہ کو۔
"آں۔ وہ رعنین باجی تے اتھے کوئی۔"
"کہاں گئی رعنین؟" زبیدہ نے بھی حیرت سے شوہر کو دیکھا۔ رات ہی تو وہ سارے کام کاج نمٹا کر وہاں سے آئی تھی۔
"رعنین اور میران کا آج صبح اذانوں کے ٹیم نکاح ہوا ہے۔"
"ہیں۔؟ زبیدہ اور بسمینہ نے بیک وقت بڑی خوش گوار حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔
کیسے۔ کیوں۔؟"
"وہ گھر کی بچیوں کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ وہ یعقوب خان دھمکی دیتا ہے کہ بدلے میں اب گھر کی بچی سے بیاہ کرے گا۔ بڑے خان نے اس کے ڈر سے شادی کروا کے صبح سویرے ان کو شہر روانہ کر دیا۔ فی الحال ادھر رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ تم لوگ بس زیادہ کچھ نہ پوچھنا بیبیوں سے۔ وہ خود بتا دیں تو ٹھیک ہے۔"
"ہلا۔ ہلا۔ کچھ نہیں کہتے۔" زبیدہ نے تسلی دی تو افضل گھر سے باہر چلا گیا۔
"ابھی تم بھی جا رہی ہو اماں؟" بسمینہ نے ماں کو دیکھا۔
"ہاں نا۔ ادھر سب میری راہ دیکھتے ہوں گے۔ ناشتے کا ٹیم ہے۔"
وردہ باجی کو ہی بھیج دینا۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔
"ہاں کہتی۔ وہ بسمینہ کو ناشتا دے کر چادر سنبھالتی خود بھی روانہ ہو گئی۔ گلو صبح اسکول جاتا تھا، وہ تو سب سے پہلے نکل گیا تھا۔
بسمینہ ناشتے کے بعد بھی سستی سے چادر اوڑھے پڑی تھی جب کچھ ہی دیر کے بعد وردہ کمرے میں داخل ہوئی۔
"کیوں بھئی۔ کیا ہو گیا ہے۔" وہ اس کے نزدیک آ بیٹھی۔
"رعنین باجی کی شادی ہو گئی؟" وہ وردہ کو دیکھ کر بشاشت سے مسکراتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔ وردہ کا چہرا بھی خوشی سے دمک رہا تھا۔
"ہاں نا۔ دیکھو تو کیسے اچانک اتنی بڑی خوشی کی خبر بن گئی۔"
"رعنین باجی خوش تھیں؟" بسمینہ بھی وردہ اور رعنین کی نوک جھوک سنا کرتی تھی تب ہی اندازہ تھا کہ میران خان اس کی بچپن کی محبت ہے۔
"ہاں۔ بہت خوش تھی۔ ہنسی تو رک ہی نہ رہی تھی۔"
"لیکن دھوم دھام سے ہوتی تو زیادہ اچھا تھا نا۔" وہ کچھ خیال آنے پر دکھی سی دوبارہ لیٹ گئی۔
"ہاں کنہ۔ یہ ارمان تو رہ گیا۔"
"میں نے بہت برا خواب دیکھا ہے وردہ باجی۔ میں بہت ڈر گئی تھی۔ اتنی صبح صبح آپ کو تکلیف دی۔"
ارے پاگل، یہ بھی کوئی بات ہے....." وردہ نے اس کا ہاتھ تھپکا۔ "رعنین کے اچانک چلے جانے کی وجہ سے تو میں بھی بہت اداس تھی۔ اچھا ہوا یہاں آ گئی۔ اچھا خیر خواب سنا دو نا۔"
"باجی۔ میں نے اقصر خانا کو دیکھا۔ وہ چلاتا ہوا بہت گہری کھائی میں گر رہا تھا۔ میں اوپر سے دیکھ رہی تھی۔ کھائی ختم ہی نہ ہو رہی تھی۔ وہ دیکھ تو اوپر رہا تھا ہاتھ پیر بھی مار رہا تھا لیکن نیچے جاتا جا رہا تھا۔ وہ چھوٹا ہوتا جا رہا تھا۔ نیچے کو ڈوب رہا تھا۔ اس کی آوازیں کانوں کو چیر رہی تھیں۔ میں آس پاس دیکھتی ہوں کہ شاید اس کو بچا لوں لیکن میرے ساتھ ہی

بڑے خان کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھ میں بہت گندی کالے سے کیچڑ والی ٹوکری تھی اس میں پھول تھے سفید گلابی۔ان پر بھی کیچڑ لگا تھا۔ وہ بھی بیٹے کو نیچے جاتا دیکھ رہے تھے۔ ''بس پھر ڈر سے میری آنکھ کھل گئی۔

''ہا......'' وردہ نے ایک آہ بھری۔ ''اس کا انجام تو شروع ہو چکا بسمینہ۔ وہ اسے تاسف بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

اور بسمینہ اس لمحے وردہ سے نظریں نہ ملا پائی۔ جو سچ اس نے رنگین باجی سے شیئر کیا تھا۔ وردہ کو بھی معلوم نہیں تھا۔ وردہ اور اس کا مجرم ایک ہی ہے۔ بسمینہ کا بڑا دل چاہا کہ آج وردہ باجی کو بھی بتا دے پر۔ دونوں نے ہی چونک کر سر اٹھایا۔ باہر نہایت قریب سے ایک مرتبہ پھر شدید فائرنگ کی آواز آرہی تھی۔ وردہ گھبرا کر اٹھی تو بسمینہ نے جھٹ اس کا ہاتھ پکڑ کر روکا۔

''باہر نہ جائیں وردہ باجی۔''

''لل لیکن۔ باہر سب......''

''ہاں تو آپ کیوں نکلتی ہیں خطرے میں۔ ابھی رک جائیں اِدھر۔'' اس نے زبردستی وردہ کو اپنے پاس بٹھایا۔

فائرنگ کی آواز کچھ دیر بعد تھم گئی لیکن مردوں کی آوازیں بہت آرہی تھیں۔ بسمینہ کا دل بری طرح ڈر گیا تھا وہ وردہ کو ہرگز جانے نہ دے سکتی تھی۔ اس لیے اس کا ہاتھ ہی پکڑ کر بیٹھ گئی۔ وردہ بھی انتظار کرنے لگی کہ ابھی کوئی نہ کوئی اُن کے پاس ضرور آئے گا۔ اور پھر بڑی دیر بعد جیپوں کی سامنے سے گزرنے کی آوازیں آئیں تو وہ دونوں باہر صحن میں نکل آئیں۔ زبیدہ ماسی نے آکر بتایا کہ وہ لوگ رنگین کو اٹھانے آئے تھے۔ اور تالے کھول کر دوسری حویلی بھی چھان ماری تھی۔ ابھی بھی ان کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا تھا اور دھمکیاں دیتے ہوئے گئے تھے۔

وردہ کو زبیدہ خود حویلی چھوڑ آئی۔ یہاں سب ڈرے ہوئے تھے۔ وہ بھی ماں سے چپک گئی۔

فردوس مامی کی حالت دیکھتے وہ الفر کے لیے دل سے نکلتی بددعائیں بھی جبراً اندر دبا لیا کرتی تھی۔ ورنہ دل چاہتا اپنی زندگی برباد کرنے والے کو ایسی بددعا دے کہ عرش ہی ہل جائے۔

☆☆☆

چھ بجے صبح وہ گاؤں سے روانہ ہوئے تھے۔ اور دن کے نو بجے ٹیکسلا پہنچ گئے۔ زرگل نے اپنے والدین کو بتایا کہ اس کا دوست اور اس کی بیوی آرہی ہیں۔ اور چونکہ اس کے والدین میران کے متعلق سب جانتے تھے تو ان سے چھپایا نہیں جا سکتا تھا کہ وہ عجلت میں شادی کر کے یہاں آیا ہے۔ کار گھر کے باہر رکی تو میران زرگل سے بغل گیر ہو کر اسے ایک سائیڈ میں لے گیا۔

''کیا کہا گھر والوں سے۔ اور۔''

''پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے صرف اتنا کہا کہ کچھ خاندانی دشمنیوں کی وجہ سے ان کا رشتہ خطرے میں پڑ رہا تھا تو دلہن کے والدین نے بیاہ کر شہر بھیج دیا۔ الفر والا قصہ سنانے کی بالکل ضرورت نہیں۔ بھابھی کو اندر بھیج دو۔ اور سمجھا بھی دو کہ کسی تفصیل میں نہ جائیں۔''

''ہوں۔ تھینکس۔'' میران نے اس کا ہاتھ تھپکا اور کار کی طرف واپس آیا۔

رنگین جو برقعے کے اندر سے ان دونوں کو دور باتیں کرتے دیکھ رہی تھی۔ نروس سی ہو کر نیچے دیکھنے لگی۔ لیکن اسی وقت ہی اس کی سائیڈ کا دروازہ کھٹ سے کھلا تو اس نے سر اوپر اٹھایا۔ میران نے ہاتھ سے باہر نکلنے کا اشارہ کیا تو وہ فوراً باہر نکلی۔ افضل چاچا زرگل اور میران کی باتوں کے دوران ہی ڈگی سے سامان نکال کر سائیڈ پہ رکھ چکے تھے۔ زرگل نے افضل چاچا کو کار پارک کرنے کے لیے ڈیرے کا راستہ دکھایا تو وہ اندر بیٹھ کر کار بڑھا لے گئے۔ میران کا بھی یہی ارادہ تھا کہ افضل چاچا سفر کے تھکے ہوئے ہیں۔ گھنٹہ بھر آرام کے بعد وہ انہیں کار سمیت واپس بھیج دے گا۔ کیونکہ یہ کار ابراہیم چاچا کی تھی۔ اور اس

نے واپس ہی بھیجنی تھی۔ حالانکہ چاچا نے کہا تھا کہ اپنے استعمال کے لیے رکھنا چاہو تو رکھ سکتے ہو لیکن میران کو یہ مناسب نہیں لگا۔

زرگل چاچا کو اندر بٹھا کر ان کی طرف آ رہا تھا۔

"تم اندر جاؤ۔ اور اطہر والے واقعے کی کوئی ڈیٹیل کسی کو مت بتانا، کہنا کچھ خاندانی دشمنیوں کی وجہ سے عجلت میں نکاح ہوا۔ جاؤ۔" اس نے جلدی سے اسے دروازے کا راستہ دکھایا اور وہ بات کرنے کی خواہش دل میں دبائے ہی اندر آ گئی۔ زرگل کا گھر بہت خوب صورت تھا۔ بالکل بنگلے نما۔ وہ دل اور قدموں میں جھجک لیے اکیلی ہی اندر داخل ہوئی۔ ڈرے ڈرے انداز میں دائیں ہاتھ بنی عمارت کی جانب بڑھی۔ برآمدے تک پہنچی تو ایک عورت باہر نکل کر اس تک پہنچی۔ رعنین یوں تو چادر اوڑھتی تھی، اسی سے چہرا بھی ناک تک چھپا لیتی تھی لیکن آج اسے سلطانہ پھوپھو کا نقاب والا برقع دیا گیا تھا، شاید دشمنوں سے چھپانے کی کوشش تھی۔ بہرحال اس نے اندر آ کر پہلی نقاب الٹ دی اور جب عورت کو دیکھا تو ناک پہ دھری دوسری نقاب بھی نیچے سرکا لی اور سلام کیا۔ اپنی عمر سے وہ گھر کی کوئی بڑی خاتون لگ رہی تھیں۔ شاید زرگل کی والدہ۔ عورت اسے بڑی گرم جوشی سے ملیں اور ساتھ لگائے اندر آ گئیں۔

"نام کیا ہے بچے؟" وہ اسے ایک کمرے میں لے آئیں اور پلنگ پر بٹھا دیا۔

"رعنین۔" وہ ہلکا سا مسکرائی۔

آں۔ ماشاء اللہ۔ میں زرگل کی امی ہوں۔ تم ہی دلہن ہو نا اپنا میران بیٹے کی؟"

اس بے چاری کا حلیہ بھی کہاں دلہنوں والا تھا۔ زرگل کی امی کو یہ تو معلوم تھا کہ عجلت میں شادی ہوئی ہے، پر اتنی عجلت۔ وہ نہایت تعجب سے رعنین کا حلیہ دیکھ رہی تھیں۔ بال بنا کنگھی کیے اکٹھے کر کے ہیئر جینڈ میں بند کیے گئے تھے۔ سرمئی، پیلے پھولوں والا شلوار قمیص بھی سلوٹوں بھرا تھا۔

"یہ تمہارا ہی کمرا ہے۔ اگر سامان ہے تو میں منگوا دیتی ہوں۔ تم فریش ہو جانا۔ وہ اس کا گال تھپک کر باہر چلی گئیں۔

رعنین نے برقع اتار کر گلے میں پڑا دوپٹا سر پہ پھیلایا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے ہی کمرے کا جائزہ لیا۔ دو پلنگ اور دیوار سے لگے دو سنگل صوفوں ایک گلاس ٹیبل اور دیوار گیر وارڈ روب پر مشتمل وہ ایک گیسٹ روم ہی لگ رہا تھا۔ ایکدم سیٹ اور صاف ستھرا۔ اور جب وارڈ روب کے آئینے میں اپنا آپ دکھائی دیا تو اسے سخت شرمندگی محسوس ہوئی۔ وہ اس خوب صورت کمرے میں بالکل ہی مس فٹ تھی اس وقت۔ بلاوجہ ہی بال درست کرنے کی کوشش کی اور تب ہی ایک ملازمہ اندر اس کا سوٹ کیس گھسیٹ کر لے آئی۔ پیچھے ایک اور لڑکی بھی تھی اور ایک سوٹ کیس اس کے پاس بھی تھا۔ وہ عجلت میں کہنے ہی لگی تھی کہ یہ میرا نہیں ہے۔ کیونکہ وہ دوسرے کو بیگ نہیں پہچانتی تھی کہ تب ہی پھوپھو کی بات یاد آئی۔ انہوں نے وردہ سے کہا تھا ایک اسی کا سامان تو نہیں ہوگا۔ اس نے دھیان دیا تو اس سوٹ کیس کے ہینڈل میں کچھ ائیر پورٹ کے ٹیگ پھنسے تھے۔ وہ سمجھ گئی یہ میران کا دبئی کا بیگ ہوگا۔ اس نے ہلکا سا مسکرا کر دونوں خواتین کو دیکھا۔ وہ بھی سلام کر کے واپس چلی گئیں۔

رعنین نے جلدی سے اپنا سوٹ کیس کھول کر ایک نیا جامنی رنگ کا شلوار قمیص اور شال نکالے۔ ہلکے گلابی پرنٹ والا یہ جامنی سوٹ اس نے ابھی تک پہنا نہیں تھا۔ وہ دونوں سوٹ کیس ڈریسنگ روم کی چھوٹی سی جگہ میں ایڈجسٹ کر کے واش روم چلی گئی۔

وردہ نے سوٹ کیس میں اس کا ہیئر برش کچھ کریمیں، میک اپ کا سامان بھی رکھا تھا۔ وہ بس برش لے کر بال سلجھانے لگی جب ایک لڑکی مسکراتے ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک تھرماس تھا اور ساتھ ایک ملازمہ ٹرے لیے ہوئے تھی۔ پیچھے ایک اور لڑکی بھی تھی۔ ملازمہ نے ٹرے سامنے میز پر رکھی اور واپس چلی گئی۔ رعنین اٹھ کر دونوں لڑکیوں سے بغلگیر ہوئی اور وہ مل کر سامنے

پلنگ کے کنارے بیٹھ گئیں۔

"سفر کیسا رہا بھابھی۔؟" ایک لڑکی شوخی سے مسکرائی اور رعنین کو اپنے لیے پہلی مرتبہ لفظ بھابھی سننا بہت ہی عجیب اور خوش کن احساس رہا۔

"میرا نام ثمین ہے۔ میں زرگل کی بہن ہوں۔ اور یہ رخسار بھابھی ہیں۔ زرگل بھائی سے بڑے زرگل بھائی کی بیوی۔" وہ تعارف کروا کہ اس کے لیے چائے ڈالنے لگی۔

رعنین کی تو بھوک بھی خوب چمک اٹھی تھی۔ ان کے ہاں تو صبح سویرے ہی ناشتا کرلیا جاتا تھا اور اس وقت دن کے دس بج رہے تھے۔

"بھابھی۔ آپ ناشتا کرلیں۔ پھر امی نے کہا ہے آپ کو تیار کردوں۔"

"تیار۔؟" وہ حیرت سے دیکھنے لگی۔ جس پر رخسار مسکرادی۔

"جلدی میں شادی ہوئی ہے تو کیا دلہن نہیں بنائیں گے؟"

"ن۔نہیں نہیں۔ پلیز۔ دلہن وغیرہ کچھ نہیں۔"

"اچھا جی۔ میران بھائی ولیمہ گول کریں گے تو ہم کیا بخش دیں گے۔" ثمین بھی مکمل شوخی کے موڈ میں تھی۔ اُن دونوں کی باتیں سن کر رعنین کی گھبراہٹ بڑھ رہی تھی۔ پتا نہیں میران بھی کیا کچھ سوچ بیٹھا تھا۔ دلہن وہن بننے کی کیا باتیں تھیں۔ اسے کب کچھ سوچنے کا موقع ملا تھا۔ گھر سے دوڑ لگوادی۔ اسے کیا خبر تھی آگے کیا ہوتا ہے۔ پر اب کچھ کچھ ذہن کھلنا شروع ہو رہا تھا۔ جن باتوں کو سوچ کر ان اس کے پسینے چھوٹ رہے تھے، وہ حقیقتاً زندگی میں آشامل ہوئے تھے۔

ثمین بتا رہی تھی "شام کو اسے اچھا سا تیار کروا کے ٹریٹ لیں گے میران بھائی سے۔ اور اس کمرے کو بھی ہلکا پھلکا آپ کے لیے سجائیں گے۔"

"پھر میران بھائی آئیں گے۔ اور......"

رخسار نے آنکھیں میچ کر شرارت کو بڑھاوا دیا۔

"کک۔ کون کون ہے گھر میں۔ اس کا گلا کم بخت خشک ہوا تو آواز ہی بڑی مشکل سے نکل پائی۔

"دن کے وقت ادھر عورتوں والی سائیڈ پر امی، بھابھی اور میں ہوتے ہیں۔ ادھر ہماری زرعی زمینیں ہیں پیچھے۔ اور ساتھ ڈیرا۔ یہاں کے کام کاج نور بھیا سنبھالتے ہیں شروع سے۔ اور زرگل بھیا بھی اب تو پردیس سے آگئے ہیں۔

ثمین ہلکے پھلکے انداز میں بتانے لگی۔ ان دونوں نے اپنے لیے بھی چائے ڈالی تھی۔ تب ہی وہ بھی جھجک محسوس نہ کرتے سہولت سے ناشتا کرنے لگی۔

مہمانوں کا رویہ ہی دراصل جھجک کے کم یا زیادہ ہونے کی حقیقی وجہ ہوتا ہے۔

ناشتا ختم ہونے تک زرگل کی امی بھی وہاں آگئیں۔ وہ سب بڑی ہی خوش اخلاق خواتین تھیں۔ رعنین سے وہ اس کی فیملی کے متعلق سوالات بھی کررہی تھیں۔ اور اسے چونکہ النصر والے معاملے میں محتاط ہونے کو کہا گیا تھا اس لیے وہ باقی ہر سوال کا روانی اور سچائی سے جواب دینے لگی۔ وہ سب لوگ میران کے متعلق تو کافی کچھ جانتے تھے لیکن اس سے زیادہ واقف نہ تھے۔

ناشتے کے بعد وہ اسے اپنا گھر دکھانے باہر لے آئے۔ رعنین اُس انقلابی دن کے پل پل بدلتے حالات پر حیرت سے مغمول اور معمول سے اندر پیدا ہوتی نئی نئی خوشی تک کے مراحل سے گزرتی سہ پہر آنے تک بہت حد تک اس نئے ماحول سے ایڈجسٹ ہوچکی تھی۔ صبح پانچ بجے سے سہ پہر کے پانچ بجے تک کے بارہ گھنٹوں میں اب یہ قبول کرنا آسان لگنے لگا تھا کہ وہ اور میران ہمیشہ کے لیے ایک مضبوط ازدواجی بندھن میں بندھ چکے ہیں۔ صبح کی بے یقینی اور ہونق پن اب چہرے سے بھی دھیرے دھیرے رخصت ہوچکا تھا۔ دوپہر کو ثمین اور رخسار بھابھی ڈرائیور کے ساتھ مارکیٹ گئی تھیں۔ رعنین کے لیے وہ ٹی پنک لائٹ کام والا شلوار قمیص گفٹ کے طور پر لائی تھیں۔ اور وہی اسے عروسی

digest library.com

ڈریس کے طور پر رات کو پہننے کے لیے دیا۔ رعنین کو ڈریس بہت اچھا لگا۔ اور اس نے شکر کیا کہ وہ کوئی چبھتا ہوا لال بھاری عروسی ڈریس نہ تھا۔ رخسار اور ثمین میک اپ کرانے کے لیے اس کے سر پر موجود تھیں۔ وہ ہنستے ہوئے ڈریس تبدیل کرنے چلی گئی۔

میران دن بھر کے دوران بالکل اندر نہ آیا تھا۔ وہ سمجھ گئی کہ ان سب خواتین کی وجہ سے لحاظ آڑے آرہا ہوگا۔ تب ہی رات کو ہی آئے گا۔ ثمین میک اپ کرنا جانتی تھی۔ اس نے بڑی مہارت سے اس کا ہیئر اسٹائل اور میک اپ کیا۔

رات کے کھانے پر اسے خیال آیا کہ ان سب نے میران سے ٹریٹ لینے کی بات کی تھی لیکن کھانے کے وقت ایسا کوئی موضوع نہیں آیا۔ کھانا اس نے اندر سب کے ساتھ کیا۔ مردوں کا کھانا ڈیرے پہنچا دیا گیا۔ کھانے کے بعد بھی رخسار، ثمین اور وہ لان میں بیٹھی رہیں۔ رخسار کی شادی قریب ڈیڑھ سال پہلے ہوئی تھی۔ ثمین منگنی شدہ تھی۔ اس کا منگیتر اسلام آباد میں اپنی تعلیم مکمل کررہا تھا۔ اس کی شادی بھی سال بھر میں ہونے والی تھی۔ نور گل بھائی گھر آئے تو رخسار اجازت لے کر اندر چلی گئی۔ رات کے نو بج رہے تھے۔ شاید یہاں کا رواج بھی جلد سونے کا تھا۔ ثمین بھی اسے آرام کرنے کا کہہ کر چلی گئی۔ یہاں کا نقشہ ایسا تھا کہ جس کمرے میں اس وقت وہ تھی اس کا دروازہ ڈائریکٹ باہر والے برآمدے میں اوپن ہوتا تھا۔ گھر کے اندر جاتا داخلی دروازہ اس کے ساتھ والا تھا۔ اسے یہ کمرا یقیناً میران کی وجہ سے دیا گیا تھا تاکہ بنا پردے وغیرہ کے جھنجٹ میں پڑے وہ کسی بھی وقت یہاں آ، جاسکے۔ اور اب چونکہ گھر کی خواتین بھی باقاعدہ اجازت لے گئی تھیں تو میران کو بھی اطلاع کردی گئی ہوگی۔ رعنین بلاوجہ نروس ہونے لگی۔ گھبراہٹ میں پہلے تو کمرے کا سب بکھرا ہوا سامان جگہ پہ رکھا۔ پھر اپنی تیاری دیکھی۔ ایسے دلہن والے روپ میں اسے اپنا آپ ہی آئینے میں دیکھا نہیں گیا۔ وہ جھینپ کر وہاں سے ہٹ آئی۔

موبائل چیک کیا تو صرف وردہ کے میسج تھے۔ رعنین نے اسے اپنی تیاری کی تصاویر بھیجی تھیں۔ وردہ کو بھی خوشی سے نیند نہیں آرہی تھی۔ اس نے بھی دن بھر کا احوال رعنین کو دیا۔ رعنین کو بہت حیرت ہوئی سن کر کہ بچی کے گھر والے اس کی تلاش میں حویلی آئے تھے۔ اور اگر وہ موجود ہوتی تو یقیناً اُٹھالے جاتے۔

رعنین کے سوچ کر رونگٹے کھڑے ہوگئے، باباجان کو بروقت اگر میران کا خیال نہ آتا تو نجانے اب صورت حال کیا ہوتی۔ وردہ سے دیر تک دن بھر کا چھوٹے سے چھوٹا احوال کرلینے کے بعد اسے اچانک خیال آیا کہ وقت تو کافی آگے بڑھ گیا تھا۔ میران ابھی تک نہیں آیا تھا۔ اس نے وردہ سے اجازت لے کر جلدی سے میران کا نمبر ملایا لیکن اس کی کال آگے سے کاٹ دی گئی۔ وہ اُٹھ کر کمرے کے دروازے میں آکھڑی ہوئی۔ سامنے ہی گھر کا گیٹ تھا۔ وہ بے چینی سے میران کی راہ دیکھ رہی تھی۔ بار بار موبائل میں وقت دیکھتی۔ پتا نہیں کہاں بزی تھا۔ کہا تو عورتوں کو بُرا جاتا ہے کہ وہ بہت بولتی ہیں۔ اب بتائیں۔ کس کی باتیں ختم ہونے میں نہیں آرہیں۔ وہ تنگ آکر پلنگ کے کنارے بیٹھ گئی۔ موبائل کی طرف دیکھا۔ میران کو یہ بھی نہیں لکھ سکتی تھی کہ "کب آؤ گے؟" اب ایسے دلہن کے حلیے میں یہ بات لکھتی کیا اچھی لگوں گی۔ اس نے شرما کر موبائل دور پھینکا۔ مبادا کچھ لکھ ہی نہ بیٹھے۔ نظر ایک مرتبہ پھر گھڑی پر گئی۔ گیارہ بج چکے تھے۔ وہ تو بیٹھے بیٹھے ہی تھک چکی تھی۔ دو سرہانے کھینچ کر ایک دوسرے پر رکھے۔ سوچا نیم دراز ہی ہوجائے لیکن کمرے کی مکمل لائٹ میں لیٹنے سے جھجک ہورہی تھی۔ نائٹ بلب تو اسے پسند ہی نہیں تھا۔

بہت سوچنے پر ایک خیال آیا اور اس نے ڈریسنگ ٹیبل کا کم روشنی والا بلب جلادیا اور کمرے کی بڑی لائٹ آف کردی۔ اب کمرے میں مکمل تاریکی بھی نہ تھی۔ سب کچھ صاف سجھائی دے رہا تھا۔ اس نے تھک کر سرہانے پہ سر رکھا۔ سوچنے کے لیے تو

زیادہ دور جانے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ صبح سویرے آنکھ کھلنے سے اب تک کے واقعات کو دہرانا بھی ایک نیا اپنا مشغلہ تھا۔ وہ کبھی تعجب سے کسی لمحے پہ رک جاتی تو کبھی کسی پل کی یاد مسکراہٹ بن کر لبوں پہ پھیل جاتی۔ پلکیں دھیرے دھیرے بند ہو رہی تھیں۔ ہونٹوں پہ مسکراہٹ لیے وہ کچھ ہی دیر میں گہری نیند میں جا چکی تھی۔

☆☆☆

"گھر جا رہا ہوں میران۔ تم بھی آ جاؤ۔"

نور گل بھائی نے ڈیرے پر کام کرنے والوں کو معمول کی ہدایات دیں۔ یہاں کے سب مہمان ایک ایک کر کے رخصت ہو چکے تھے۔ اس وقت چند ایک ملازم ہی کام نمٹانے میں لگے تھے۔

"زر گل آ جائے بھیا۔ میں بس اسی کی راہ دیکھ رہا ہوں۔" وہ مؤدب سا اُٹھ بیٹھا۔

اچھا ہاں۔ کافی دیر سے دکھائی نہیں دیا۔ کہاں گیا ہے۔ نور گل کو زیادہ تو ان کے معاملات پتا نہ تھے۔ بس اتنا معلوم تھا کہ اس کو اندر والا گیسٹ روم دیا گیا ہے جہاں اس کی وائف بھی ہے۔

"جی۔ میرے ہی ایک کام سے گیا ہے۔ میں اس کے آنے تک ویٹ کر لیتا ہوں۔" وہ اُن کے ساتھ ہی بات کرتے باہر تک آ گیا تھا۔

"چلو ٹھیک ہے۔ میں پھر اندر جاتا ہوں۔" وہ اس کا کندھا تھپک کر وہاں سے چلے گئے۔

میران گھڑی دیکھتا واپس کمرے میں آ کر بیٹھ گیا۔ زر گل اسے عام مہمانوں کے بڑے کمرے کے بجائے اپنے آرام کرنے والے کمرے میں بٹھا گیا تھا۔ ڈیرے پر تو سارا دن آن جان ہی لگی رہتی تھی۔ وہاں بھلا میران کا کیا کام تھا۔ دن کا تمام وقت زر گل ہی اس کے ساتھ رہا تھا۔ وہیں پر آگے کے متعلق کافی کچھ طے پایا تھا۔ زر گل مُصر تھا کہ جب اپنا گھر موجود ہے تو اسے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن میران بضد تھا۔ اسے ایک دن کی مہمان نوازی سے ایک بھی روز اور یہاں نہیں رُکنا تھا۔ اب وہ اپنی فیملی کے ساتھ تھا۔ اور فیوچر کے متعلق کچھ خبر نہ تھی کہ یہ دربدری کب تک کی ہے۔ زر گل نے آدھا دن کنوینس کرنے میں لگا دیا لیکن میران کچھ سننے کو تیار نہیں تھا۔ اسے ارجنٹ بنیادوں پر کم از کم ایک ماہ کے لیے تو فوری ایک گھر درکار تھا۔ زر گل نے چند ایک دوستوں کے متعلق بتایا کہ جن کے کرائے کے مکان تھے۔ میران نے اسے فوراً روانہ کیا کہ وہ آج ہی جا کر معلوم کرے۔ زر گل نے ایک دوست سے فون پر بات کی۔ اور یہ کہہ کر میران کو ڈیرے پر چھوڑ گیا کہ پہلے وہ خود جا کر مکانوں کی کنڈیشن دیکھے گا۔ اگر اسے میران کے قابل لگے تب ہی وہ اس کو لے جائے گا۔ میران بھی راضی ہو گیا اور زر گل کار لیے نکل کھڑا ہوا۔ مہمانوں اور نور گل بھائی کے گھر جاتے ہی ڈیرے پر خاموشی سی چھا گئی۔ وہ سستانے کے لیے لیٹ گیا۔ زر گل سے رابطہ ہوا تو اس نے بتایا کہ گھر اس نے دیکھ لیے ہیں اور اب وہ واپسی کے لیے نکل رہا ہے۔ میران سرہانہ سیدھا کر کے ٹانگیں لمبی کرتے لیٹ گیا۔ زر گل کو وہ پہلے ہی بتا چکا تھا کہ وہ رات کو یہیں سوئے گا۔ گھر کے اندر جانے سے اس نے صاف انکار کر دیا تھا۔ اسے یہ بات قطعی مناسب نہیں لگ رہی تھی کہ آج ہی وہ دلہن بیاہ کر لایا اور اب زر گل کے گھر والے اس کا اور دلہن کا کمرا تیار کریں۔ اگرچہ وہ بڑی خوشی خوشی پیغامات بھجوا رہی تھیں۔ لیکن میران کی سنجیدگی کسی طور کم ہونے میں نہ آئی۔ ٹریٹ کے متعلق بھی اس نے یہی جواب بھجوایا کہ ایک بار اپنے گھر شفٹ ہو جائے پھر ٹریٹ بھی دے گا۔ ولیمہ بھی۔ اور اس کا پختہ عزم دیکھ کر زر گل نے بھی بہن اور بھابھی کو منع کیا کہ میران کو مزید تنگ نہ کریں۔ میران نے بازو آنکھوں پہ رکھ کر سکون لینے کی کوشش کی، زر گل سے گھروں کی تفصیل سننے کا اشتیاق حاوی تھا تب ہی جاگتے رہنے کی تگ و دو کر رہا تھا۔ لیکن شاید سفر کی تھکان کا اثر تھا کہ نیند آنے میں زیادہ دیر نہیں لگی اور وہ ارد گرد سے بالکل بے خبر ہو گیا۔

☆☆☆

''گڈ مارننگ......'' ثمین کی چہکتی سی آواز پر وہ بری طرح چونک کر اُٹھی۔ ہڑبڑا کر دائیں بائیں دیکھا۔ وہ کمرے میں اکیلی تھی اور کسی کے وہاں آنے کے آثار بھی دکھائی نہ دیے تھے۔ وہ دوسرہانوں پر اسی رات والے اینگل پر لیٹی تھی۔ ثمین کے پیچھے رخسار بھابھی بھی تھیں۔ رعنین نے ہاتھوں سے بال درست کیے اور دوپٹا اوڑھ لیا۔

''گڈ مارننگ۔''

''سوری۔ آپ شاید دیر تک سونے کی عادی ہیں۔ ہم نے ڈسٹرب کر دیا۔'' رخسار کو اس کے نیند سے جگا دینے پر شرمندگی ہو رہی تھی۔

''جی نہیں۔ ہم تو نماز کے وقت اٹھ جاتے ہیں۔'' وہ مسکرائی ''لیکن رات تھکاوٹ شاید بہت تھی۔ سوئی بھی کچھ لیٹ تو......''

''کوئی بات نہیں۔ پھر ناشتا لگوا دیں۔؟''

رخسار شاید یہی پوچھنے آئی تھی۔

''جی بالکل۔'' ''میں بس فریش ہونے میں دس منٹ لگاؤں گی۔'' وہ فوراً ہی اُٹھ گئی۔

جیسی شرارتیں رات بھابھی اور ثمین کر رہی تھیں، رعنین نہیں چاہتی تھی وہ اس حوالے سے کوئی سوال کریں۔ اس لیے فوراً واش روم چلی گئی۔ حالانکہ رخسار اور ثمین اپنی جگہ شرمندہ تھیں کہ انہوں نے بلاوجہ رعنین کو تیار کر کے شوخیاں کیں۔ جبکہ میران نے اندر آنے سے ہی انکار کر دیا تھا۔ وہ رات بھی یہ بات جان چکی تھیں کہ میران اندر نہیں آئے گا لیکن رعنین سے مزید کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی تو سونے چلی گئیں۔

ناشتے کے بعد ہی واپس آ کر رعنین نے کپڑے تبدیل کیے۔ رات وہ اسی گلابی پارٹی ڈریس میں سو گئی تھی۔ اپنا آپ آکورڈ لگ رہا تھا۔ جامنی ڈریس دوبارہ پہن کر اب وہ بہت سکون محسوس کر رہی تھی۔ میران رات کمرے میں نہیں آیا تھا۔ یہ سوال آنکھ کھلتے ساتھ ہی ذہن کو پریشان کر رہا تھا لیکن اس نے اپنے رویے سے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اور اب اگلی صبح کے دس بج چکے تھے۔ میران نے چوبیس گھنٹے پہلے اسے یہاں بھیجا تھا اور اس دوران ملنا تو دور اس سے موبائل رابطے میں بھی نہیں تھا۔ یہ بات اب رعنین کو اندر ہی اندر بری طرح ڈسٹرب کر رہی تھی لیکن اب پوچھتی بھی کس سے۔

رخسار اور ثمین گپ شپ کر کے اُٹھیں تو اس نے گھر کال ملا لی۔ امی اور سلطانہ پھوپھو سے بات کر کے انہیں ایک اچھی اور پرسکون جگہ پر ہونے کی تسلی دی۔ کچھ حال احوال انہیں پہلے ہی وردہ بتا چکی تھی۔ میران کا نمبر ملایا تو کال ایک مرتبہ پھر کاٹ دی گئی۔ رعنین کا چہرا خفت سے گرم پڑ گیا۔ وہ موبائل پھینک کر ذہن بدلنے کے لیے باہر لان میں آ گئی۔ کتنی خوش تھی وہ کل۔ شام ہونے تک زندگی میں در آنے والی اس سب سے بڑی تبدیلی کو دل و جاں سے تسلیم کرتے وہ اب صرف اور صرف میران کی منتظر تھی۔ بس وہ سامنے آئے اور دونوں اس ''چھپر پھاڑ انعام'' پر جی بھر کر ہنسیں، خوب خوشی منائیں۔ لیکن میران اپنے رویے سے یہ کیا کر رہا تھا۔ رعنین کے لیے سمجھنا صرف ایک معمہ تھا۔ تھک کر دوبارہ کمرے میں آ لیٹی۔ یہاں کی روٹین میں کرنے کو اور کیا تھا۔ نجانے کب تک اس کمرے میں پڑے رہنا تھا۔ اب اس کا دل بڑا ہی بھاری سا ہو رہا تھا۔ اب تو شاید رخسار اور ثمین کے آنے پر بھی وہ اپنا موڈ تبدیل نہ کر پاتی۔۔ لیکن۔ اکتاہٹ بھری روٹین میں بدلاؤ آیا تھا۔ ایک ملازمہ کمرے میں داخل ہوئی

''باجی۔ آپ کا سامان سارا بند ہے؟''

''جی۔ کیا مطلب؟'' وہ لیٹے سے اُٹھ بیٹھی۔

آپ کا سامان منگوایا ہے باہر۔ دونوں بیگ۔''

اس نے سوٹ کیسوں کی جانب اشارہ کیا اور وہ شدید حیران ہوتے اُٹھ بیٹھی۔ یا اللہ کہیں واپس گاؤں تو نہیں جا رہے۔ اس کے دل میں خیال آیا۔ اور تب ہی۔ رخسار بھابھی اور زرگل کی امی کمرے

میں داخل ہوئیں۔

"تمہارے شوہر سے ہم بہت خفا ہیں رعنین" آنٹی اسے بھی ناراضی بھری نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

"ہم کیا پرائے تھے اس کے۔ کتنا خوش ہیں ہم تمہارے آنے سے۔" رخسار بھابھی بھی مبہم باتیں کر رہی تھیں۔

digest library.com

"اور کیا۔ پہلے رات کو اندر آنے سے منع کر دیا۔ اور اب دوسری جگہ شفٹ ہو رہا ہے۔ اور جلدی کتنی ہے اسے......" رخسار اب ساس کو دیکھ رہی تھی۔ "لے لیتا مکان بھی۔ دو چار دن بھی یہاں نہیں ٹھہر سکتا تھا......"

کچھ نہ سمجھتے ان دونوں کی باتوں پر غور کر رہی تھی۔ انہیں بھی سارے شکوے میران ہی سے تھے۔ وہ مارے شرمندگی کے سوال بھی نہ کر رہی تھی۔ وہ یقیناً سوچتیں کہ اس کا اپنے شوہر سے رابطہ کیوں نہیں ہے جبکہ وہ اس کے پاس موبائل دیکھ چکی تھیں۔

"جی سامان تو تقریباً پیک ہی ہے۔" اس نے دونوں سوٹ کیس ملازمہ کو تھمائے اور ہیئر برش، چارجر جیسی چھوٹی موٹی چیزیں اپنے بیگ میں ڈالنے لگی۔

ان دونوں کی باتوں سے یہی سمجھ میں آیا کہ وہ دونوں کہیں اور شفٹ ہو رہے ہیں۔ وہ ذہنی طور پر نجانے کیوں کچھ مطمئن ہی ہوئی تھی۔ وجہ ظاہر ہے یہی تھی کہ میران سے دوری اب ختم ہونے والی تھی۔ ان سب سے مل کر باہر آنے تک اس کا چہرا ایک مرتبہ پھر سے کھل اٹھا تھا۔ برقع اوڑھ کر نقاب کرتے وہ باہر آئی تو گیٹ کے سامنے ہی ایک کار کھڑی تھی۔ فرنٹ سیٹ پر زرگل اور میران بیٹھے تھے۔ اسے ایک مرتبہ پھر خاموشی سے پیچھے بیٹھ جانا پڑا۔ کار روانہ ہوگئی اور قریب دس بارہ منٹ بعد ہی ایک جگہ رک گئی۔ میران اور زرگل نیچے اتر گئے۔ دکھائی دیتے اس درمیانے سائز کے براؤن گیٹ کا تالا کھول کر اندر گئے۔ پھر ڈگی سے سامان نکال کر اندر رکھا اور میران نے اس کی سائیڈ کا دروازہ کھولا تو وہ بھی نیچے اتر کر اندر چلی آئی۔ میران دروازہ بند کر کے باہر نکل گیا، کار اسٹارٹ ہونے کی آواز بھی آئی۔ رعنین کو لگا زرگل چلا گیا ہوگا اور میران ابھی اندر داخل ہوگا۔

لیکن وہ کافی دیر تک گیٹ کو ہی تکتی رہی۔ میران پانچ چھ منٹ گزر جانے پر بھی واپس نہیں آیا تو اس نے ایک [illegible] برقع اتارا۔ میران کے علاوہ کسی اور کے اندر آنے کا امکان تو بالکل نہیں تھا پھر بھی اس نے اپنا جامنی دوپٹہ پورا پھیلا کر اپنے گرد اوڑھ لیا۔ اور گھر دیکھنے لگی۔

عمارت صرف گیٹ کے داہنے ہاتھ پر تھی۔ لیفٹ سائیڈ پر آخر تک جاتی ایک دیوار تھی۔ دائیں ہاتھ چھوٹا برآمدہ تھا جس میں دو کمرے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ برآمدے میں چڑھی۔ مکان پختہ اور نیا تھا۔ جالی والا دروازہ کھول کر اندر آئی۔ کمرے صاف ستھرے اور سامان سے بالکل خالی تھے۔ اسے حیرت ہوئی کہ سامان ابھی لینا تھا تو میران کو اسے لانے کی کیا جلدی تھی۔ اس نے دوسرا کمرا بھی دیکھا۔ واش روم اور کچن بھی چیک کیے۔ برآمدے میں اوپر جاتی سیڑھیاں بھی تھیں لیکن اس کا اوپر جانے کا کوئی ارادہ نہیں بنا۔ وہ باہر برآمدے کے اسٹیپس پر آکر بیٹھ گئی۔ کار کی واپسی قریب چالیس پینتالیس منٹ بعد ہوئی۔ میران نے ہی اندر جھانکا۔

"تم ذرا چھت پر چلی جاؤ۔"

وہ عجلت میں کہہ کر واپس نکل گیا اور وہ دوڑ کر چھت کی سیڑھیاں چڑھ گئی۔ سمجھ گئی کوئی اور مرد بھی ساتھ ہیں۔ وہ اوپر آئی تو یہاں کا نقشہ اسے زیادہ اچھا لگا۔ وہ تو اسے کوئی کھلی چھت سمجھ رہی تھی جبکہ سیڑھی کا دروازہ ایک بند ہال میں کھل رہا تھا جس میں ایک کمرا، اوپن کچن اور ایک باتھ روم بھی تھا۔ ایک بڑی شیشے کی کھڑکی تھی۔ اس نے قریب جا کر جھانکا تو گلی دکھائی دے رہی تھی۔ ایک ڈائنا سے انہی کا سامان اتارا جا رہا تھا۔ وہ دلچسپی سے دیکھنے لگی۔ پھر

لوڈر خالی ہوا، دو آدمی اس میں سوار ہوئے اور وہ روانہ ہوگیا۔ تب ہی زرگل اور میران بھی باہر آئے۔ کار میں بیٹھے اور روانہ......ہا۔

رعنین کا حیرت سے منہ کھلا۔ میران نے آواز دے کر اسے نہ نیچے بلایا نہ کوئی ہدایات۔ وہ خوب بھناتی ہوئی نیچے آئی۔ پہلے دروازہ اندر سے بند کیا پھر کمروں میں آ کر سامان دیکھا۔ دو پلنگ، دو میٹرس۔ پلاسٹک کی چار کرسیاں ایک میز۔ ایک لکڑی کی سائیڈ ٹیبل۔ رعنین نے پہلی بار دھیان دیا کہ ایک کمرے میں دیوار گیر وارڈروب بھی تھی۔ اسے خیال آیا کہ بلاوجہ اس نے اتنا وقت ضائع کیا۔ کم از کم فارغ رہنے سے اچھا ہے کپڑے ہی سیٹ کردے۔ الماری کھول کر اس نے چیک کیا۔ ایکدم صاف ستھری تھی۔ پھر بھی اس نے دوپٹے کا کونا مار کر چیک کیا۔ لیکن کوئی ڈسٹ نہیں آئی تو سوٹ کیس کھول کر کپڑے ترتیب سے رکھنے لگی۔ میران کا سوٹ کیس کسی پاسورڈ سے لاک تھا۔ اسے یونہی رہنے دیا۔

اس مرتبہ بھی درمیان میں گھنٹہ بھر گزرا لیکن وہ چونکہ مصروف رہی تھی تو زیادہ محسوس نہیں ہوا۔ اس مرتبہ میران کچن کا سامان جیسے چولہا، برتن اور کھانے پینے کی اشیاء لایا تھا۔ رعنین دوسری مرتبہ نیچے آئی تو پلنگ اور میٹرس کمرے میں سیٹ کر کے رکھ دیے گئے تھے۔ زرگل شاید چلا گیا تھا۔ میران کچن میں چولہا سیٹ کر رہا تھا۔ گیس کی لائن موجود تھی وہ چولہا فٹ کرنے میں لگا تھا۔ رعنین پاس آ کر ساتھ رکھا سامان دیکھنے لگی۔ شاپرز میں کچھ برتن تھے۔ وہ کن انکھیوں سے میران کو بھی دیکھ لیتی۔ چاہتی تھی وہ اس کے ہونے کا نوٹس لے۔ بلکہ اب جبکہ پہلی مرتبہ وہ دونوں اکیلے تھے تو ڈیڑھ دن پہلے کا وہ خوب صورت لمحہ جس نے ان دونوں کو ایک کیا تھا وہ بڑے ہی خاص انداز میں یاد کرنے کا تھا۔

''زرگل کار لے کر واپس آ رہا ہے۔'' تم یہ سب سامان دیکھ لو۔ اس بار تم بھی ساتھ جاؤ گی۔ جو بھی کمی بیشی ہے۔ لسٹ بنا لو۔'' وہ ہاتھ جھاڑتا ہوا نکل گیا۔

رعنین حیرت سے اس کی پشت کو دیکھ رہی تھی۔ میران نے تو نظر اٹھا کر اسے دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کی تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا۔ میران کی ہدایات کو ذہن میں دہراتے دھیان سامان کی طرف لگایا۔ مردوں کی شاپنگ تو ایسی ہی ہو سکتی تھی۔ وہ لوگ چولہے کے علاوہ صرف پلیٹس اور گلاس ہی یاد رکھ پائے تھے۔ جبکہ پکانے کے لیے توا، دیگچی، تھال وغیرہ کی ضرورت تھی۔ اس نے موبائل میں لسٹ نوٹ کرنا شروع کی۔ اندر آئی۔ ایک نظر پلنگوں پر ڈالی۔ چادریں اور اوپر ڈالنے کے کمبل کھیس بھی خریدنے تھے۔ واش روم کا کچھ سامان تھا۔ وہ سنجیدگی سے سوچتی گئی اور نوٹ کرتی گئی۔ کھانے پینے کی ضروری اشیاء بھی نوٹ کیں۔ زرگل ابھی نہیں آیا تھا۔ وہ اندر آئی۔ میران اپنا سوٹ کیس کھولے کھڑا تھا۔

''مجھے اس کا پاسورڈ معلوم نہیں تھا۔ میں سیٹ کر دوں؟'' وہ جلدی سے قریب آئی۔

''ہوں۔'' وہ اس بار بھی بنا دیکھے تولیہ نکال کر باہر چلا گیا۔

وہ ایک مرتبہ پھر پلٹ کر پشت دیکھتی رہ گئی۔ اب تو واضح ہوگیا تھا کہ وہ اس سے بات ہی نہیں کر رہا۔ وہ ایک گہرا سانس لیتے سوٹ کیس کی طرف متوجہ ہوئی۔ ابھی چند ایک چیزیں ہی سیٹ کی تھیں کہ زرگل واپس آ گیا۔

''چلو۔'' اس نے دروازہ بجا کر متوجہ کیا۔ رعنین نے ایک نظر سر اٹھا کر دیکھا، وہ اپنے موبائل پر جھکا تھا۔ رعنین نے سوٹ کیس کا ڈھکن بند کیا۔

''برقع اوڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنی کوئی پردے والی چادر ہے تو۔''

''ہاں ہے۔'' وہ دل میں شکر پڑھتی فوراً وارڈروب کی طرف گئی۔ اور اپنے سامان میں سے اپنی سفید کڑھائی والی چادر نکال کر اوڑھ لی اور چہرا

بھی ناک تک چھپالیا۔

ٹیکسلا کے بازار میں انہیں تین گھنٹے لگ گئے تھے۔ اس مرتبہ وہ چھوٹا بڑا سب سامان مکمل کر کے آئے تھے۔ زرگل بے چارہ بری طرح تھک چکا تھا لیکن ماتھے پہ شکن تک نہیں آئی۔ میران نے گھر کے دروازے پر جب اس سے اجازت چاہی وہ تب بھی اسے برا بھلا کہہ رہا تھا کہ اس کی ضد کی وجہ سے اتنے عجلت میں سب کچھ ارینج کرنا پڑا۔ جبکہ وہ اس کے غصے پر بھی ہنستا ہی رہا تھا۔ رعنین نے اس ہنسی اور نوک جھونک کو اپنے حق میں اچھا محسوس کرتے اپنی ہنسی دوپٹے کی اوٹ میں چھپائی۔ میران کو اپنے اور اس کے لیے تنہائی چاہیے تھی۔ جو بالآخر دوسرے دن سہ پہر ڈھلنے تک میسر آ گئی تھی۔

☆☆☆

"کیا خبر ہے۔؟" یعقوب اور محبوب ایکدم مستعد بیٹھے سامنے کھڑے شخص کو دیکھ رہے تھے۔

"خان۔ وہ جس کار میں بھاگا تھا وہ ناران میں پائی گئی۔ ایسا لگتا ہے آگے وہ کسی دشوار گزار راستے کی طرف گیا ہے۔ جہاں کے لیے جیپیں ہی ہائیر کرنی پڑتی ہیں۔"

"ہوں۔" بات صاف سمجھ میں آرہی تھی۔ ناران سے آگے کے سفر مشکل اور دشوار تھے۔ ذاتی کار کا سفر عام آدمی کے بس کی بات نہ تھا۔ یعقوب اور محبوب نے آگے جاتے راستوں میں سے آسان سفر کے امکان دماغ سے نکالتے مشکل راستوں پر توجہ مبذول کی تو دو ہی جگہیں ایسی سمجھ میں آئیں جہاں الفر کے چھپے ہونے کا امکان تھا۔ ایک گلگت کو جاتا راستہ، دوسرا کوہستان کو۔"

"دونوں جگہ آدمی روانہ کر دو۔" یعقوب نے چھوٹے بھائی کو آرڈر دینے کے انداز میں دیکھا

"ایک بات اور بھی ہے خان۔" اس آدمی کی بات ابھی مکمل نہ ہوئی تھی۔ دونوں نے چونک کر سر اٹھایا۔

"خان، وہ ابراہیم خان کے گھر صرف اس کی بیٹی ہی نہیں، ایک بھانجی بھی رہتی ہے۔"

"نہیں تو......" محبوب خان فوراً بول اٹھا۔ "کل صبح ہی تو عورتیں لے کر گئے ہم۔ انہوں نے خود بتایا ملازموں کے علاوہ صرف دو بڑی عمر کی عورتیں تھیں۔ ایک اس کی بیوی ایک بہن۔"

"جی خان۔ یہی بیوہ بہن اپنی چھوٹی سی بچی بھی ساتھ لائی تھی۔ اب وہ بھی جوان اور کنواری ہے۔"

"تو ہماری عورتوں کو وہ نظر کیوں نہیں آئی۔"

"جس طرح ابراہیم خان نے بیٹی بھگا دی، اس کو بھی ساتھ۔"

"نہیں خان۔ میں نے پتا کروایا ہے۔ ایک تو ابراہیم خان نے ہم سے جھوٹ بولا تھا۔ اس کی بیٹی کا نکاح پہلے نہیں ہوا تھا، کل صبح جلدی میں پڑھوا کر ان دونوں کو بھگایا گیا ہے۔ لیکن بھانجی ساتھ نہیں تھی۔ وہ حویلی میں ہی ہے۔"

"ہوں......" یعقوب خان نے معنی خیزی سے بھائی کی طرف دیکھا۔

"الفر خان کا جلدی ہاتھ آنا بہت مشکل ہے۔ وہ اگر پہاڑوں میں جا چھپا ہے تو ڈھونڈ نکالنا فی الحال تو بہت مشکل ہے۔ بلکہ مجھے لگتا ہے جب برف باری میں راستے بند ہوں گے، اسے تب وہیں گھیر کر ماریں گے۔ کہیں بھاگ ہی نہیں پائے گا۔"

☆☆☆

دوپہر کا کھانا انہوں نے شاپنگ کے دوران ایک ریسٹورنٹ میں کھایا تھا۔ زرگل کے چلے جانے کے بعد میران گیٹ بند کر کے اندر آیا تو پیچھے پیچھے آتی رعنین کی طرف اس کا بالکل دھیان نہیں تھا۔ کمرے میں آ کر بھی وہ کمر پہ ہاتھ رکھے سامان کو دیکھ رہا تھا۔

"یہ سب کام تو ابھی ہو جائے گا۔" اس نے چادر اتار کر کرسی پر پھینکی اور دوپٹا اٹھا لیا۔ دو پلنگ کمرے کے سینٹر میں ملا کر رکھے گئے تھے۔ میٹرس بھی بچھا دی گئی تھی۔ رعنین نے بیڈ پر رکھے شاپر کی طرف ہاتھ بڑھایا جس میں نئی بیڈ شیٹ رکھی تھی

"چائے بنانا آتی ہے؟" میران کا لہجہ بالکل

متوازن تھا۔ وہ چونک کر پلٹی لیکن سامنا اس کی ایکدم سپاٹ، بے تاثر صورت سے پڑا۔ رعنین نے بھی سنجیدگی سے سر اثبات میں ہلایا۔

"سامان موجود ہے نا۔ اگر بنالو تو......" وہ رک گیا۔

"ہوں......"

وہ شاپر وہیں چھوڑ کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔ سہ پہر بھی اب تو تقریباً ڈھل چکی تھی۔ کچھ ہی دیر میں شام ہونے والی تھی۔ وہ رات کے کھانے کے متعلق بھی سوچ رہی تھی۔ چائے بنانے کے دوران اسے کمرے میں پلنگ گھسیٹنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں لیکن کوئی مداخلت نہیں کی۔ اور جب دو کپ چائے اور کیک پیس پلیٹ میں سجا کر اندر آئی تو دروازے میں ہی ٹھٹک کر رکی۔ اندر سے ناگواری کی لہر سی اٹھی جو بالکل بے اختیاری تھی۔ ایسی محسوسات کا تعلق ہمارے لاشعور سے ہوتا ہے۔ ہم خود بھی بعد میں سمجھ پاتے ہیں کہ ناگواری یا خوشگواری کا یہ تاثر کیوں ابھرا۔ اس نے سائیڈ ٹیبل پر ٹرے رکھی اور کرسیوں پر پڑا سامان سمیٹنے لگی۔ میران نے سینٹر میں رکھے آپس میں ملے ہوئے دو پلنگوں کو الگ الگ کر دیا تھا۔ اب ایک پلنگ کمرے کی داہنی دیوار سے لگا تھا اور دوسرا بائیں ہاتھ کی دیوار سے لگا تھا۔ سائیڈ ٹیبلز درمیان میں حائل تھیں۔ اور دروازے والی دیوار کے ساتھ کرسیاں لگا دی تھیں۔

رعنین نے بکھرا ہوا سامان باہر برآمدے میں رکھی پلاسٹک کی میز پہ رکھا اور اندر جا کر دونوں پلنگوں پر چادریں بچھا دیں۔ سرہانے کے کور چڑھائے۔ دونوں پلنگوں پر سرہانے رکھ کر اپنا کپ اٹھا کر واپس کچن میں آ گئی۔ کچن کی سلیب سے ٹیک لگا کر اپنا کپ ختم کیا۔ کرنے کے لیے کام بہت تھے۔ اس نے ذہن میں کچھ ترتیب دیا اور برآمدے میں آ کر سامان میں سے کچن کی چیزیں الگ کر کے کچن میں سیٹ کیں۔ اور کمرے کی الماری میں رکھنے والا سامان اور ایک پلاسٹک کی کرسی لیے دوسرے کمرے میں آ گئی۔ باہر مغرب کی اذان سنائی دینے لگی تھی۔ پہلے اس نے وضو کر کے نماز پڑھی، یہ خیال بھی تب آیا کہ جائے نماز بھی نئی لینی ہے۔ فی الحال اس نے چادر بچھا کر کام چلا لیا تھا۔ اس دوسرے کمرے میں لکڑی کی الماری تھی۔ نماز کے بعد اس نے الماری کھولی اور اب وہ الماری کو زیادہ اچھی طرح سیٹ کر پا رہی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے تو بس یونہی اندر رکھ دیا تھا۔

قریب ایک، ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ یہاں سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں آئی تو میران سامنے پلنگ پر گہری نیند میں سویا ہوا تھا۔ ایک بازو آنکھوں پہ رکھے شاید روشنی سے بچنے کی کوشش تھی۔ رعنین نے ایک نظر سامنے لگے بلب پہ ڈالی اور لائٹ آف کر کے باہر نکل آئی۔ دوسرا کمرا بالکل خالی تھا۔ اس نے دو کرسیاں اور پلاسٹک کی میز وہاں سیٹ کر دی۔ رات کے آٹھ بجے تھے۔ اور میران ابھی ابھی سویا تھا اور جیسی دن بھر کی تھکاوٹ رہی تھی۔ امکان یہی تھا کہ صبح تک اس نے سوئے ہی رہنا تھا۔ کچھ پکانے کا خیال رعنین نے خود ہی ترک کر دیا۔ وہ خود بھی بہت تھک چکی تھی۔ کچھ دیر تک یونہی موبائل استعمال کیا۔ اور جب جمائیاں آنے لگیں تو گھر کا مین گیٹ اچھی طرح بند کر کے خود بھی کمرے میں آ گئی اور بنا لائٹ آن کیے ہی اپنے پلنگ پر جا لیٹی۔ سوچیں تو بہت تھیں، اور معلوم نہیں کیوں پر جوں جوں وقت گزر رہا تھا بجائے آرام محسوس کرنے کے بوجھ تھے کہ دل پر بڑھتے ہی جا رہے تھے۔ اس نے زبردستی پلکیں موندیں۔ کاش کہ الٹی سیدھی سوچیں بھی کسی سوئچ آف کرنے جیسی بند کی جا سکتیں۔ خوشی نئی نئی تھی پر کیا پتا تھا اپنی خوشی کو اپنی ہی نظر لگنے والی ہے۔ اور اب یہ نیا نیا غم۔ اُف۔ برداشت کا یہ نیا سبق تو بڑا ہی مشکل تھا۔ کیسے سہہ پائے گی۔ میران اپنا ہو کر بھی اب اپنا نہ رہا تھا۔ اس نے سستی بھری کروٹ دیوار کی جانب پھیری پلکیں پہلے نم ہوئیں اور پھر اسی زاویے پر لیٹے لیٹے ایک تواتر سے آنسو جو بہنا شروع ہوئے تو کنپٹی تک جاتی لکیر دیر تک بھیگتی ہی رہی۔

☆☆

باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ

طیبہ ہاشمی

آنکھوں

digest library.com

"دیکھیں ناما! ماطر نے پھر میری شرٹ پہن لی ہے۔ اب میں اسے کچھ کہوں گا تو آپ پھر غصہ کریں گی۔"

میں جو ڈائننگ ٹیبل کی کرسی پر بیٹھی سبزی کاٹ رہی تھی آدی کی بات پر چونکتے ہوئے ادھر دیکھنے لگی جہاں وہ کچن کے دروازے کے آگے بنیان پہنے غصے میں کھڑا تھا۔ میں جانتی تھی سب اس نے جان بوجھ کر کیا ہوگا۔ وہ تھا ہی ایسا۔ دونوں بھائی کسی نہ کسی بات کو لے کر جھگڑتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی تو میں ان کے لڑائی جھگڑوں سے زچ ہو جاتی ہے۔

"میں جانتا ہوں آپ نے اسی کا ساتھ دینا ہے۔" مجھے معلوم تھا کہ وہ ایسا ہی کچھ بولے گا۔ دونوں میں جب بھی کبھی کچھ جھگڑا ہوتا تھا میں جس کا ساتھ دیتی دوسرا یہی بات کہتا کہ آپ نے اسی کا ساتھ دینا ہے۔"

"کیوں بیٹا، میں کیوں کسی غلط بات پر اس کا ساتھ دوں گی۔"

میں کرسی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور پھر سنک سے سبزی والے ہاتھ دھونے کے بعد اس کا ہاتھ پکڑے روم میں چلی آئی۔ میں نے اس کی وارڈ روب سے دوسری شرٹ نکال کر اس کے آگے رکھ دی۔

"میں جانتی ہوں بیٹا، وہ اکثر غلطی پر ہوتا ہے مگر ہے تو تمہارا چھوٹا بھائی نا!"

"اسی لیے تو میں کہہ رہا ہوں آپ نے اسی کا ساتھ دینا ہوتا ہے۔"

وہ مجھے شکوہ بھری نظروں سے گھور رہا تھا اس کے دیکھنے پر میں مسکراتے ہوئے بولی۔

"ساتھ نہیں دیتی بس یہ کہتی ہوں کہ بہن بھائیوں میں یہ سب چلتا رہتا ہے۔"

میری بات کے جواب میں وہ غصے میں بولا کچھ نہیں بس شرٹ پکڑے باتھ روم میں چلا گیا تو میں کچھ سوچتی واپس کچن میں چلی آئی کیونکہ میں جانتی تھی تھوڑی دیر میں شام ہونے والی ہے اور ارسلان کے آنے سے پہلے مجھے کھانا تیار کرنا ہے۔

شام میں ارسلان تھکے ہارے صوفے پر جیسے ڈھے سے گئے۔ میں جو ڈائننگ ٹیبل پر برتن سیٹ کر رہی تھی ان کے یوں صوفے پر بیٹھنے پر تیزی سے ان کی طرف بڑھی۔

"کیا بات ہے طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟" میں نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے فکر مندی سے پوچھا۔

انہوں نے بڑی تھکی تھکی نظروں سے میری طرف دیکھا میں جو ان سے بے انتہا محبت کرتی تھی۔ ان کی معمولی سی تھکن بھی مجھے پریشان کر دیتی تھی اور یہ بات وہ اچھے سے جانتے تھے اس لیے یکدم میرے پریشان ہونے پر انہوں نے اپنے چہرے پر مسکراہٹ لانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"ارے ایسی کوئی بات نہیں ہے امبر۔ تم یونہی پریشان ہو رہی ہو۔"

"یوں ہی تو نہیں ہو رہی۔"

میں نے بغور ان کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وجہ تو کچھ کچھ میں بھی جانتی تھی۔ دراصل ان کا آج کل اپنے بھائی کے ساتھ بزنس کو لے کر کوئی مسئلہ چل رہا تھا۔

"اگر جانتی ہو تو پھر..... اگر کچھ ٹھیک نہیں بھی ہے تو ہو جائے گا۔ بہت تھک گیا ہوں ایک کپ چائے ہی پلا دو۔" انہوں نے محبت سے میرا ہاتھ دبایا اور پھر چھوڑ دیا۔

میں جو انہیں ہر وقت خوش دیکھنا چاہتی تھی انرجی سے بھرپور دیکھنا چاہتی تھی۔ ان کی خوشی کی خاطر مسکراہٹ ہونٹوں پر سجاتے اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور سوچوں سے بھرپور قدم اٹھاتی کچن کی طرف چلی آئی۔

☆☆☆

ہماری شادی کو بائیس سال ہونے کو آئے تھے ویسے یہ عرصہ کچھ کم تو نہیں ہوتا۔ مگر جہاں محبت ہو وہاں یوں ہی لگتا ہے جیسے کچھ پل میں زمانے گزر گئے ہوں۔ ارسلان سے میری محبت کی شادی تو نہیں تھی۔ مگر ان سے مل کر یوں لگا ایک جنم کی محبت تو بہت ہی کم ہے۔

ہم سات بہن بھائی تھے۔ پانچ بہنیں دو بھائی۔ امی ابا جی انتہا کے محبت لٹانے والے۔ ہم ساتوں بہن بھائیوں میں محبت بھی بہت تھی۔ اور جھگڑے بھی اکثر ہوتے رہتے تھے مگر کسی کو کاٹ کر اپنا راستہ بنانا ایسی سوچ کسی کی بھی نہ تھی۔

میری جب شادی ہوئی تو مجھے لگتا تھا میں اپنے بہن بھائیوں کے بغیر کیسے زندہ رہوں گی۔ مجھے تو سوائے چائے کے بنانا بھی کچھ نہیں آتا تھا۔ میری تینوں بڑی بہنوں نے مجھے کبھی کسی کام کو ہاتھ نہیں لگانے دیا تھا۔ شادی کے بعد یوں ہی لگا جیسے زندگی کسی قید خانے میں بدلنے والی ہے اگر ارسلان کی جگہ کوئی اور مرد میری زندگی میں آیا ہوتا تو شاید زندگی قید خانے سے بھی زیادہ بدتر ہوتی۔

ارسلان تین بہن بھائی تھے۔ فیضان اور ماریہ دونوں ارسلان سے چھوٹے تھے۔ میں اکثر سوچتی تھی ان کے گھر میں کتنی خاموشی ہے کوئی کسی سے زیادہ بات نہیں کرتا۔ ہر کوئی چپ چاپ اپنے اپنے کاموں میں مگن رہتا ہے۔ اور ہمیں ہمیشہ عادت تھی ہر معاملہ بہن بھائیوں سے ڈسکس کرنے کی۔ مگر یہاں اکٹھے بیٹھتے ہی نہیں تھے۔

شروع شروع میں تو میں اکثر پریشان ہو جاتی۔ ارسلان آفس میں ہوتے تھے میں سارا دن اکیلی کبھی لان میں کبھی لاؤنج میں۔ اور پھر میری ساس اور سسر کی بے وقت موت نے جیسے زندگی ہی بدل دی اس گھر میں جو تھوڑا بہت تازہ ہوا کا جھونکا آتا تھا وہ دریچہ بھی بند ہو گیا۔

میں نے اور ارسلان نے فیضان اور ماریہ کو ماں اور باپ کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ دونوں کی شادیوں پر ارسلان نے دل کھول خرچا کیا اور پھر جب جائیداد تقسیم کرنے کا وقت آیا تب بھی ارسلان نے انصاف سے کام لیتے ہوئے بہن کو مکمل حصہ دیا اور خود دونوں بھائیوں کے حصے میں الگ الگ مکان اور ایک فیکٹری آئی۔

مجھے اس دن پتا چلا جو انسان خاموش رہتا ہے جس دن بولتا ہے تو کتنا خطرناک ہوتا ہے۔

"اگر فیکٹری اکٹھی رکھنی ہے تو سارے اکاؤنٹس میں خود دیکھوں گا۔"

فیضان کے منہ سے یہ باتیں سن کر میرے تو ہوش ہی اڑ گئے۔ کیسے بات کر رہا تھا وہ اپنے بڑے بھائی سے! جس نے کبھی انہیں ماں باپ کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔

فیضان کی بات پر ارسلان نے یوں میری طرف دیکھا جیسے اسے اعتبار نہ رہا ہو۔ کافی دیر وہ خاموش کھڑے رہے۔ اپنوں کی دی ہوئی چوٹ اتنی جلدی سنبھلنے نہیں دیتی مگر وہ بہت ہمت والے تھے۔

تھوڑے توقف کے بعد بڑے تحمل سے بولے۔

"تم میرے چھوٹے بھائی ہو۔ مجھے مکمل اعتبار ہے تم پر۔ جیسے چاہتے ہو ویسا ہی ہوگا۔"

لیکن جب بہن بھائیوں کے دلوں میں بدگمانی جگہ بنا لے تو وہاں کچھ بھی ممکن ہوتا ہے۔

ہم نے تو اپنا بچپن اور اپنی جوانی دیکھی تھی۔ بہن بھائیوں کی محبت سے گندھی ہوئی اس لیے شاید اعتبار مشکل ہو رہا تھا۔ میں ہمیشہ اپنے بچوں کے چھوٹے چھوٹے جھگڑوں پر زیادہ پریشان نہیں ہوتی تھی بلکہ ان جھگڑوں میں اپنے بہن بھائیوں کو کھوجتی رہتی تھی۔ اپنے بچوں میں اپنی بہن بھائیوں والا پیار چاہتی تھی۔ کیونکہ واحد بہن بھائیوں کی محبت ہوتی ہے جو ہمیشہ ایک کنبے کو جوڑے رکھتی ہے ورنہ تنکے کی طرح پورے خاندان کو بکھرتے دیر نہیں لگتی۔

غرض سے تو کوئی رشتہ بھی پاک نہیں ہوتا۔ یہ ہمارے اختیار میں ہوتا ہے ہم اس رشتے کو کتنا مجبور کر سکتے ہیں اور اسے کتنی آزادی دے سکتے ہیں۔

☆☆☆

فیکٹری میں مستقل خسارے میں جا رہی تھی۔ دو تین دفعہ ارسلان نے بات کی مگر وہ اتنے بیگانے انداز میں بات کرتا جیسے ان کے بڑے بھائی نہیں کوئی پارٹنر ہیں۔

اس دن میں نے سوچا بہن بھائیوں میں جھگڑے ہوں تو پیار بھی ہوتا ہے اور جہاں جھگڑے نہیں ہوتے وہاں پیار بھی نہیں ہوتا، مان بھی نہیں ہوتا۔ یہ پیسہ یہ جائیداد یہ ساری ثانوی چیزیں ہیں اصل میں رشتوں میں خلوص ہو تو نقصانات بھی محبت سے برداشت ہو جاتے ہیں۔

میرے بچے جب جھگڑتے ہیں تو میں اوپر سے خفا ہوتی ہوں مگر اندر سے میں مطمئن ہوتی ہوں کہ ان میں محبت ہے۔

طٰہٰ کی معمولی تکلیف بھی آدمی کو پریشان کر دیتی ہے اور رولیحہ دونوں بھائی دو منٹ بھی لیٹ ہو جائیں تو مجھ سے پہلے ٹیرس پر کھڑی ہو کر ان کی راہ تکنے لگتی ہے۔ یہی تو محبت ہے جس کا کوئی مول نہیں ہوتا۔

انسان اپنی مرنے کی آخری سانس تک اپنے ان عزیز رشتوں سے جدا نہیں ہو سکتا۔ آخری سانس تک نظر ان چہروں کی منتظر رہتی ہے اور پھر جن کی نظر منتظر ہو ان کے لیے دل کو بدگمانی کی منزلوں تک لے جانے کی کیا ضرورت ہے۔

☆☆☆

میں چائے کا کپ پکڑے کچن سے باہر نکل آئی ہوں۔ ارسلان کسی کے ساتھ فون پر بات کر رہے ہیں۔

"کوئی بات نہیں۔ میں اسے اتنا مارجن دوں گا کہ واپسی اس کے لیے مشکل نہیں ہوگی۔"

میں نے چائے کا کپ ٹیبل پر رکھ دیا۔

ارسلان نے فون بند کرنے کے بعد میری طرف دیکھا اور مسکرا دیے۔ میں ان کے مسکرانے سے ہی دوبارہ زندہ ہو گئی ہوں۔

اچھا ہے وہ فیضان کو ایک موقع دے رہے ہیں کیونکہ یہ رشتے بہت انمول ہوتے ہیں۔ پوری دنیا میں ان رشتوں کا کوئی نعم البدل نہیں ہوتا۔

☆☆

اُمِ طیفور

ہمنوا کر دل وجاں ہم

پچھلی قسط کا خلاصہ

حویلی کے مکین پنڈ والوں کی نگاہ میں معتبب ٹھہرتے جا رہے تھے۔خانم کو آٹھواں مہینہ لگ چکا تھا۔

چوہدری شہاب الدین کے متواتر مسیج مل رہے تھے حسنات کو جس میں انہوں نے حسنات کو یقین دلا دیا تھا کہ خانم آوارہ اور بدچلن ہو چکی ہے۔

مہرباں اتنا جو ہار ہو گیا تھا کہ معاملات کا اندازہ کر چکا تھا۔وہ تذبذب کا شکار تھا۔

چوہدری شہاب الدین نے اسے بھی خانم کے خلاف اکسانا شروع کر دیا تھا۔

قاسم جب حویلی پہنچا تو سامنے بیٹھا بچہ دیکھ کر چونک گیا وہ بہو قاسم جیسا تھا۔

وہ ماضی میں پہنچ جاتا ہے جب اس کی سنہری سے شادی کو دو تین سال ہو چکے تھے۔شہر والی کوٹھی میں وہ اکثر جا کر رہتا تھا۔وہاں اسے فائزہ نامی لڑکی پسند آ گئی تھی۔اس کے والدین حیات نہیں تھے اور وہ اپنے چچا کے ساتھ رہتی تھی۔قاسم نے فائزہ کو محبت کا جھانسا دے کر شیشے میں اتار لیا تھا اس کے چچا فائزہ کے کہنے پر قاسم سے اس کی شادی کر دیتے ہیں اور ملک سے باہر سیٹل ہو جاتے ہیں۔

فائزہ پریگنٹ ہو جاتی ہے۔قاسم کو ہر حال میں بیٹا چاہیے ہوتا ہے۔

فائزہ کے یہاں بیٹا پیدا ہوتا۔دونوں بہت خوش ہوتے ہیں لیکن کچھ ماہ بعد ان کا بیٹا اغوا ہو جاتا ہے۔لاکھ کوششوں کے باوجود نہیں ملتا۔

فائزہ دوسری بار پریگنٹ ہوتی ہے لیکن اس بار وہ بیٹی کی ماں بنتی ہے۔وہ قاسم کو فون کرتی ہے۔قاسم سن کر ہی کال کاٹ دیتا ہے۔

جب وہ بیٹی کے ساتھ ہاسپٹل سے گھر پہنچتی ہے تو نوکر کے ذریعے اسے اطلاع ملتی ہے کہ قاسم اسے طلاق دے چکا ہے۔

نوکر کہتا ہے کہ گھر بھی بیچ دیا گیا ہے اور قاسم کا پیغام دیتا ہے کہ وہ اس گھر سے جو چاہے لے جا سکتی ہے۔

فائزہ سارے زیور، نقدی اور سامان سمیٹ کر گھر سے نکل جاتی اور مسیج لکھ جاتی ہے کہ قاسم کی بیٹی کا حق سمجھ کر لے جا رہی ہے۔

بچہ سنہری نے اغوا کروایا تھا۔اور بچے کو یہی باور کروایا تھا وہی اس کی ماں ہے کس مجبوری کی بنا پر یتیم خانے میں رکھا ہوا تھا۔

رات کے اندھیرے میں چوہدری حاکم خانم کے کمرے میں آتا ہے اور ایسے گفتگو کرتا ہے کہ سننے والے کو یہ تاثر ملے کہ خانم اور حاکم دونوں ایک دوسرے کو چاہنے لگے ہیں۔

یہ سب چوہدری شہاب الدین کی چال تھی۔وہ ساری گفتگو ریکارڈ کر حسنات کو سنوا دیتے ہیں۔

حسنات بے گناہ ثابت ہو کر اور جیل سے رہا ہو کر گھر پہنچتا ہے تو وہ سارے ریکارڈ مسیج سن لیتا ہے جو چوہدری

مکمل ناول

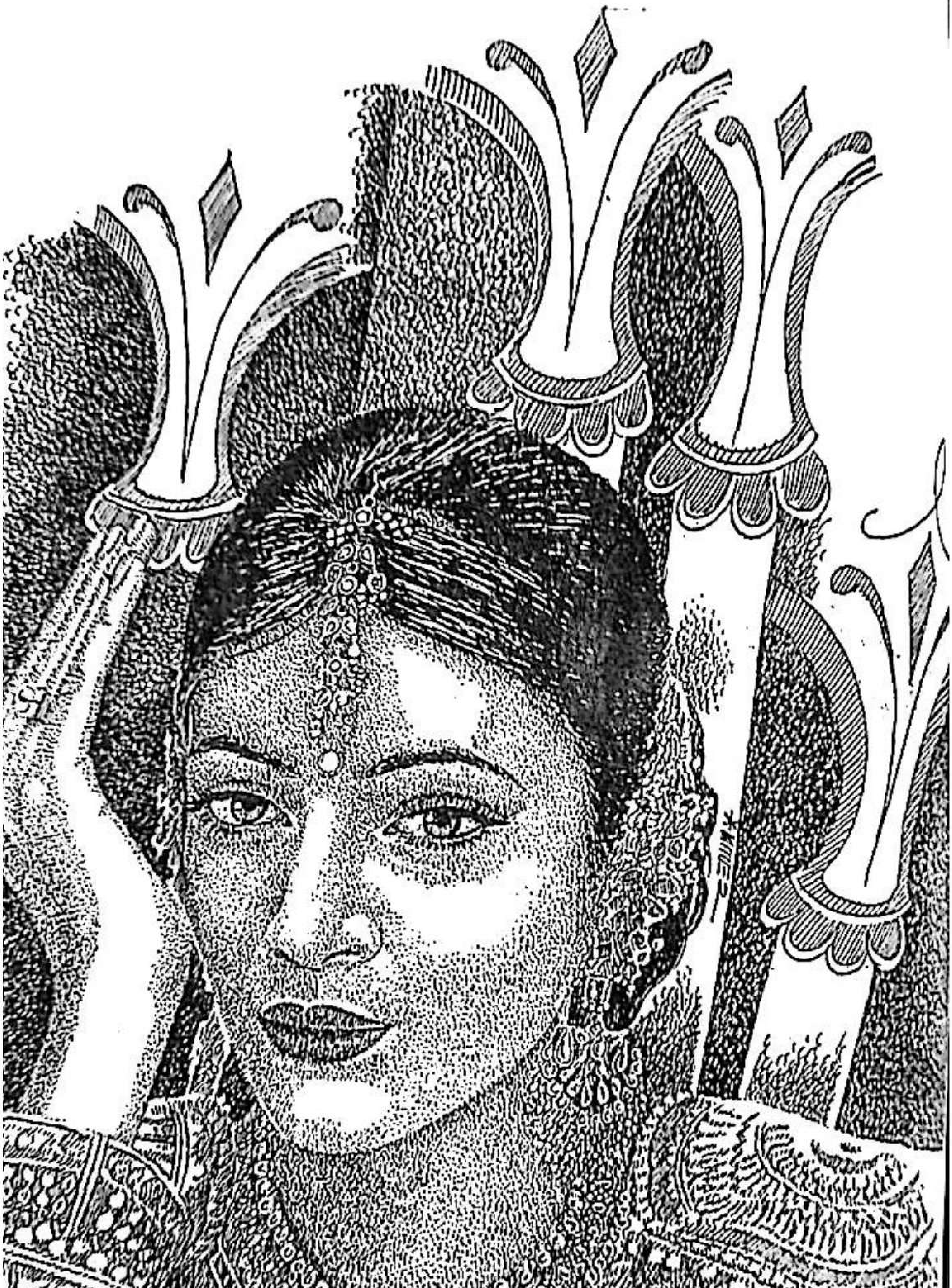

شہاب الدین نے اس کی قید کے دوران بھیجے تھے۔ وہ چوہدری حاکم اور خانم کی بات چیت بھی سنتا ہے۔ اور اسے اپنے باپ کی کہی بات پر یقین ہو جاتا ہے۔

خانم جب حسنات کو فون کرتی ہے تو وہ غصے میں اسے کہہ دیتا ہے کہ خانم اس کے لیے مر گئی ہے اور وہ خانم کے لیے مر گیا ہے۔

بائیسویں قسط

مجھ کو تیری وفا اب نہیں چاہیے
زخم دل کی دوا اب نہیں چاہیے
عمر بھر کے لیے جو ترستی رہی
اس زمیں کو گھٹا اب نہیں چاہیے
مجھ کو صحرا نوردی ہی راس آ گئیں
منزلوں کا پتا اب نہیں چاہیے
آپ ہنستے رہیں، آپ جیتے رہیں
آپ کا در کھلا اب نہیں چاہیے
خوب ہے یہ نوازش کرم آپ کی
آپ کی یہ عطا اب نہیں چاہیے
بھول جائیں مجھے، یاد رکھیں نہ اب
فاصلوں کی قضا اب نہیں چاہیے
اجنبی راستے میرے اپنے ہوئے
اپنے گھر کی فضا اب نہیں چاہیے
باد و باراں مجھے اب ستاتے نہیں
موسموں کی ردا اب نہیں چاہیے
جنگلوں کی خموشی بھی گہری ہوئی
اور حرف صدا اب نہیں چاہیے
خواب لائے ہو اب بیچنے کے لیے
آپ کا شکریہ اب نہیں چاہیے
خوف کے سارے آسیب اپنے ہوئے
حرف ردِ بلا اب نہیں چاہیے
"شائستہ مفتی"

آدھی رات کا سماں تھا۔ پورا گاؤں تاریک اور خاموش تھا۔ فضا میں جھینگر بولتے تھے اور کچی پگڈنڈیوں پر گیدڑ شور مچا رہے تھے۔ کہیں کہیں کسی دکان کے کچے تھڑے کے چھجے پر مدقوق سے بلب کی روشنی کے گرد پروانوں کی ٹولی جھوم رہی تھی۔ سناٹے میں دور سے پکی سڑک سے گزرتی بس کا ہارن فضا کا کلیجہ چیرتا ہوا کانوں میں بھالے کی مانند اترتا تھا!

تب ہی اونچے چوباروں اور چوڑے دالانوں والی حویلی میں ایک ساتھ کئی چیخیں گونج اٹھی تھیں۔

خوب صورت کھڑے نقوش اور گوری رنگت والی آٹھ ماہ کی حاملہ خانم ننگے پیر، رلتی چادر کو سنبھالتی برآمدے پار کرتی حویلی کے گیٹ کا رخ کر رہی تھی۔ اس کے راہ میں آتی حویلی کی ملازمائیں بھی چیخیں دباتے ہوئے ادھر ادھر دبک رہی تھیں۔ کچھ کے حلق سے خوف کے مارے آواز بلند ہو کر خانم کی چیخوں کے ساتھ مدغم ہو گئی تھیں۔ اب تک حویلی میں چوہدری شہاب الدین کی بندوق کا ایک فائر گونج چکا تھا۔ کوئی بھی بندوق کی نال کے سامنے نہیں آنا چاہتا تھا کیونکہ اس سمے جو خناس چوہدری شہاب الدین کے دماغ پر سوار تھا اس نے اپنے پرائے کی پہچان بھلا دی تھی۔ حویلی کے زنان خانے کے ایک کمرے میں دردِ زہ میں مبتلا کشور بے بسی سے سب سن رہی تھی لیکن کر کچھ نہیں سکتی تھی۔ خالہ پیاری بھی اس مشکل گھڑی میں کشور کے پاس موجود نہیں تھیں کیونکہ انہیں خانم کو بچانے کی کوشش کرنے کی پاداش میں چوہدری شہاب الدین نے اناج والے کمرے میں بند کر دیا تھا۔ حویلی کے بچے خوف سے مردانے کے کسی کمرے میں بند ہو چکے تھے!

سراسیمگی نے خانم کی شادابی نچوڑ کے رکھ دی تھی۔ آہنی گیٹ کے سامنے پہنچ کے وہ کشمکش و پیچ میں مبتلا رک گئی تھی۔ باہر کا گھور سناٹا اور پراسراریت

ے قدم باہر نکالنے سے روک رہی تھی۔ تھوک نگلتی وہ رخ موڑے گیٹ کی جانب پشت کیے کھڑی ہو گئی۔ اپنے انجام کی دردناکی نے اس کی آنکھوں سے آنسو رواں کر دیے۔ اسی پل ایک اور فائر گونجا اور چوہدری شہاب الدین عین اس کی ناک کی سیدھ میں بندوق کی نال اس کی جانب کیے آن کھڑے ہوئے۔ ایسا دہلا دینے والا منظر دیکھ کر کونے کھدروں میں دم سادھے دبکی ملازمائیں سسک اٹھیں۔ خانم نے بے بسی سے دونوں بازو نیچے گرا دیے تھے جیسے ہتھیار ڈال دیے ہوں۔ چوہدری شہاب الدین نے معنی خیز مسکراہٹ سے اس کی جانب دیکھا اور نشانہ لیا۔ خانم نے آنکھیں بند کر لیں۔ ملازماؤں نے چادروں کے پلو آنکھوں پر ڈال لیے۔ ابھی فائر ہوا اور کام تمام۔ چوہدری شہاب کی انگلی ٹریگر دبانے کو بے تاب تھی کہ زل کہیں سے بھاگتی ہوئی آئی اور خانم کے آگے دیوار بن کے دونوں بازو پھیلائے کھڑی ہوتی شرر بار نگاہوں سے فائر کرنے والے اپنے دادا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھنے لگی۔ چوہدری شہاب الدین نے نفرت سے دونوں کو دیکھا۔ ان کی انگلی پل بھر کو ڈگمگائی۔ خانم نے ہراساں ہو کر زل کو پرے دھکیلنا چاہا لیکن وہ جم کے کھڑی رہی۔ یہ عمل چند بار دہرایا جاتا رہا حتیٰ کہ ایک آخری فائر داغ دیا گیا۔ حویلی کے زنان خانے اور صحن میں ایک ساتھ چیخیں گونج کر خاموش ہو گئیں!

☆☆☆

قیامت کسی کے اوپر بیت جائے تو وہ ایک حادثہ ہے لیکن جب خود پر بیتے تو روگ بن جاتی ہے۔ اس نے ایسے واقعات ہوتے سنے تھے دیکھے بھی تھے، کیا کچھ نہیں سہہ چکی تھی لیکن وقت نے اس کے زخموں پر مرہم رکھ دیا تھا اور پھر سب سلے زخم دوبارہ ادھڑ گئے اور ان میں تیزاب بھر دیا گیا۔ وہ بے اعتبار کیا ہوئی اس کی ہستی خس و خاشاک سے بھی کمتر ٹھہری۔ اس کا محرم اسے مجرم گردان کر اس سے روگردانی کر گیا تھا۔ وہ زندہ تھی اسے یقین نہیں ہو رہا تھا کیونکہ بس آتی جاتی سانس ہی تو تھی باقی جسم میں کوئی احساس باقی نہیں تھا۔ کسی نے اسے عقب سے ہاتھ بڑھا کر گیٹ سے باہر کھینچ لیا تھا اور وہ زل سمیت حویلی کے گیٹ سے باہر نکل آئی تھی۔ کس نے اسے اور زل کو جیپ میں بٹھایا کب وہ اپنے انتہائی شکستہ وجود کو لیے ایک بار پھر اسی حویلی لکھاں میں داخل ہوئی جہاں سے کچھ عرصہ پہلے ہی سب کے ساتھ بے دخل کی گئی تھی۔ وہ حویلی کے اندر لائی گئی اور زل کے ساتھ چوہدری آفتاب کی حویلی کے ایک کمرے میں بٹھا دی گئی۔ اپنے ہی باپ کے گھر وہ اجنبیوں کی طرح سکڑی سمٹی بچی کو سینے سے لگائے گٹھڑی بنی بیٹھی تھی۔ دماغ جیسے بالکل ماؤف اور سن تھا۔ اس کی حسیات بھی اپنی موجودہ حالت کو سمجھنے سے قاصر تھیں۔ پھٹی پھٹی نگاہیں فرش پہ گاڑے وہ اپنے دماغ میں گونجتے فائر کے دھماکے اب تک محسوس کر رہی تھی۔ نگاہوں کے سامنے بار بار وہ منظر آ کر ٹھہر رہا تھا جب چوہدری شہاب اس پر بندوق تانے ٹریگر پہ انگلی رکھے دبانے والے تھے۔ اس نے ہمت ہار دی تھی۔ وہ مرنے کے لیے تیار تھی۔ اسے اب جی کر کرنا بھی کیا تھا۔ مر جاتی اور اپنی عزت پر لگا داغ لیے قبر کی مٹی اوڑھ لیتی۔ قصہ خلاص!

اس کے ذہن نے سوچنا شروع کیا۔ اسے یاد آنا شروع ہوا کہ وہ حسنات کی زہر میں بجھی باتیں سن رہی تھی۔ وہ چھلنی وجود لیے خود کو یقین دلانے کی کوشش کر رہی تھی کہ یہ سب وہم ہے اس کی سماعت کا دھوکا ہے لیکن اصل وہم یہ ثابت ہوا کہ اس نے خود کو اہم جانا۔ اسے لگا تھا کہ اس کے آنسو بہانے کی نوبت نہیں آئے گی۔ حسنات تو اس کی شہ رگ ہے وہ اس کی سانسوں کے زیر و بم سے جان جاتا ہے کہ وہ اذیت میں ہے، اسے کوئی دکھ ہے۔ وہ اب بھی وہ اسی خوش فہمی میں تھی۔ لیکن چند باتوں کے تیر چلے اور اس کے خوابوں کے غبارے کی ہوا نکل گئی۔ وہ فلک بوس چوٹی پہ محبت کے خیمے میں بسائی گئی تھی اور وہاں سے لہرائی ہوئی سخت ظالم پتھریلی زمین پر آ

گری تھی جہاں اس کے وجود میں گندھی اعتماد، بھروسے اور محبت کی کرچیاں اس طور بکھری تھیں کہ انہیں سمیٹ کر اس کے مردہ لاشے کے ساتھ دفنایا نا جاسکے گا۔!

وہ ریسیور رکھ چکی تھی۔ الٹے قدموں خود کو پیچھے کی طرف گھسیٹنے کی کوشش کی۔ ٹانگوں میں سکت تھی نہ وجود میں توانائی پھر بھی وہ اس فون سے دور ہونا چاہتی تھی۔ وہ اپنے بستر میں لحاف میں منہ چھپا کر لیٹنا چاہتی تھی۔ ہوسکتا ہے تھوڑی سی نیند لینے سے اس کا یہ بھیانک خواب اپنی موت آپ مرجائے!

"ہاں یہ سب وہم ہے، دھوکا ہے مجھے سو جانا چاہیے جب اٹھوں گی تو سب ٹھیک ہوگا۔" یہی سوچتی وہ قدم پیچھے لے رہی تھی جب کسی سرد چٹان سے وجود سے ٹکرائی۔ حاکم کا خوف یک دم عود کر آیا بجلی کی تیزی سے پلٹ کر دیکھا تو چوہدری شہاب الدین کھڑے اسے خوں خوار نگاہوں سے تک رہے تھے۔ وہ بوکھلائی لیکن پھر خیال آیا حسنات کی شکایت انہی سے کرے شاید وہ اسے سمجھائیں۔ انہیں تو سب خبر تھی۔

"تایا جی۔ وہ حسنات کو نا جانے کیا ہوا ہے۔ وہ آپے سے باہر ہو رہے ہیں۔ شاید جیل میں جانے کی وجہ سے پریشان رہے ہیں نا، تو الٹا سیدھا بول رہے ہیں۔ آپ۔ آپ انہیں سمجھائیں نا میں دوبارہ کال۔ کال ملاتی ہوں۔ آپ بات کریں ذرا۔ انہیں کہیں کہ انہیں غلط فہمی ہو رہی ہے۔ وہ آپ کی سنیں گے تایا جی!"

اتنا کہنے میں اندرونی خلفشار اور خوف کے زیر اثر اس کی حالت غیر ہوگئی تھی۔ اس نے آس بھری نگاہ سے چوہدری شہاب الدین کو دیکھا۔

"اس نے میری ہی تو سنی ہے ذلیل عورت۔ اسے میں نے ہی تو سمجھایا ہے اتنے ماہ کہ اس کی زنانی کیسے چوہدری حاکم کے ساتھ منہ کالا کرتی پھر رہی ہے۔ دیر سے سہی لیکن اسے سمجھ آ ہی گئی۔ اگر کل تو اسے خود ہی ثبوت نہ دیتی تو ہو رہے (نا جانے) کتنا چر (وقت) ابھی مزید سر کھپانا پڑتا مجھے!"

وہ بول رہے تھے۔ ان کی آواز دھیمی تھی گرجتی آواز کی سرسراہٹ خانم کے تن بدن میں جھرجھری دوڑا گئی۔ وہ ان کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی جو بے رحمی کی سرخی لیے اسے گھور رہی تھیں۔ اس نے ایک آخری کوشش کے طور پر اپنا مدعا بیان کرنے کی ناکام کوشش کی۔

"قصور تو بتا دیں میرا کچھ۔ میں نے کیا کیا ہے تایا جی۔ آپ کو بھی پتا ہے کہ حاکم کو میں جانتی بھی نہیں۔ آپ۔ آپ ایسے نہ کریں۔ بہتان بہت بڑا بہت سخت گناہ ہے تایا جی۔ آپ کیوں ایسا کر رہے ہیں!"

الفاظ نہیں نوحہ تھے۔ التجائیں تھیں۔ سادے سے فقرے تھے کیونکہ اس کے پاس ایسا کوئی ذخیرہ محفوظ نہیں رہا تھا جو اس شقی القلب انسان کا دل بدل دیتا۔ اگر اس کی تقدیر میں آزمائش نہیں تو اس کے یہی الفاظ کارگر ہو جائیں گے۔ چوہدری شہاب الدین نے اسے مسکرا کر دیکھا۔ خانم کو معمولی سی تقویت حاصل ہوئی۔ دوسرے ہی پل ایک زوردار چانٹا اس کے نازک گال کو رگڑ کر رکھ گیا۔ وہ الٹ کر فرش پہ گری تھی لیکن گرتے گرتے صوفے ہی تھام لی جس کے باعث وہ سخت چوٹ سے محفوظ رہی لیکن اس کی حالت ہلکے سے دھکے کو بھی سہنے والی نہیں تھی۔ درد کی اٹھتی ٹیسوں کو دباتی وہ سیدھی ہوئی۔ آنکھیں مسلسل ڈبڈبا رہی تھیں۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ اس کی زندگی میں اب کوئی امید کی کرن باقی نہیں رہی۔ اب کوئی نہیں تھا جو حسنات کو بتاتا کہ خانم بدکردار نہیں ہے کیونکہ اس کے بارے میں یہ سب کہنے والا اس کا سگا تایا اور حسنات کا باپ تھا۔ کل جو ثبوت چوہدری شہاب الدین اور حاکم نے حسنات کو فراہم کر دیا تھا اس کے بعد کیا وجہ رہ جاتی تھی کہ حسنات اس کی بات کا یقین کرتا یا کم از کم سن ہی لیتا۔ اس نے اپنے آنسو پونچھے اور ہمت مجتمع کرتی چوہدری شہاب الدین کی جانب دیکھتی ہوئی بولی۔

"اگر آپ کو ایسا لگتا ہے کہ یہ سب کہہ دینے سے حسنات مجھے چھوڑ دیں گے تایا جی، تو آپ غلط ہیں۔ وہ واپس آئیں گے۔ میں انہیں ایک ایک بات بتاؤں گی تایا جی۔ تب تک میں یہیں رہ کر ڈٹ کر حالات کا مقابلہ کروں گی!"

اس کے لہجے کے عزم نے چوہدری شہاب الدین کو ہنسنے پر مجبور کر دیا۔ وہ ہنستے ہوئے خانم کو زہر لگے۔ ہنسنے کے بعد انہوں نے اپنی باچھوں کے گرد جمع ہوئی تھوک کو کندھے پر رکھے صافے سے صاف کیا اور بولے۔

"تجھے کس نے کہا ہے کہ تو نہیں ہوگی۔ تو تو بھاگ چکی ہوگی چوہدری حاکم کے ساتھ۔ اور میں تجھے مجبور کردوں گا ایسا کرنے پر!"

ہولناکی کسے کہتے ہیں؟ زمین شق ہو اور کسی کو زندہ نگل جائے تو وہ کیسا محسوس کرے گا یا آسمان پھٹے اور ان دیکھی آفت بجلی کی مانند سیدھی کسی پر آ گرے۔ خانم کی کیفیت بالکل ویسی ہی تھی۔ وہ بھاگ کر اپنے کمرے میں چلی جانا چاہتی تھی لیکن قدم جم سے گئے تھے۔ وہ اپنی بچی کو سینے میں بھینچ کر بہت سارونا اور چلانا چاہتی تھی لیکن حلق خشک تھا آواز بند تھی۔ چوہدری شہاب الدین اس کی حالت دیکھ حظ اٹھاتے داخلی دیوار کی جانب دیکھنے لگے جہاں ان کی دونالی بندوق ہمیشہ کی طرح سجی تھی۔ وہ بھی بے حد شوق سے شکار کھیلا کرتے تھے اور یہ اسی کی یادگار تھی۔ وہ دیوار کی جانب گئے اور انہوں نے بندوق اتار کر خانم سے بے رحمانہ انداز میں کہا۔

"بھاگ باہر۔ اگر میرے کارتوس ڈالنے تک تو یہیں رہی تو اگلے ایک منٹ میں یہاں فرش پہ تیری لاش ہوگی اور میں سب سے یہی کہوں گا کہ تجھے حاکم کے ساتھ دیکھ لیا تھا سو مار دیا!"

"اور اگر بھاگ جاؤں تو۔" اس نے بے ارادہ کہا تھا۔

"تب بھی یہی کہوں گا کہ تجھے حاکم کے ساتھ دیکھ کر گولی چلائی اور پھر تو اسی کے ساتھ بھاگ گئی!"

وہ قہقہہ لگا رہے تھے اور ساتھ انہوں نے جیب سے کارتوس نکالا اور بندوق میں ڈالنے لگے۔

خانم سمجھ گئی تھی کہ دونوں صورتوں میں اس کے کردار کو داغدار ہی کیا جانا تھا۔ اس نے ایک پل میں فیصلہ کیا تھا بھاگنے کا۔ اپنی جان بچالے تا کہ آبرو بچا سکے۔ اس کی ایک بچی تھی جس کی ماں اس حال میں ماری جاتی کہ اس کے کردار پر بے حیائی کا دھبا ہوتا تو اس ننھی سی جان کا جینا محال ہو جاتا۔ وہ زندہ رہتی تو اس [illegible] سکتی تھی۔ اس کا مستقبل تاریک ہونے سے بچا سکتی تھی۔ لیکن مرنے کے بعد جو سب سے زیادہ نقصان اٹھاتا وہ زنل ہوتی۔ اس لیے اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی جان بچائے گی اور بھاگ جائے گی۔ کہاں، کدھر، کس کے پاس یہ سب سوال غیر ضروری تھے کیونکہ اس نے اس صورت حال کا تصور بھی کب کیا تھا جو آنے والے وقت کا سوچ پاتی۔ اس نے بنا وقت ضائع کیے باہر کی جانب دوڑ لگا دی لیکن چوہدری شہاب الدین خباثت پر اتر چکے تھے۔ عین اسی لمحے انہوں نے فائر کیا جو خانم کے دروازے سے اوجھل ہوتے ہی دیوار کو جا لگا۔ بھاگتی خانم کی سانس جہاں کی تہاں رکی۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ چوہدری شہاب اس کے ساتھ کیسی چال کھیل رہے ہیں۔ اگر مارنا ہی ہے تو بھاگنے کا موقع بھی کیوں دیا اور بھگا دینا چاہتے تھے تو فائر کیوں کیا؟

وہ حواس باختہ زنل کو لینے کمرے کی جانب بھاگی دوسری طرف سے خالہ پیاری افتاں و خیزاں فائر کی آواز سن کر کشور کے کمرے سے نمودار ہوئی تھیں۔ دالانوں میں لٹی پٹی ننگے پیر بھاگتی خانم دکھائی دی تو ہاتھ سیدھا کلیجہ پر جا پڑا۔ انہوں نے پھٹی آنکھوں سے یہ ہوشربا منظر دیکھا کہ چوہدری شہاب الدین ہاتھ میں دونالی بندوق لیے بڑے کمرے سے نمودار ہوئے تھے اور خانم کے پیچھے بندوق تانے تیز قدموں سے چل دیے۔

digest library.com

خالہ پیاری کو اپنی بصارت پر شبہ ہوا آیا جو دیکھ رہی ہیں وہ حقیقت ہے یا بدنما خواب۔ وہ ہوش میں آتے ہوئے چیختے چلاتے ملازماؤں کو آوازیں لگاتیں اسی سمت بھاگیں جس طرف خانم بھاگتی ہوئی جا رہی تھی پیچھے چوہدری شہاب الدین تھے۔ چوہدری شہاب نے دوبارہ اپنی بندوق کا رخ چلتے چلتے خانم کی پشت کی جانب کیا تو خالہ پیاری دور سے ہی انہیں پکارنے لگیں۔

"او چوہدری۔ بے غیرت ہو گیا ہے تو۔ اپنی اولاد کو کون گولی مارتا ہے۔ تیری آنکھوں کی لاج مر گئی ہے چوہدری۔ رک ورنہ میں پورا پنڈ اکٹھا کر لوں گی جو تیری بے غیرتی کا تماشا اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے۔!"

چوہدری شہاب الدین ایسی جرات پہ تن فن کرتے پلٹے اور خالہ پیاری کی جانب بڑھے۔ انہیں ایک مہمان عورت سے ایسی زبان درازی اور بدلحاظی کا توقع نہیں تھی۔ اس وقت اگر وہ شور مچا دیتیں اور رخنہ ڈال دیتیں تو خانم کا کانٹا اٹک جاتا تھا۔ کام سرے پر پہنچ چکا تھا اب وہ رکاوٹ نہیں برداشت کر سکتے تھے۔ وہ خالہ پیاری کے قریب پہنچے تو خالہ پیاری نے انتہائی تنفر سے انہیں دیکھا اور بولیں۔

"اللہ کا خوف کھا چوہدری۔ وہ تیرے پاس تیرے پتر کی امانت ہے۔ اس کے پاس تیری نسل ہے۔ تو کس طرح اسے جان سے مارنے کے در پر ہے۔ قصور تو بتا ذلیل آدمی۔!"

چوہدری شہاب الدین نے آؤ دیکھا نا تاؤ خالہ پیاری کو گدی کے بالوں سے جکڑا اور انہیں ایک طرف دھکیلتے ہوئے لے جانے لگے۔ ساتھ ساتھ بولتے جاتے تھے۔

"میرے پتر نے ہی کہا ہے کہ اس غلاظت کا خاتمہ کروں۔ وہ اس کو چھوڑ چکا ہے جس نے اس کے نکاح میں رہتے حاکم کے ساتھ منہ کالا کیا ہے۔ کل حسنات نے اس کی کرتوت اپنے کانوں سے سنی ہے اور میں اس طوق کو اپنے پتر کے مگلروں اتار کر رہوں گا۔ بجھی مائی۔ اب تو اپنی زبان تالو سے لگا اور میرے رستے میں آنے کی کوشش نہ کر۔ مجھے اپنا کام کرنے دے۔ آج اس کی موت کا دن میں نے مقرر کر دیا ہے تو تو کیا تیرا پیو بھی مجھے روک نہیں سکتا۔!"

ساٹھ کی حدوں کو چھوتی خالہ پیاری میں اتنا دم کہاں تھا کہ چوہدری شہاب الدین کی تیزی کا مقابلہ کر پاتیں۔ وہ انہیں دھکیلتے ہوئے گودام تک لے آئے تھے اور خالہ پیاری اپنے بالوں کی تکلیف کو بمشکل سہتی کئی بار گر گر کے سنبھلی تھیں۔ چوہدری شہاب نے انہیں اندر دھکا دیا اور لوہے کا دروازہ بند کر کے باہر سے کنڈا لگا دیا۔ خالہ پیاری کی ہڈیوں میں اس قدر بھی دم خم کب تھا۔ وہ مقدور بھر کوشش کرتی چلانے لگیں اور دروازہ پیٹنے لگیں۔ ملازمائیں سن کر کان لپیٹے رہیں۔ کون تھا جو چوہدری شہاب کی بندوق کے آگے آتا۔ کشور کے کمرے تک آواز جانا بے سود تھا وہ اس حالت میں کب تھی کہ مدد کر پاتی۔ چوہدری شہاب الدین کے لیے اگلی کارروائی مکمل کرنے کے لیے خالہ پیاری کو اوجھل کرنا ناگزیر تھا کیونکہ وہ کوئی چشم دید گواہ یا ثبوت نہیں چھوڑنا چاہتے تھے!

ایک بار پھر وہ خانم کی طرف لپکے جو اپنے کمرے میں زل کو نہ پا کر بدحواس ہوتی اسے آوازیں دیتی دوسروں کمروں میں ڈھونڈ رہی تھی۔ ایک کمرا اندر سے بند تھا اور خانم اس کا دروازہ پیٹنے لگی اسے اندر سے آتی آوازوں سے اندازہ ہو گیا تھا کہ بچے یہیں ہیں اس لیے زل کے یہاں ہونے کے بھی امکانات روشن تھے۔ وہ اسے پکارتی دروازہ دھڑ دھڑا رہی تھی جب اس کے عقب میں فائر گونجا اور اسے لگا کوئی گولی اس سے محض ایک ڈیڑھ فٹ پرے ہو کر گزر گئی ہو۔ اس کے کان سنسنا اٹھے۔ دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ زندگی میں بہت سے ہولناک دن اور راتیں دیکھی تھیں لیکن ایسی آج تک نہیں دیکھی تھی۔ وہ بے حال تھی سر سے دوپٹا اتر کر کندھے اور پیروں میں رل رہا تھا۔ اسے یاد تھا کہ

اس نے جوتا پہن رکھا تھا لیکن اب نگاہ کی تو وہ ننگا جوتے کے یخ ٹھنڈے فرش پر کھڑی تھی اور یہ ٹھنڈ اس کے پورے جسم میں سرایت کرتی رگوں میں دوڑتا خون جما رہی تھی۔ چوہدری شہاب الدین بندوق لہراتے قریب آرہے تھے۔ ان کی چال میں اس قدر تیزی تھی جیسے ایک جست میں شکار جھپٹ لینا چاہتے ہوں۔ خانم خوف زدہ ہوتی صحن کی جانب بھاگی۔ اس آخری لمحے تک بھی اس کے دل میں کہیں ایک گمان تھا کہ اس کا تایا اسے جان سے نہیں مار سکتا یہ سب محض ڈراوا ہے جو انتہائی نفرت کی وجہ سے ہے۔ لیکن اب اسے یقین ہو رہا تھا کہ چوہدری شہاب الدین اسے قتل کرنے کے درپے ہیں۔

وہ گیٹ کی جانب بھاگی اور اپنے پیچھے پلٹ پلٹ کر زنل کی تلاش میں آنکھیں بھٹکا رہی تھی۔ اس کے عقب میں اسی پل ایک اور فائر ہوا تھا اور وہ ٹھوکر کھاتی بری طرح لڑکھڑا کر گرتی گرتی بچی۔ وہ پھاٹک کے قریب پہنچ چکی تو باہر قدم رکھتے اس کے حواس جھنجھنا اٹھے۔ باہر ہو کا عالم تھا۔ سردی کا زور تھا۔ جھینگروں اور گیدڑوں کی آوازوں نے شور بپا کر رکھا تھا۔ حویلی کے اندر روشنی تھی جب کہ باہر گھپ اندھیرے میں ڈوبی نامانوس فضا اسے ہولا گئی۔ ڈر خوف وسوسوں سے تو اس کی پرانی شناسائی تھی۔ لیکن ابھی اسے اپنی جان بچانے کے لیے یہاں سے جانا ہی تھا وہ پھاٹک کھولنے کے لیے آگے بڑھی تو کنڈا ہٹا دینے کے باوجود وہ اسے کھول نہ پائی۔ مسلسل ہیجان انگیزی کے ساتھ اندر کی جانب زور لگاتے وہ ہانپنے لگی کیونکہ اس کی موت چوہدری شہاب الدین کی صورت سر پر پہنچ چلی تھی۔ وہ پھاٹک کے بھاری بھرکم کنڈے کو پکڑ کر اندر کی جانب کھینچ رہی تھی کہ یکدم اندازہ ہوا کہ پھاٹک باہر سے بند ہے۔ اس سوچ کے آتے ہی اس کے کندھے ڈھیلے پڑ گئے۔ اعصاب جواب دے گئے۔ اس نے اپنی آنکھوں کو میچ لیا۔ وہ جان گئی تھی کہ یہ سب بھی چوہدری شہاب کی پلاننگ کا حصہ ہی تھا۔ اسے مرنا ہی ہوگا تب کہیں جا کر چوہدری شہاب الدین کے سینے میں جلتی نفرت اور بغض کی آگ ٹھنڈی ہوگی۔ وہ بس اسے بھگا بھگا کر مارنا چاہ رہے ہیں لیکن وہ کس قدر بھاگے گی۔ کہاں بھاگ کر جائے گی۔ باہر قدم نکالے گی تو خوف ناک رات اور سرد سناٹے میں کس جانب منہ کرے۔ دھند میں ڈوبی پگڈنڈیوں پر کس دوار کی جانب قدم موڑے؟

اس نے خود کو تیار کیا آنے والی موت کے لیے۔ موت کے بعد ہونے والی بدنامی کے لیے۔ اس گناہ کے ہار کے لیے جو اس کی موت کے بعد اس کی قبر پر ڈلے گا جو گناہ سرے سے اس نے کیا تھا ہی نہیں۔ وہ روتی تو کس کس بات پر؟

حقیقت یہ تھی کہ اس وقت جس شاک سے وہ گزر رہی تھی اس نے اس کے آنسو تک خشک کر دیے تھے۔ اسے اب رونا نہیں آرہا تھا شاید بے بسی کی انتہا پر ہر جذبہ، ہر احساس منجمد ہو جاتا ہے۔ اس نے اپنے دونوں بازو دائیں بائیں گرا کر خود کو قسمت کے حوالے کیا اور چوہدری شہاب الدین کے اگلے ہونے والے فائر کے لیے پیش ہوگئی۔ عین اس وقت جب چوہدری شہاب اس سے چند فٹ کے فاصلے پر آن کھڑے ہوئے تھے اور فاتحانہ مسکراہٹ لیے اس کی جانب بندوق تانی تھی، زنل کہیں جانب سے دوڑتی ہوئی آئی اور ماں کے آگے ننھی سی آڑ کی صورت کھڑی ہوگئی۔ اس کی آنکھوں سے اپنی عمر کے حساب سے نفرت اور غصہ چھلک رہا تھا۔ وہ اپنے دونوں بازو پھیلائے دادا کو یوں دیکھ رہی تھی جیسے انہیں تنبیہ کر رہی ہو۔ خانم نے اس کا ننھا وجود محسوس کرتے آنکھیں کھولیں اور زنل کو اس کی پشت سے اپنے ساتھ لگا لیا۔ ایک میٹھا سا سکون جسم میں اتر گیا۔ مرنے سے پہلے اپنی بیٹی کو دیکھ لینے کا سکون۔ اس کا ریشمی اور بھورے بالوں والا سر جھک کر چومتے خانم نے اسے اپنے آگے سے ہٹانے کی سعی کی لیکن زنل اپنی جگہ سے نہیں ہلی۔ خانم خوف زدہ ہوئی کیونکہ چوہدری شہاب کون سا زنل کی محبت میں گرفتار تھے جو

رعایت دیتے۔ ان کا شیطانی ذہن اس بچی کو بھی بھون ڈالنے پر اکسا سکتا تھا۔ خانم نے ایک بار پھر زل کو دھکیلا لیکن وہ واپس ماں کے سامنے آ کر جم گئی۔

چوہدری شہاب الدین نے نفرت و عداوت کی انتہا پر جاتے دونوں ماں بیٹی کو دیکھا اور بندوق ان کی جانب کیے ایک آنکھ بند کر کے ان کا نشانہ لیا ابھی اچانک عقب سے گیٹ سے کوئی نمودار ہوا تھا۔ لمحوں کی بات تھی اور خانم اور زل کو بازوؤں سے کھینچتا کوئی باہر لے گیا تھا۔ اسی وقت چوہدری شہاب الدین کی بندوق نے فائر کیا تھا اور گولی سیدھا گیٹ کے ستون میں نصب ہوگئی۔ سامنے خانم اور زل موجود نہیں تھیں وہ جا چکی تھیں۔ نا صرف سرخ چوباروں والی حویلی سے بلکہ ان کے بیٹے کی زندگی سے بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ ایک فخر اور غرور کے عالم میں انہوں نے بندوق کو داہنے ہاتھ میں سیدھا تھام کر فرش سے ٹکایا اور طویل سانس خارج کیا۔ بالآخر ایک مدت بعد وہ اپنے منصوبے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ ان کا بیٹا خانم کے سحر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نکل گیا تھا اور خانم ان سب کی زندگیوں سے ہمیشہ کے لیے اوجھل ہو گئی تھی!

☆☆☆

اسے حویلی سے نکال کر لانے والا قاسم تھا۔ وہی تھا جو موقع پر پہنچ کر خانم کو موت کے گھاٹ اترنے سے بچا گیا تھا اور اسے چوہدری شہاب الدین پر بے حد غصہ آ رہا تھا کیونکہ یہ کہیں بھی طے نہیں ہوا تھا کہ خانم کو جان سے مارنا ہے بلکہ اسے حویلی سے باہر نکلنے پر مجبور کرنا تھا تاکہ اس کے کردار پر لگے داغ پر صداقت کی مہر لگ سکے۔ لیکن چوہدری شہاب الدین اپنے اندھے غصے میں خانم کو جان سے مارنے چلے تھے۔ اگر خانم مر جاتی تو اس کی زمین جائیداد سب کچھ حسنات کے نام ہو جاتی اور قاسم ایسا کیسے ہونے دے سکتا تھا۔ اتنی کچی گولیاں تو وہ بھی نہیں کھیل کر بیٹھا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ حیات نے باقی بچ جانے والی چوہدری آفتاب کی زمینوں اور جائیداد کو دونوں بہنوں کے نام منتقل کروا لیا ہے۔ دونوں بہنیں اس بات پر رضامند تھیں کہ اگر انہیں کچھ ہوتا ہے تو بلاشرکت غیرے ان کی کل جائیداد ان کے شوہروں کے نام منتقل ہو جائے۔ اس بات کا علم چوہدری شہاب الدین کو تھا البتہ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ قاسم بھی بے خبر نہیں۔ انہوں نے ہر شے قاسم کی پلاننگ کے عین مطابق کی تھی مگر خانم کو جان سے مار دینے کا فیصلہ ان کا ذاتی اور فوری تھا۔ اپنے بھتیجے کی خباثت سے وہ بخوبی آگاہ تھے انہی کے ہاتھوں پروان چڑھا تھا، وہ جانتے تھے اگر خانم بچ گئی اور حویلی سے زندہ چلی گئی تو قاسم کچھ بھی کرے گا اور اس کی ایکڑوں پہ پھیلی زمین ہتھیا لے گا۔ دوسری صورت میں اگر وہ ماری جاتی تو سب کچھ ان کے بیٹے حسنات کا ہی تھا۔ ایک پنتھ دو کاج والا معاملہ ہو جاتا لیکن قاسم عین وقت پر ان کا منصوبہ تلپٹ کر گیا تھا۔

خانم کو وہاں سے نکال لانے کے بعد وہ سیدھا چوہدری آفتاب کی حویلی میں لے آیا تھا اور اب اسے سکون سے کچھ وقت درکار تھا جس میں وہ تسلی سے اگلے لائحہ عمل کو طے کرتا۔ سنہری حویلی لکھاں کی کرتا دھرتا تھی اور ایسا ممکن نہیں تھا کہ جس کی ہتھیلی کے نیچے اس کا بیٹا پلتا رہا وہ خانم کے یہاں آنے اور اس قصے کے سیاق و سباق سے بے خبر رہتی اس لیے اسے سب سے پہلے سنہری کو قائل کرنا تھا اس کے بعد چوہدری حاکم کو راستے سے ہٹانا لازمی ہو گیا تھا کیونکہ قاسم جانتا تھا کہ وہ بھی خانم پر دانت تیز کیے بیٹھا ہے۔ اسے حویلی لکھاں سے نکالنا ناگزیر ہو گیا تھا اور یہ کام بھی سنہری ہی کر سکتی تھی۔ ایک تیر سے دو شکار کھیلنے تھے لیکن ہوشیاری سے ورنہ شکار تو بھاگ ہی جاتا وہ خود ہی شکاری کے نشانے پر آ جاتا۔ اس کے لیے سب سے پہلے خانم کے نام سے منتقلی جائیداد ضروری تھی اور پھر خانم کو حاصل کر کے وہ حسنات کا کلیجہ چبا ڈالتا!

ہر کام انسانی سوچ اور تدبیر کے تحت ہوتا چلا جائے تو وہ بےفکر ہو جاتا ہے۔ اپنے انجام سے لاپروا ہو جاتا ہے اور یہی اطمینان اسے دلدل میں دھنسا دیتا ہے!

☆☆☆

نیا دن اپنے ساتھ قیامت کا شور لایا تھا۔ حیات شہر سے واپس آ گیا تھا۔ رات کشور نے زندگی اور موت کی جنگ لڑتے جڑواں بیٹوں کو جنم دیا تھا۔ حیات گر لا اٹھا تھا کہ وہ اپنے بیٹوں کی خوشی منائے، حسنات کی رہائی کا چرچا کرے یا خانم کے لاپتا ہونے کو روئے۔ ایک رات میں ساری حویلی جیسے ادھڑ گئی تھی۔ ہر شے اپنے مقام سے ہٹ گئی تھی۔ فجر کے وقت کسی نے خالہ پیاری کو کنڈا کھول کر باہر نکالا تھا جہاں ان کی کمزور ہڈیوں والا ادھیڑ عمر وجود رات ہونے والے واقعے کے زیر اثر نچڑ کر رہ گیا تھا۔ وہ نکلتے ہی گرتی پڑتی خانم کی تلاش میں بھاگی تھیں لیکن وہ حویلی میں کہیں نہیں تھی۔ ملازماؤں سے پوچھا تو وہ کیا بتاتیں کہ اس وقت تو وہ خود خوف زدہ سی دبکی ہوئی تھیں سبھی چوہدری شہاب الدین کے عتاب سے ڈر کر منظر سے اوجھل رہی تھیں۔ ایسے میں خالہ پیاری چوہدری شہاب الدین سے سوال کرنا چاہتی تھیں لیکن وہ حویلی میں موجود ہی نہیں تھے۔ روتی سسکتی جب وہ کشور کے پاس اس کے کمرے میں پہنچیں تو وہ نڈھال پژمردہ سی دو کھلونے پہلو میں لٹائے سوجی آنکھوں سے انہیں دیکھے گئی۔ شاید وہ بےتحاشا روتی رہی تھی کیونکہ اس کی آنکھیں کثرت گریہ کے باعث بے حد سرخ تھیں۔ وہ خالہ پیاری کو دیکھتی ایک بار پھر سسک اٹھی۔

"خالہ۔ میری خانم۔ میری خانم حویلی سے چلی گئی خالہ۔ تایا جی کہتے ہیں کہ حاکم آیا تھا اور خانم ان کی آنکھوں کے سامنے اس کے ہاتھوں میں ہاتھ دیے حویلی سے چلی گئی۔ کیسے۔ کیسے ہو سکتا ہے یہ خالہ۔ میری خانم کیسے جا سکتی ہے۔ میں کس قدر بے بس اور لاچار ہوں کہ میری بہن یہ رات نا جانے کیا بیت گئیں اور میں اپنے کمرے میں بس اس کی چیخ و پکار اور تایا جی کی بندوق کی گولیوں کی آوازیں سنتی رہ گئی۔ خالہ کیا منہ دکھاؤں گی میں اماں ابا کو؟"

اس کی آنکھوں سے نکلتا پانی سیلاب کی طرح بہہ رہا تھا۔ یہ تو وہی جانتی تھی کہ رات وہ کس دہری اذیت و تکلیف میں مبتلا رہی تھی۔ ایک طرف پیدائش کا کڑا مرحلہ تو دوسری جانب خانم کی دلدوز چیخیں اور چوہدری شہاب الدین کی غراتی پکاریں۔ ایک بھیانک رات تھی جو مرتے دم تک ساعتوں پہ اپنے کالے اثرات چھوڑ گئی تھی۔ خالہ پیاری پژمردہ وجود گھسیٹتی اس کے بستر کے قریب پہنچیں اور بے جان سی ہوتی کشور کے پیروں کے قریب ڈھے گئیں۔ ان میں اس قدر بھی سکت نہیں تھی کہ وہ کشور کو سینے سے لگاتیں۔ جو منظر ان کی آنکھوں نے رات دیکھا تھا اس کے بعد اگلی قیامت کیا ہی آئے گی۔ خانم کا راہداریوں میں ڈولتا بھاگتا بے ڈول وجود اور چوہدری شہاب کا فرعون کی طرح اس کے پیچھے بندوق لیے لیے پھرنا۔ اس سفاک آدمی کا بے رحمی سے انہیں گودام میں بند کرنا۔ ان کی ایسی بے عزتی شاید زندگی کے کسی موڑ پر نہ ہوئی تھی جیسی رات انہوں نے سہہ لی تھی۔ ایک نامحرم شخص ان کی ادھیڑ عمری کا لحاظ کیے بنا انہیں بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتا پھرا تھا۔ انہیں چوٹی سے جکڑ کر گودام میں دھکا دیا تھا۔ ایسی ذلت و خواری۔ سوچ سوچ کر ان کا رواں رواں لرز اٹھ رہا تھا۔

"خانم کو مٹی کر دیا تیرے تائے نے کشور۔ وہ بچی تیرے تائے کی نفرت کی بھینٹ چڑھ گئی۔ نا کوئی ثبوت ملے گا نا گواہ نکلے گا۔ ایسی چال چل گیا شہاب الدین کہ کوئی بھی اس کی گردن نہیں جکڑ پائے گا کشور۔ خانم، حاکم کے ساتھ مر کر بھی نہیں جا سکتی لیکن مانے گا کون؟ کیا تم نے وہ سب دیکھا جو رات کو ہوا؟ کیا میں نے دیکھا؟ کیا کسی ملازمہ نے دیکھا؟ نہیں نا۔ بس تیرے تائے نے دیکھا کیونکہ جو بھی ہوا اس نے خود کیا۔ اور کس کو خبر ہے میری بچی کہ اس نے

خانم کو گولی مار کر قتل کر دیا ہو اور اب مشہور کر رہا ہے سب میں کہ وہ چلی گئی۔ یہ رات ایک گوڑے (گہرے) راز کی طرح وقت کی گھڑی میں بند ہو گئی ہے پتر۔ کوئی نہیں جان پائے گا کہ خانم زندہ ہے یا مر گئی۔ وہ لاوارثوں کی طرح دفنا دی گئی یا بھگا دی گئی!"

خالہ پیاری کے الفاظ نہیں تھے تند و تیز بھالے تھے جو کشور کا کلیجہ چیر رہے تھے۔ وہ نیم دراز سن سی سب کچھ سن رہی تھی!

یہ کیسی حقیقت تھی جو ان کے منہ سے بیان ہو رہی تھی۔ حقیقت بھی تھی یا شہاب الدین کی گھڑی من گھڑت داستان جسے اب پنڈ کے ہر شخص کی زبان پر عام ہونا تھا۔ سرخ چوباروں والی حویلی نے اپنے اندر جتنا وبال گزشتہ رات میں سمیٹا تھا شاید آنے والے کئی سال اس کے اثر سے نحوست زدہ ہو جاتے!

وہ خالہ پیاری کو ایسے دیکھ رہی تھی جیسے وہ اپنا ذہنی توازن کھو چکی ہوں یا وہ خود پاگل ہو چکی ہو۔ اور پاگل تو چوہدری شہاب نے سب کو بنا ہی دیا تھا۔ کوئی کچھ جانتا ہی نہیں تھا کہ گزری شب خانم کے ساتھ کیا بیت گئی۔ ملازموں میں بھی یہی چہ میگوئیاں تھیں کہ خانم کو بڑے چوہدری جی نے مار دیا ہے اور لاش بھی چپ چپیتے دفنا دی ہے۔ کوئی کہتا تھا کہ خانم واقعی بھاگ گئی ہے۔ جتنے منہ اتنی باتیں تھیں لیکن کوئی بھی حتمی طور پر کچھ نہیں جانتا تھا کہ ہوا کیا تھا!

اسی لیے اگلی صبح جب حیات حویلی پہنچا تھا تو اس کے لیے سامنے قیامت کھڑی تھی۔ کشور اور خالہ پیاری کی زبانی جو کچھ اس نے سنا وہ اس قدر ناقابل یقین تھا کہ کتنی ہی دیر وہ ہونقوں کی طرح دونوں کی شکلیں دیکھتا رہا تھا۔ اس نے اپنے نومولود بیٹوں کو ایک بار بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ تن فن کرتا سیدھا ڈیرے پر پہنچا تھا جہاں چوہدری شہاب الدین پنڈ کے لوگوں کے بیچ سر پنچ بنے اونچے شملے والی پگ باندھے رات ہونے والی فائرنگ کی بابت بتا رہے تھے۔

"دیکھو بھراؤ۔ میں نے یہ قصہ مکا دیا ہے۔ تم لوگوں کو شکوہ تھا نا مجھ سے کہ آخر میں اپنی حویلی سے گندگی صاف کیوں نہیں کرتا تو اب میں نے اس گند کو اپنے پتر کی زندگی سے بھی دور کر دیا ہے ہمیشہ کے لیے۔ اسے رات مار کر ایسی تھاں دفنانا چاہتا تھا کہ کسی کو اس کی بو بھی نہیں ملنی تھی لیکن چوباروں کو چڑھی گندگی تھی، نکل بھاگی اپنے یار کے ساتھ۔ آخری گولی نے اسے لے دے جانا تھا مگر عین وقت پر وہ حاکم بھی آ گیا اور اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ ایسی کم ظرف نکلی میرے پتر کی نسل کو، میری پوتری کو بھی لے گئی۔ دیکھو بھراؤ معاملہ عزت کا تھا۔ سارے پنڈ کی دھیوں بہنوں کا تھا اور تم لوگ بھی مجھ سے یہی چاہتے تھے کہ میں اس بے حیا کو جان سے ماروں تاکہ تم لوگوں کی عورتوں کو عبرت ہو۔ قصہ ایک دن کا نہیں تھا بیلیو۔ کتنے مہینوں سے ہماری نک کے تھلے یہ تماشا چل رہا تھا۔ اب تم لوگ میرا ساتھ دو، میں حاکم کا جینا حرام کر دوں گا۔ اب ان دونوں کو پنڈ میں رہنے نہیں دینا!"

پنڈال میں شور سا مچ گیا۔ سب ہی اس رائے سے اتفاق کرتے دکھائی دیے۔ چوہدری شہاب الدین کے لیے توصیفی کلمات کہتے پنڈ کے لوگ انہیں سراہ رہے تھے کہ انہوں نے اپنے ہی گھر کی عورت کے خلاف ایسا سخت قدم اٹھا کر بہت بڑا کام کیا ہے!

فاصلے پر کھڑا حیات اپنے باپ کی اس حرکت پر دنگ تھا۔ یعنی وہ ہو گیا تھا جس کے بارے میں اسے یقین تھا کہ چوہدری شہاب کبھی کرنے کی جرات نہ کریں گے۔ انہوں نے خانم کو حویلی سے نکال دیا تھا۔ اسے بدنام کر دیا تھا۔ اسے بدکردار ثابت کر کے چوہدری حاکم کے ساتھ نتھی کر دیا تھا۔

یہ سب کیسے ہو گیا تھا۔ اسے خبر کیوں نہیں ہو سکی تھی؟ وہ کھڑا کھڑا زمین میں گڑنے کو آ گیا تھا۔ وہ کس کا گریبان پکڑتا؟ اپنے باپ کا جس نے نا جانے کن کن حربوں سے اس کی آنکھوں میں دھول جھونکی تھی جن پر اعتبار کر کے وہ شہر میں اپنے گھربار

digest.library.com

کے لیے ذلیل ہونا رہا تھا اور وہ یہاں اپنی ہی عزت کو ہوا کر چکے تھے۔ چوہدری حاکم کو پکڑتا یا قاسم کو۔ دونوں کو اس کے اپنے باپ کی پشت پناہی حاصل تھی۔ حیات کا سر بری طرح چکرانے لگا تھا۔ یہ ساری صورت حال قبول کرنے کو اس کا دماغ تیار نہیں تھا۔ خانم کہاں تھی اس کے ساتھ کیا بیتی تھی وہ کس سے معلوم کرتا۔ ایک رات گزر چکی تھی پوری ایک رات۔ اور اس ایک رات میں نا جانے کیا سے کیا ہو چکا تھا۔ اسے اپنے آپ سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اپنی گڈی کی حفاظت نہیں کر سکا تھا جسے وہ اپنی بہن سمجھتا تھا۔ وہ حسنات کو کیا منہ دکھائے گا۔ کیا جواب دے گا۔ حسنات کا خیال آتے ہی وہ الٹے قدموں حویلی کی جانب پلٹا تھا۔ حسنات چھوٹ چکا تھا اور وہ یقیناً حویلی میں خانم سے رابطہ کرنے کی سر توڑ کوششیں کر رہا ہوگا۔ اس سے پہلے کہ اس کے کانوں تک کوئی خبر پہنچتی وہ اس سے خود بات کرنا چاہتا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا جس حسنات کو پتا لگنے سے وہ ڈر رہا تھا اسی کی وجہ سے رات ہونے والا حادثہ وقوع پزیر ہوا تھا۔ اس نے دھتکارا اور چوہدری شہاب الدین نے موقع کا فائدہ اٹھاتے خانم کا وجود سوالیہ نشان بنا ڈالا تھا!

☆☆☆

حویلی لکھاں میں چیونٹی کے بھی پر نکل آتے تھے سنہری کو خبر ہوتی تھی اور خانم تو وہ چیونٹی تھی جسے مسلنے کی شدت سے خواہش اس کے دل میں سدا کلبلاتی تھی!

قاسم نے بھلے چھپایا ہو لیکن سنہری سے چھپ نہیں سکتا تھا۔ دوپہر سے پہلے پہلے اسے معلوم ہو چکا تھا کہ اس کی حویلی میں اس کی ازلی حریف موجود ہے۔ اور اسے لانے والا بھی اس کا اپنا شوہر ہے۔ اسے اب تک ہونے والی ہر بات کا علم تھا تو یہ کیسے چھپ سکتی تھی۔ شہاب الدین کو لگتا تھا کہ اس کے بنائے طریقے سے خانم کا حویلی سے خاتمہ ہوا تھا جبکہ درحقیقت اس سب کے پیچھے بھی دماغ سنہری کا تھا اور حسب سابق کندھے اوروں کے تھے۔ اسی کے کہنے پر قاسم نے چوہدری شہاب الدین کو اکسایا تھا یہ سب کرنے کے لیے۔ حاکم کو مہرہ بنانے کا خیال بھی اس کا تھا اور ان سب پر عملی جامہ پہنانے والے باقی تین افراد تھے جو اس سب کو اپنے تئیں اپنی کامیابی سمجھ بیٹھے تھے!

سنہری جان بوجھ کر بھی خانم سے ملنے چوہدری آفتاب کی حویلی نہیں گئی تھی۔ وہ اس کا چہرہ نہیں دیکھنا چاہتی تھی جس کی وجہ سے وہ اسی حویلی میں حسنات کے ہاتھوں بری طرح ذلیل ہوئی تھی لیکن اب اسے وہ اپنی حویلی میں برداشت بھی نہیں کرے گی اور یہ بات طے تھی۔ قاسم کی نیت اور حاکم کے ارادے اس سے چھپے ہوئے نہیں تھے۔ وار الٹتے دیر نہیں لگتی ابھی تک ساری بازی اس کے ہاتھ میں تھی تو یہ بھی ممکن تھا کہ بساط پلٹ جائے۔ قاسم کو کہ اس کی منشاء و مرضی کے بنا پر بھی نہیں مار سکتا تھا مگر اس کی فائزہ سے شادی ہونے سے وہ روک نہیں پائی تھی۔ خانم کو گو ابھی طلاق نہیں ہوئی تھی لیکن عنقریب ہونے کے مکمل امکان تھے ایسے میں وہ حویلی میں رہتی تو اس کا حسن اور مسکین وجود سنہری کے راج کے لیے بہت بڑا خطرہ تھا۔ قاسم جیسے مرد کو باندھے رکھنے کے لیے اس نے بے حد جتن کیے تھے۔ جادو کا سہارا لیا تھا جنتر منتر کیے تھے ساری ساری رات کھلی چھت پر الوؤں کی چنگھاڑوں کے بیچ جاپ جپے تھے۔ قاسم پینترا بدلنے بھی لگتا تب بھی پر کٹے مرغے کی طرح بے بس اس کے گرد منڈلانے پر مجبور ہو جاتا۔ یہ سب کرنے کے لیے سنہری نے سالوں کی ریاضت کی تھی۔ اب ایک بار پھر وہ سب کچھ خانم کے ہاتھوں گنوا نہیں سکتی تھی۔ خانم کو اس حویلی سے جانا ہی ہوگا اور اسے یہاں سے نکالنے کے لیے سنہری کو ابھی حاکم جیسے مہرے کی ضرورت تھی۔ آخری استعمال کے بعد قاسم کے ذریعے حاکم کا کانٹا بھی نکل جاتا اور حسب سابق دونوں شکار سنہری کے تیر پر کندہ ہو جاتے!

☆☆☆

سرخ چوباروں والی حویلی سوگ میں ڈوبی تھی۔ حیات جیسے کمرے میں بند ہو گیا تھا۔ تین دن ہو گئے تھے اس نے ڈھنگ سے کچھ کھایا تھا نا حلق تر کر پاتا تھا۔ خانم کو ڈھونڈتے اسے کئی بار اذیتوں کے دریا پار کرنے پڑے۔ وہ مرد ہو کر آنسوؤں سے رویا تھا۔ حویلی لکھاں بھی جا چکا تھا جہاں سے ذلیل ورسوا ہو کر نکالا گیا کیونکہ حاکم کے گھر والوں کے بقول وہ ایک ہفتے سے حویلی نہیں آیا اور قاسم نے اسے اندر گھسنے تک نہ دیا تھا۔ وہ اپنے ساتھ پنڈ کے افراد لے کر نہیں جا سکتا تھا کہ سبھی خانم کے ساتھ ہوئے حادثے سے راضی تھے۔ وہ جس سے بھی بات کرتا جواب میں یہی سنتا کہ جو چوہدری آفتاب کی کڑی کے کرتوت تھے یہ تو ہونا ہی تھا۔ اس کی آنکھوں سے نیند اڑ چکی تھی۔

چوہدری شہاب الدین سے باز پرس کرنے کا یہ نتیجہ نکلا تھا کہ انہوں نے اس کے منہ پر جوابا تھپڑ کھینچ مارا تھا اور رہی سہی کسر اسے یہ بتا کر پوری کر دی تھی انہوں نے جو بھی کیا ہے حسنات کے کہنے پر کیا ہے۔ دھچکے پر دھچکہ تھا جس سے وہ سنبھل نہیں پا رہا تھا۔ پورا پنڈ کھنگال مارا تھا خانم نہیں ملی تھی۔ اب ارادہ تھا کہ شہر کا رخ کرے مجبوراً پولیس میں رپورٹ درج کروانی پڑے تو کروا دے لیکن اس سب سے پہلے حسنات سے رابطہ ناگزیر تھا۔ وہ اتنے دن سے یہ بات بھول ہی بیٹھا تھا کہ حسنات بری ہو کر اپنے اپارٹمنٹ آ چکا تھا۔ خانم کی پریشانی نے اسے بھائی کی رہائی کی خوشی بھی نہیں منانے دی تھی۔ اس نے چوہدری شہاب الدین کے کہے کے باوجود ان پر یقین نہ کرتے حسنات کو کال کی تھی۔ وہ اسے بتانا چاہتا تھا کہ اس کا بڑا بھائی اس کی امانت کی حفاظت نہیں کر سکا تھا۔ اس کی ستارہ آنکھوں اور پھول جیسی بچی کی گمشدگی کا ذمہ دار ان کا اپنا باپ ہے۔ وہ اس دکھ کے پہاڑ کو سہتے سہتے بے جان ہو رہا تھا۔ اب چاہتا تھا حسنات واپس آ جائے۔ وہ آ جاتا تو اسے یقین تھا کہ وہ آدھے دن میں خانم اور زیل کو ڈھونڈ نکالے گا اور یہیں آ کر اس کے یقین کا مینار مسمار ہوا تھا۔ وہ جو سمجھتا تھا کہ حسنات ایسا قلعہ ہے جس کے اندر خانم محفوظ ہے لیکن اسے کال کرنے پر جو کچھ اس کی سماعت نے سنا وہ ہرگز ویسا نہیں تھا جس پر خانم کو مان تھا۔ خانم کے حفاظتی قلعے میں شگاف پڑ چکے تھے۔ ان شگافوں سے دشمن داخل ہو کر کل متاع لوٹ کر نکل بھاگا تھا۔

حسنات نے اس کی کال بے حد دیر سے اٹھائی تھی۔ اس کی آواز سنتے ہی حیات بچوں کی طرح رو دیا تھا۔ وہ اس کا ماں جایا تھا اس کا یار بیلی تھا۔ وہ دونوں ہمیشہ دکھ سکھ کہتے آئے تھے۔ دونوں کی ذہنی مطابقت اس قدر تھی کہ کبھی تیسرے فریق کی انہیں ضرورت نہیں پڑی تھی۔ لیکن آج کیا ہوا تھا کہ حیات بلک اٹھا تھا اور دوسری جانب عجیب پراسرار سی خاموشی چھائی تھی۔ پہلے تو حیات روتا رہا اور جذباتی ہیجان کے باعث محسوس نہ کر سکا لیکن پھر اسے لگا جیسے لائن پر حسنات موجود ہی نہیں۔ اس نے مایوسی سے دوبار پکارا اور تیسری پکار پر حسنات کی آواز سنائی دی تو حیات کے دل کو دھکا سا لگا۔ واہمے ستانے لگے کیا اس کا بھائی اس سے ناراض ہے؟ اسے کہیں پتا تو نہیں چل گیا کہ خانم کھو گئی ہے؟ وہ اسے صفائی کا موقع بھی نہیں دے گا کیا؟

اس نے اذیت سے پر لہجے میں حسنات کو پکارا تھا۔

"حسنات۔ میرے بھائی مجھ سے خفا نہ ہونا۔ میں بے ایمان نہیں ہوں لیکن میں تمہاری امانت کی حفاظت نہیں کر سکا۔ میں۔ میں پوری کوشش کر رہا۔۔"

"مت کریں۔" حسنات کی سپاٹ سی آواز ابھری۔

حیات کو لگا اسے ٹھیک سمجھ میں نہیں آیا۔ اس نے اپنا فقرہ پورا کیا۔

"نہیں۔ میں نے کہا کہ میں پوری کوشش کر رہا ہوں کہ میں خانم اور۔۔۔"

"اور میں نے آپ کو یہی کہا لالے کہ مت کریں۔ بے فائدہ کوششیں مت کریں۔ اب سب ختم ہو گیا!"

حیات کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا۔ یہ کیا ہو رہا تھا؟ وہ کیا بتانا چاہ رہا تھا اور حسنات نا جانے کیا سمجھ رہا تھا۔ اسے لگا جیسے حسنات اپنے کیس کی بابت بات کر رہا ہے جبکہ وہ اسے خانم کے متعلق بتانا چاہ رہا تھا۔ اب کے اس نے گلا صاف کیا اور اپنی آواز میں زور پیدا کرتے ہوئے بولا۔

"حسنات! میں خانم اور زہل کی بات کر رہا ہوں۔ وہ دونوں کھو گئی ہیں۔ میں جلد انہیں بازیاب کروا لوں گا۔ وہ نا جانے کہاں چلی گئی ہیں۔ یہ سب۔ یہ سب ابا جی کا کیا دھرا ہے اور اس میں تم......"

"بھیا! آپ کو سنائی نہیں دیا، میں نے کیا کہا ہے۔ میں نے آپ کو ابھی کہا نہیں کہ مت ڈھونڈیں۔ وہ کھو گئی تو اسے کھویا رہنے دیں۔ میں اب کسی خانم کو نہیں جانتا۔ اور ابا جی کو بیچ میں مت لائیں، انہوں نے کچھ نہیں کیا۔ بس میری تقدیر ہار گئی ہے لالے!"

"تو پاگل ہو گیا ہے حسنات۔" حیات یکدم چلا اٹھا اور اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ "تجھے کہاں سے خبر ملی کہ خانم کھو گئی ہے جبکہ ابھی تک یہاں کسی سے تیری بات نہیں ہوئی حسنات۔ اور تو خانم کے بارے میں ایسے کیسے بات کر رہا ہے۔ تیری بیوی اور تیری بچی لاپتا ہیں اور تو بکواس کر رہا ہے کہ انہیں ڈھونڈوں نہیں۔ تیرا دماغ کیسے الٹ گیا میرے بھائی۔ کیا اندرہ کر تیری عقل سلب ہو گئی ہے!"

اسے ایکدم شدید طیش چڑھا تھا۔ یہاں اس کی نیندیں حرام ہو گئی تھیں اور حسنات نے کس قدر آرام سے قصے پہ مٹی پاؤ کہہ دیا تھا۔ جیسے وہ اس کی بیوی اور بچی کی نہیں کسی بکری کی بات کر رہا ہو۔

"مجھے کسی کو کچھ بھی بتانے کی ضرورت نہیں لالے......" دوسری طرف وہ بھی چلایا۔ "حسنات نے محبت کی تھی لالے اور ٹوٹ کر کی تھی۔ سارے جگ سے بغاوت کر لی تھی اور پری کو سب کے بیچ سے نکال کر لے گیا تھا لیکن میری ہی آستین میں سانپ پلتا رہا اور میں اسے دودھ پلاتا رہا۔ کہاں کمی کی تھی میں نے محبت میں۔ کس کس سے نہیں لڑا تھا میں۔ کس کس کے سامنے دیوار بن کر کھڑا نہیں ہوا لیکن پری نے مجھے کیا صلہ دیا۔ مجھی سے بے وفائی کر ڈالی۔ مجھ پر ترجیح دی بھی تو کس کو؟ اس حاکم کو۔ وہ حاکم جسے ہم نے کبھی اپنا رشتے دار تسلیم نہیں کیا تھا۔ اسے مجھ پر فوقیت دے دی۔ اس گند کی خاطر اس نے مجھے چھوڑ دیا لالے۔ میرا دماغ پھٹ جائے گا لالے۔ میری نس پھٹ جائے گی۔ مجھ سے اس کا ذکر بھی مت کرو۔ مجھے اکیلا چھوڑ دو!"

اور حیات مزید کیا کہتا اس کے تمام الفاظ کو حلق چوس گیا تھا وہ ششدر سا بس حسنات کو سنتا رہ گیا تھا۔ وہ جو ابھی ہمتیں جوڑ رہا تھا کہ اسے بتائے گا خانم اور زہل کے ساتھ کیا بیت گئی۔ وہ دونوں جانیں نا جانے کیسی آفت سہہ گئیں، حسنات نے اس کے ہر خیال پر پانی پھیر دیا۔ اسے تو یہی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر اس کے بتانے سے پہلے حسنات تک خانم کی خبر گئی کیسے؟ کس نے اسے سب بتایا اور کیا بتایا جو وہ اس قدر بدظن ہوا بول رہا تھا۔ حاکم کے بارے میں اسے کس نے بتایا اور کیا بتایا۔ اور کیسی فوقیت؟ کس نے دی فوقیت؟ اتنے سوالیہ نشان اس کے سامنے آن کھڑے ہوئے تھے کہ ان کا جواب ڈھونڈتے اس کی سانس اکھڑنے لگی تھی۔ کڑی سے کڑی جوڑنا چاہ رہا تھا لیکن درمیان سے بہت کچھ حذف تھا۔ وہ سوچ چکا تھا کہ اسے معاملے کی تہہ تک پہنچنا ہوگا چاہے چوہدری شہاب الدین سے سینہ بہ سینہ ٹکرانا پڑے۔ اسے اس گھڑی اپنے ہی بھائی پہ نفرت کی حد تک اشتعال آیا تھا اگر وہ اس کے سامنے ہوتا تو یقیناً اسے اتنے تھپڑ رسید کرتا کہ وہ مزید رو دیتا۔ حیات نہیں جانتا تھا کہ دور دیس میں اس وقت بھی

اس کا لاڈلا چھوٹا بھائی اپنی زندگی کو غلط فہمیوں کی بھینٹ چڑھانے کے بعد صوفے پر اوندھا پڑا بلک بلک کر رو رہا تھا۔ اس کی کل کائنات ایک رات میں الٹادی گئی تھی اور وہ شعور نہیں رکھتا تھا کہ اس میں اس کی خود کی کم عقلی کا ہاتھ تھا۔ تمام تر زیرک نگاہی اور معاملہ فہمی کے باوجود وہ مار کھا گیا تھا۔ وہ اپنے ہی باپ سے مات کھا گیا تھا۔ وہ گہری سازش کا شکار ہو چکا تھا!

digest library.com

☆☆☆

حویلی لکھاں میں سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ چوہدری قاسم نے سنہری کو خانم کے ساتھ ہوئے حادثے کی بابت بتا دیا تھا اور اب اس سے استدعا کر رہا تھا وہ خانم کو کچھ عرصے کے لیے یہاں برداشت کر لے۔ سنہری نے ایک لفظ نہیں کہا تھا بس خاموشی اور سادگی سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی تھی۔ قاسم کو لگا کہ وہ یقیناً اس کی بات مان لے گی اور اس نے مان بھی لی لیکن اپنے انداز میں!

قاسم کے جانے کے بعد اس نے سکون سے حویلی کے ضروری کاموں کا جائزہ لیا تھا اور پھر سج سج چلتی چوہدری آفتاب کے حصے کی جانب چلی آئی۔ دھوپ میں میٹھی سی گرمائش تھی اور صحن میں پھیلی اس کی حدت جسم کو بھی تراوٹ بخش رہی تھی۔ اس نے ابھی چوہدری آفتاب کی حویلی کے برآمدے میں قدم نہیں رکھا تھا جب باغیچے کی جانب سے اسے شہروز کی آواز سنائی دی۔ وہ کسی کے ساتھ باتیں کر رہا تھا اور اسے اپنے ساتھ کھیلنے کی ترغیب دے رہا تھا۔ وہ بیزار ہوتی اس جانب چل دی کیونکہ اسے لگا کہ اس کا پتر چوہدری حاکم کے بچوں کے ساتھ مشغول ہے جبکہ اس نے شہروز کو منع کیا تھا کہ ان سے مت کھیلے وہ اس لائق نہیں ہیں۔ بہت جلد وہ ان سب کا نشان بھی حویلی سے صاف کرنے والی تھی!

باغیچے میں پہنچتے ہی اس کی نگاہ نے حیرت انگیز منظر دیکھا تھا۔ شہروز جو ابھی تک کسی کے سیدھے منہ بات کرنے کا روادار نہیں تھا زل کو ساتھ بٹھائے گھاس پر اپنی کلرنگ بکس اور ڈھیروں کلر نکالے اسے ان میں رنگ بھرنے کی پیشکش کر رہا تھا۔ جبکہ زل سہمی ہوئی تھی اور بار بار بوکھلا کر ادھر ادھر دیکھنے لگتی تھی۔ سنہری نے بغور شہروز کو دیکھا تھا جو پورے استحقاق اور دبدبے سے اسے اپنے پاس بٹھائے ہوئے تھا۔

"خون اپنا اثر دکھاتا ہی ہے۔ بالکل باپ پر گیا ہے میرا پتر۔ ماں باپ کو پسند اور بیٹی بیٹے کو بھا گئی ہے۔ واہ سنہری تیری قسمت!"

وہ اپنی آنکھیں سکوڑے خود سے مخاطب تھی لیکن لہجے میں کسی قسم کا غصہ یا تنفر نہیں تھا۔ وہ چلتی ہوئی دونوں کے قریب آئی تو زل یکدم گود میں رکھی پینسلیں گراتی کھڑی ہو گئی جبکہ شہروز کے ننھے سے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے۔

"اماں۔ اسے ڈرا کیوں دیا آپ نے۔ اتنی مشکل سے لایا تھا اپنے ساتھ یہاں!"

وہ نروٹھے پن سے بولا۔ اس کے انتہائی سرخ و سفید گال پھول سے گئے۔ سنہری نے آگے بڑھ کر اس کا منہ چوما اور زل کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اچانک وہ وہاں سے سرپٹ بھاگی اور چوہدری آفتاب کی حویلی میں جا گھسی۔ سنہری نے نفرت آمیز نگاہوں اس جانب گاڑیں اور سر جھٹک دیا۔

"میرے پتر کو کھیلنے کے لیے یہی ملی تھی۔ تیری ماں کے دشمنوں کی اولاد ہے یہ!" وہ اسے نیا سبق دینے لگی۔

"مجھے اچھی لگتی ہے اماں۔ یہ دشمن نہیں لگتی نا۔ اس کے ہاتھ میں پستول بھی نہیں!" اس نے اپنی چھوٹی سی عقل کے مطابق دشمن کی تشریح کی۔

"ضروری نہیں ہوتا پتر، کہ دشمنوں کے ہاتھوں میں ہی پستول ہو۔ کچھ ہتھیار چھپا کر رکھے جاتے ہیں وقت پڑنے پر انہیں چلایا جاتا ہے!"

"لیکن مجھے یہ گڑیا لگتی ہے اماں۔ اس کی اماں سے کہو کہ اسے مجھے دے دے!" وہ آنکھوں میں چمک لیے کہہ رہا تھا اور سنہری بغور اسے دیکھ رہی تھی۔

"کیسے دے دے۔ ایسے تو نہیں دے گی نا۔ ہاں جب میرا پتر بڑا ہو جائے گا تو تیری شادی کر دوں گی اس سے!"

اس نے مذاقاً بات کہی تھی اور پنڈ میں چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ ان کی شادی بیاہ کی بات کرنا عام بات تھی۔

"تو ابھی کر دے نا اماں، میری شادی۔ میں ابھی بھی تو کتنا بڑا ہوں۔ یہ دیکھ!" وہ ایڑیوں کے بل اونچا ہوا اور ماں کو تسلی کرانے لگا کہ وہ شادی کے قابل ہے۔

"اچھا اچھا۔ بات کروں گی تیرے باپ سے، اب بس کر۔ چل کر کھانا کھا اور پھر سکول کا کام بھی ختم کر۔ اگر پڑھے لکھے گا نہیں تو یاد رکھنا کہ اس چھٹانکی کی ماں تجھے کبھی اپنی بیٹی نہیں دے گی۔ سمجھا میرا راجا!" اس کا دھیان بٹانے کو اس نے بات کہی تھی مگر شہروز یکدم سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"فکر نہ کرو اماں۔ میں بہت سارا پڑھوں گا۔ اور پھر تو زل کی اماں کو کوئی مسئلہ نہیں ہو گا نا۔ آج سے میں پورا دھیان لگاؤں گا۔ پکا وعدہ کرتا ہوں لیکن تم بھی میرے ساتھ وعدہ کرو اماں، کہ زل سے میری شادی کراؤ گی۔ دو ہاتھ!"

اس نے اپنا سفید اور گدرایا ہاتھ آگے بڑھایا جسے سنہری نے محبت سے تھام کر چوم لیا۔ اس نے فوراً ہامی بھر لی تھی۔ بچے کی ذہنی ناپختگی جان کر اسے بہلا لیا تھا لیکن بھول گئی تھی کہ شہروز اپنے باپ جیسا ضدی بھی ہے ہٹ دھرم بھی۔ اس کے ننھے سے دماغ نے زل کو اپنے لیے مختص کر لیا تھا۔ وہ اب اس کی چیز تھی اور اس کے نام سے منسوب رہنے والی تھی۔ اس کا دماغ پر یہ بات اس وقت نقش ہو گئی تھی۔

سنہری اسے اندر پڑھنے بھیج کر خود خانم کے پاس چلی آئی تھی۔ ملگجی روشنی والے کمرے میں گزرتے وقت نے سیلن بھر دی تھی لیکن خانم بے حد پرسکون سی پلنگ پر نیم دراز تھی اور آنکھیں چھت پہ جمی تھیں۔ سوچیں لکیریں بن کر ماتھے پہ بچھی تھیں اور یادیں نمی بن کر آنکھوں میں چمک رہی تھیں۔ اس کی بیٹی زل بھی اس کے سینے پر سر رکھے ہلکی ہلکی نیند میں جا رہی تھی۔ سنہری بنا دروازہ کھٹکھٹائے داخل ہوئی تھی۔ خانم فوراً لیٹے سے اٹھ بیٹھی تھی۔ ظاہر ہے وہ کیوں دروازہ بجاتی جب ساری حویلی اب اس کی ہی تھی۔ خانم نے زل کے نیم غنودہ وجود کو ایک طرف لٹایا اور اسے استفہامیہ دیکھا۔ جب سے یہاں آئی تھی یہ پہلا سامنا تھا ان دونوں کا۔ سنہری نے اسے استہزائیہ دیکھا اور قریب دیوار کے ساتھ لگی کرسی پر اکڑ کر بیٹھ گئی۔

"سنا ہے تمہارے تائے نے تم پر بندوق تان لی تھی۔ گولیاں بھی چلائی ہیں۔ آخر کار نکال ہی دیا اس نے تمہیں اپنے پتر کی زندگی سے۔ بھلا یہ کام کرنا تھا تو پہلے ہی کر دیتا۔ تم ایک گولی کی مار تھیں۔ ماردی ہوتی تو سب سکون میں ہوتے۔ تم قبر میں اور میں حسنات کے پہلو میں۔ خیر یہ بتاؤ کون لایا تھا تمہیں یہاں!"

وہ اس قدر آرام سے یہ تمام جملے منہ سے نکال رہی تھی کہ خانم کو اس کی بے حسی پہ رشک آیا۔ اس کی ساری بکواس خانم نے بھی سکون سے سنی تھی۔ کہنے کو باقی رہ بھی کیا گیا تھا۔ وہ اپنے سب مان بھرم چھوڑ کر یہاں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی انا اور اس کی عزت نفس اس کے وجود سے نوچ کر اتار پھینکی گئی تھی۔ اس نے سنہری کی جانب متورم نگاہوں سے دیکھا اور بولی۔

"بھائی قاسم بچا لایا تھا مجھے۔ اس کی وجہ سے میں اور میری بچی بچ گئے۔!"

"حسنات نے تمہیں طلاق دے دی کیا؟"

الفاظ تھے یا تیزاب۔ اس کا سارا وجود جھلس گیا تھا۔ آنکھیں بے اختیار بھری اور بہہ گئی۔ اس حال میں پہنچانے والوں کے لیے دل سے ہوکا نکلا۔

"اللہ نہ کرے۔ بس ناراض ہیں۔ ایک بار آ جائیں گے یہاں تو میری بات سن کر سارا معاملہ سمجھ جائیں گے۔ پھر مجھے ساتھ لیے بنا نہیں جائیں گے۔ اور مجھے یہ بھی امید ہے کل تک حیات لالا مجھے یہاں سے واپس لے جائیں گے۔ جب وہ لے گئے تو سمجھو حسنات کو سب وضاحتیں وہی دے دیں گے۔ حسنات میرے اور زل کے بنا رہ ہی سکتے۔!"

وہ اپنی دھن میں بولے جا رہی تھی اور سنہری کا کلیجہ چیرے جا رہی تھی۔ صاف لگ رہا تھا خانم ہوش اور بدحواسی کی درمیانی منزل پر ہے۔ رات کو ہونے والے واقعے کو قبول کرتے وقت لگنا تھا لیکن حسنات کے کہے الفاظ اس کا نہ ذہن قبول کر رہا تھا نہ دل۔ وہ بار بار خود کو سمجھا رہی تھی کہ حسنات کو دھوکا ہوا ہے ان کی پریشان حالت کا فائدہ اٹھا کر کسی نے انہیں ورغلایا ہے اور جیسے ہی ان کا غصہ اترے گا وہ سوچے گا کہ کیا بول بیٹھا ہے، یہ پچھتائے گا پھر فوری طور پر وہ خانم سے بات کرنے کو مچل جائے گا۔ اس سے معافی مانگے گا اسے منائے گا۔ جتنی جلدی ہو سکے گا اسے اور زل کو یہاں سے لے جائے گا۔ یہ ساری کہانی خانم کا ذہن بن رہا تھا۔ اس کے تانے بانے اس کے اپنے جوڑے ہوئے تھے۔ وہ کیسے قبول کر لیتی جان نچھاور کرنے والے شخص کا ایسا رویہ جو نا قابل فہم ہو۔ ایک بند گلی تھی جس میں وہ کھڑی تھی۔ اس بند گلی میں سے اسے حسنات بچانے آئے گا اس بات کا اسے یقین تھا اور یہ یقین تو سنہری کو بھی اس کے چہرے پر دکھائی دے رہا تھا۔ جسے پامال کرنے کے لیے وہ اتنے سال سے کشٹ اٹھا رہی تھی وہ اس قدر مطمئن ابھی بھی؟

"اچھی بات ہے۔ اچھا سوچو گی تو تیرے پر بھی پڑا برا اثر زائل ہو جائے گا۔ ورنہ حقیقت تو نہیں بدلے گی۔ لیکن اصل رولا تو یہی ہے سوہنی کہ تمہیں سرخ چوباروں والی حویلی سے نکال دیا گیا ہے خانم اور کس کی مجال تھی جو حسنات کے ہوتے تمہارے ساتھ اُچی نیویں (اونچی نیچی) کر جائے۔ عقل کو ہتھ مارو اور مان لو کہ حسنات نے تمہیں چھوڑ دیا ہے۔ خیر میرا کیا جا رہا ہے۔ چار دیہاڑے رہ لو یہاں۔ اس کے بعد دیکھوں گی تمہارا کیا کرنا ہے۔"

وہ اپنے داہنے ہاتھ کی انگلیوں سے دوسرے ہاتھ میں پہنی بھاری نگینے والی انگوٹھی کو گھماتی بے نیازی سے بولی جا رہی تھی۔ لیکن اندر کی پکڑ دھکڑ شدید تر تھی۔ جلن و حسد کا سویا کیڑا دوبارہ جاگ کر بڑی زور سے کاٹتا تھا۔ اور اس بار سنہری نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس کیڑے کو مزید نہیں پالے گی بلکہ مسل ڈالے گی۔

خانم کو اس کی خیالی دنیا سے باہر لا کر اس کے چہرے کو متوحش زدہ دیکھنے کے بعد وہ دل میں ٹھنڈک محسوس کرتی جن قدموں سے آئی تھی انہی سے واپس پلٹ گئی تھی۔ پیچھے قطرہ قطرہ آنسو خانم کی آنکھوں سے گرنا شروع ہوئے تھے اور ان کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔ بڑی مشکل سے دل میں پیدا ہوئے خوف و ہراس کو دبایا تھا پر وہ پوری شدت سے اس کے وجود پر دوبارہ سایہ فگن ہو چکا تھا!

☆☆☆

"اس کمبخت کو خدا جانے کس کی دعا لگی ہے جو شکار ہوتے ہوتے بچ جاتی ہے۔ لیکن اس بار میں اس کی قسمت سے خوشیاں نوچے بنا نہیں رہوں گی۔ بہت ہوا۔ سنہری کے حق پر ڈاکا ڈالنے والی عیش کرے اور سنہری اپنے شوہر کی محبت کو بھی ترسے۔ خانم تجھے وہاں مار کر پھینکوں گی جہاں پانی بھی نا ملے گا۔ اس حویلی تو کیا اس پنڈ میں ہی یہ تیری آخری رات ہے۔"

چوہدری آفتاب کی حویلی سے نکلتی وہ بڑبڑا رہی تھی جب اس کی غضب کی سماعت نے قاسم اور حاکم کی گفتگو کی بھن بھن سن لی تھی۔ یہ مدھم آوازیں باغیچے کی جانب سے آرہی تھیں۔ وہ دبے پاؤں اس جانب چل دی۔ جوں جوں فاصلہ گھٹ رہا تھا گفتگو کا متن سمجھ میں آنے لگا تھا۔ وہ ایک قد آدم پودے کی آڑ میں ہوکر سننے لگی۔

چوہدری قاسم اور چوہدری حاکم آمنے سامنے تلخ تاثرات لیے محو گفتگو تھے۔ دونوں کب سے یہاں کھڑے تھے سنہری کو معلوم نہیں تھا لیکن زیادہ وقت نہیں ہوا تھا یہ پتا چلتا تھا۔

"میرا استعمال نہ کر قاسم۔ میں بھی چوہدری ہوں اپنی سی کرنے پر آیا تو لگ پتے جائیں گے سب کو۔ اتنا ذلالت میں نے کھٹی (کمائی) ہے ٹو نے نہیں جو دودھ کی ملائی تجھے کلے کو تھارنے دوں۔!"

چوہدری حاکم کی آواز اونچی ہونے لگی تھی۔ قاسم کو طیش آیا اور ایک ہی ہاتھ سے اسے گریبان سے تھاما اور جھٹکا دیتے ہوئے بولا۔

"کون سی ملائی اوئے۔ کیسی ملائی۔ تجھ سے ملائی کا وعدہ کب کیا تھا جو اچھل رہا ہے۔ اور جس ذلالت کی ٹو بات کر رہا ہے وہ ٹو نے میرے لیے نہیں اپنے لیے کھٹی ہے۔ تجھے زمین کا ٹوٹا چاہیے تھا وہ وقت آنے پر دوں گا۔ اسی کا لالچ تھا نا۔ نہر کو لگتی اس زمین پر نظریں تھیں تیری پھر ٹو نے خانم پہ کیسے جالیں۔"

جواباً حاکم کے ہونٹوں پہ خبیثانہ مسکراہٹ رینگی۔ اس نے اپنا گریبان چھڑایا اور اسے جھٹکتے ہوئے بولا۔

"ارادے بدلنے کے لیے ہی ہوتے ہیں قاسم۔ تیرا نہیں بدلا کیا؟ کدھر پہلے بس چوہدری آفتاب کی کوٹھی اور مربعے چاہیے تھے اور پھر بات خانم پر نہیں آ ٹھہری۔ ایویں طلاقیں کرواتا پھر رہا ہے اس کی۔ تیرے تائے نے مفت میں اتنا پھڈ (جھگڑا) ڈالا ہے۔ اسے بھی تو مربعوں سے مطلب ہے۔!"

"اگر میں خانم کی طلاق نا کرواؤں تو مجھے اس کے حصے کی جائیداد کیسے ملے گی؟ ہاں بول؟ کیا حسنات میرے ہاتھ چھو آنے دے گا۔ طلاقن کو سہارا دوں گا تب ہی سب کچھ میرے نام لگے گا نا۔ ٹو اپنا اڑیکا (رکاوٹ) نا ڈال درمیان میں۔ تیرا جتنا کام تھا وہ ٹو نے کر دیا اب انتظار کر جب وقت آئے گا وہ ٹوٹا تجھے مل جائے گا۔ لیکن یاد رکھ دوبارہ خانم کا نام نا لیں!"

"سنہری کو پتا ہے تیرے ارادوں کا۔" حاکم دکھتی رگ کو دبانے کی کوشش کرنے لگا۔ قاسم نے آنکھیں سکوڑ کر اسے دیکھا سوچ رہا تھا جواب میں کیا کہے۔

"نہیں پتا نا۔ دیکھ میں تو تیرا یار ہوں بیچ سے نکل جاؤں گا لیکن تیری گھر والی تجھے سوکن لانے دے گی۔ وہ بھی اسی حویلی میں!"

"جب ویلا آئے گا اسے منانا بھی کوئی اوکھا نہیں۔ کرلوں گا کچھ نہ کچھ لیکن خانم کا وساہ اب کی واری میں کھانے والا نہیں۔ اس دفعہ وہ بھی میری اور اس کی جائیداد زمین بھی میری۔ چوہدری قاسم ہر بار مار نہیں کھانے والا۔"

وہ اسے انتہائی سنجیدگی سے دیکھتا وہاں سے چلا گیا تھا۔ سنہری نے خود کو مزید اوٹ میں کیا۔ وہ جا چکا تو چوہدری حاکم کے چہرے پر نگاہ ڈالی جو ہنوز اسی جگہ کھڑا ماتھے پہ بل ڈالے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتا کچھ سوچتا رہا پھر خود سے ہی مخاطب ہوا۔

"جو تیرے ارادے اتنے پکے ہیں تو میرا نام بھی حاکم ہے۔ بدنامی میں اٹھاؤں۔ پنڈ والوں کے سامنے سر میرا نیواں ہو۔ برا میں بنوں اور گردنیں اکڑا کر پھرو تم اور تیرا اخرانٹ تایا۔ تگڑی میں نے کی اور فائدے لے جاؤ تم دونوں۔ میں ایک پورا (معمولی ٹکڑا) زمین لے کر ڈگڈگی بجاؤں۔ نا قاسم باؤ نا۔ تجھے تو میں دس مت دوں

گا۔اب تیرے مہرے میرے اور میرے تیرے۔ اب پیادے بدل دوں گا میں۔خانم بھی لوں گا اور اس کا مال بھی!"

" ٹھیک کہہ رہے ہو چوہدری حاکم۔"

سنہری ایک دم پودے کے پیچھے سے نکل کر سامنے آئی تو وہ بوکھلا گیا۔اس کی بولتی یکدم بند ہوئی تھی۔ سنہری نے کلائی پہ لپیٹی تسبیح کھولی اور اس کے دانے پھیرتی چوہدری حاکم کے قریب آئی۔حاکم کا شمار بھی اب انہیں افراد میں سے ہوتا تھا جو سنہری کے سامنے آتے ہی زبان گنوا بیٹھتے تھے۔ وہ بولتی تھی تو الفاظ ساتھ چھوڑ جاتے۔بغور دیکھتی تو سارے جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ جاتی تھی۔یہ مرعوبیت تب تک قائم رہتی جب تک کہ وہ سامنے موجود رہتی جیسے ہی نگاہوں سے اوجھل ہوتی جیسے سحر ٹوٹتا اور اس کے خلاف عناد کی ایک شدید تر لہر سارے جسم کو تر کر جاتی۔چوہدری حاکم نے اپنی گھر کی عورتوں کو بھی ایک فاصلہ رکھنے کا کہہ رکھا تھا سنہری سے۔

"او بھرجائی، میں بس یونہی۔ایویں قاسم تپ چڑھا گیا مجھے۔ہم دونوں کی آپس کی بات ہے مل کر حل کرلیں گے۔" اس نے سنہری کا دھیان بھٹکانے کے لیے بات کا رخ موڑا لیکن سنہری نے ہاتھ اٹھا کر اس کے سامنے اونچا کیا تو الفاظ منہ میں ہی جم گئے۔

"چوہدری تم سیانے بندے لگتے ہو مجھے۔ قاسم تو سدا کا جذباتی ہے۔اس نے جب تک ٹھڈے نہیں کھا لیتی تب تک اس کی عقل ٹھکانے نہیں آنی۔خانم سے ویاہ کوئی آسان کم ہے کیا۔ اول تو اسے حسنات نے چھوڑا نہیں اگر چھوڑ بھی دیا تو مجھے پکا یقین ہے کہ وہ کبھی بھی قاسم سے ویاہ نہیں کرے گی۔اور جہاں تک رہ گئے تم چوہدری حاکم تو تم اپنے پیر پیچھے کیوں کرتے ہو۔جان تم نے ماری۔خوار تم ہوئے۔بڈی تمہاری کے کانوں میں بات پڑ چکی۔الزام تم پر لگ چکے تو جب الزام لگ گئے ہیں تو کام بھی کر گزرو۔دیکھو چوہدری کی بندے کو ایویں چور کہہ دیا جائے نا تو وہ آدھا چور بن جاتا ہے کہ الزام تو لگ ہی گیا ہے اب چوری بھی کرلوں۔"

وہ اس قدر سکون اور تحمل سے نظریں اپنی تسبیح پر جمائے اسے رستے دکھا رہی تھی کہ چوہدری حاکم بھی دنگ رہ گیا تھا۔اس دوران ایک بار بھی سنہری نے تسبیح کے دانے گھمانے نہیں چھوڑے تھے اور نہ ہی اس کی دونوں بھنوؤں کے بیچ پڑنے والی لکیروں میں کمی آئی تھی۔چوہدری حاکم یکدم جیسے ٹھنڈے پسینے میں نہا گیا۔یہ تو اس نے بارہا سوچا تھا کہ سب کچھ تیار کر کے پکا پکایا وہ قاسم کو کھانے کے لیے دے رہا تھا۔سنہری نے جیسے اس کے دل میں جھانک لیا تھا۔

"تیرا بندہ بڑا اتھرا ہے بھرجائی۔یاری بھی خراب ہوگی اور رشتے داری بھی!"

"بندہ سیانا ہو تو بس مستقبل پر نظر رکھے۔دنیا پیسے کی ہوتی ہے چوہدری حاکم۔جس بندے کے پاس کئی کلے زمین ہو پھر ایک نہیں دو دو زنانیاں ہوں اس کو پنڈ والے سلام کریں گے کہ نہیں!"

"لیکن میں خانم کو کیسے مجبور کروں گا بھرجائی کہ وہ مجھ سے ویاہ کرے!" چوہدری حاکم مکمل قائل ہوتا اس سے پوچھ رہا تھا اور سنہری اندر ہی اندر ہنس دی۔

"ویسے ہی جیسے اسے مجبور کر کے یہاں حویلی لکھاں تک لے آئے ہو۔اب ہی تو اصل موقع ہے کہ اپنی مردانگی دکھاؤ۔خانم کا جی تم سے برا ہے اسے مناؤ۔نرمی سختی سبھی کچھ تمہارے بس میں ہے چوہدری۔ وہی حربہ جو سرخ چوباروں والی حویلی میں آزمایا ہے اس کا عملی مظاہرہ یہاں کر دکھاؤ۔ ایک بار جب خانم کا نام تمہارے ساتھ گندا ہو گیا یہاں بھی تو قاسم خود ہی پیچھے ہو جائے گا اور پھر آنے والا وقت خانم کو مجبور کردے گا کہ وہ تمہاری چھتر چھاؤں میں چلی جائے۔ہر طرف سے جب

ٹھنڈا پڑ جائے گا تو کیا کرے گی اور؟ ایک کلمہ کلا راہ تمہاری طرف ہی نکلتی ہے پھر۔ اس لیے کر گزرو وہی جو پہلے کیا تھا۔ا"

چوہدری حاکم کی آنکھوں میں حریصانہ چمک جاگ اٹھی تھی۔ وہ سر ہلاتا شکر گزار تاثرات لیے وہاں سے چلا گیا تو سنہری نے تسبیح پر ایک زوردار پھونک مار کر واپس کلائی میں لپیٹنا شروع کیا۔ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ اس بار وہ قاسم کے دو بدو ہوئی تو اس کی چلنے والی نہیں اس لیے اسے ایک کاندھے کی ضرورت تھی جس سے دو شکار ایک ساتھ کیے جا سکیں۔ وہ کاندھا چوہدری حاکم کا تھا۔ ہدف واضح تھا اس نے بس موقعے پر نشانہ لگانا تھا!

☆☆☆

digest library.com

اپنے کمرے میں پلنگ پر تکیوں سے ٹیک لگائے دھوتی کرتا پہنے اور ٹانگوں پر لحاف اوڑھے چوہدری شہاب الدین آنکھیں موندے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے پر بلا کا اطمینان تھا۔ ساتھ ہی کارڈلیس پڑا تھا جس پر ابھی تھوڑی دیر پہلے انہوں نے حسنات کو کال ملائی تھی اور جو یقیناً اس نے نہیں اٹھائی تھی تو شہاب الدین کی شیطانی زبان نے ایک اور میسج چھوڑا تھا۔

"اے پتر۔ تو کیوں اس بدکردار کے لیے جوگ لیتا ہے۔ میں تو تجھے کب سے کہہ رہا تھا کہ یہ تیرے وارے جوگی نہیں لیکن تو نے میری نہیں مانی نا۔ اب دیکھ پورا پنڈ تھو تھو کر رہا ہے کہ کیسا نامرد نکلا چوہدری حسنات کہ اپنی زنانی نا سانبھ سکا۔ اور یہ تیرا بھرا وڈا۔ وہ الگ پاگل ہوا پھر رہا ہے۔ کہتا ہے جس نے ہماری پگ اچھال دی ہے اب میں اپنے ہاتھوں سے زمین میں گاڑوں گا بس مجھے حسنات اجازت دے دے۔ اگر اس نے کہہ دیا کہ مار دے تو خانم کو زمین میں دفن ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ میں نے اسے ٹالا ہے پتر کہ جان سے نا مار سب کیا کہیں گے سگے چاچے کی دھی مار دی۔ اور نہ ہی حسنات کو فون کر وہ تو بے چارہ پہلے ہی قسمت کو رو رہا ہے اب تو اسے فون کرے گا وہ غصے میں کہہ دے گا مار دو تو کیا مار دے گا۔ لیکن میری نہیں سنتا حیات۔ پتر تو اس کا فون مت اٹھانا ورنہ شہہ ملے گی اسے۔ گھر سے دھواں باہر نکل جائے تو اسے کون روک سکا ہے بھلا۔ لیکن اس گند کو مار کر میرا کوئی پتر قاتل کیوں بنے۔ اس لیے تسلی سے کچھ وقت نکال اور پھر بات کرنا وڈے بھرا سے ورنہ پہلے تو یقین نہیں کرتا تھا خانم کی بدکرداری پر اب تو جیسے خون سوار ہو گیا ہے اس پر۔ چنگا پھر اپنا دھیان رکھنا!"

ایک سکون تھا جو رگ و پے میں سرایت کیے انہیں مدہوش کر رہا تھا۔ کیسی بے جواز دشمنی تھی جو انہوں نے نبھائی تھی۔ اگر ان سے سوال کیا جاتا کہ خانم سے ان کی دشمنی کیا ہے؟ تو اس بات کا خاطر خواہ جواب ان کے پاس سے مرتے دم تک نہیں ملنے والا تھا کیونکہ انہیں تو بس نفرت تھی بے حساب اور بلا حساب نفرت۔ وہ اس کا وجود نہیں سہہ سکتے تھے وہ اس کو اپنی نگاہوں کے سامنے نہیں دیکھ سکتے تھے اور وہ اسے اپنے بیٹے کی زندگی میں بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ کشور سے انہیں محبت نہیں تھی لیکن وہ ان کے سینے میں انی کی طرح بھی نہیں گڑی ہوئی تھی۔ دوسرا کشور ان کی مرحومہ بیوی سکینہ کی لائی بہو تھی اور سکینہ سے انہیں محبت تھی۔ سکینہ ان کی چونکہ رگ رگ سے واقف تھیں اس لیے انہوں نے کشور کے لیے زمین ہموار کی تھی، ان کا دل صاف کیا تھا، ان کی نگاہوں میں بطور بہو کشور کی جگہ بنائی تھی۔ نفسیاتی طور پر ان کی کشور سے پرخاش بننے ہی نہ دی تھی جبکہ خانم چوہدری شہاب الدین کو بچپن سے ہی ایک آنکھ نہیں بھائی تھی۔ اور ان کے بیٹے کی زندگی میں آ کر خانم نے جیسے اپنی بدقسمتی کے معاہدے پر دستخط کر ڈالے تھے۔ انہیں سوچوں میں گم وہ یہ دعا کر رہے تھے کہ حسنات کچھ عرصے کے لیے ایسا کھو جائے کہ حیات کا اس سے رابطہ ہی نہ ہو پائے۔

خانم کو جتنا وقت حویلی سے دور رہنے میں لگے گا اتنا ہی ان کے لیے اچھا تھا۔ حسنات کو جب معلوم ہوگا کہ خانم کا اب تک کچھ پتا نہیں چلا تو اس کے لیے اپنی بیوی کو قبول کرنا مزید ناممکن ہو جائے گا۔

"کمال ہی کیتا ای چوہدری شہاب۔ تیری عقل نو لکھاں سلاماں۔!" وہ اب تک آنکھیں موندے ہوئے تھے، اپنے آپ کو شاباشی دیتے ہوئے بولے۔ آنکھیں کھولیں تو سامنے دروازے کی چوکھٹ میں حیات کھڑا تھا۔ ایک پل کو رنگت متغیر ہوئی کیونکہ حیات انہیں بے حد دکھ سے دیکھ رہا تھا۔

"اب پیو کے کمرے میں آتے ہوئے دروازہ بجانا بُھل (بھول) چکا ہے، تُو پتر۔!"

"بجایا تھا ابا جی لیکن آپ اپنے آپ کو شاباش دینے میں اس قدر گم تھے کہ آپ نے سنا ہی نہیں۔"

وہ چلتا ہوا قریب آیا۔ چوہدری شہاب نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسا کر انہیں پیٹ پر رکھا اور اسے استفہامیہ نگاہوں سے دیکھنے لگے کہ وہ اگلی بات کہے۔

"کیا کہا ہے آپ نے ابا جی حسنات کو۔ آپ کا کب کیسے رابطہ ہوا تھا اس سے۔ خانم کے متعلق آپ نے ایسا کیا کہہ دیا ہے اسے جو وہ سب سے متنفر ہو گیا ہے۔ میں بہت پریشانی میں بڑی امید لے کر آپ کے پاس آیا ہوں ابا جی۔ مجھے مایوس نا کیجیے گا۔ یہ آپ کے خون کی عزت کا سوال ہے۔ حسنات بھی آپ کا خون ہے اور خانم بھی اور ان دونوں کی بچی بھی آپ ہی کا خون ہے۔ خانم اور زل کو رلنے سے بچا لیں ابا جی۔ حسنات کو کیا کہا ہے مجھے بتائیں۔ ورنہ اس سے رابطہ کر کے اس کا دل صاف کریں ابا جی۔ اسے سمجھائیں۔ وہ خانم کے بنا نہیں رہ سکتا۔ ابھی تو اسے غصہ ہے لیکن کچھ وقت بعد وہ پاگل ہونے لگے گا ابا جی۔ اس کا کیریئر برباد ہو جائے گا۔ زندگی تباہ ہو جائے گی!"

حیات نے اس قدر رسانیت سے اتنا بہت سا باپ کو سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ اسے مان تھا کہ ان کا دل پسیج جائے گا۔ وہ اپنی پوتی اور بہو کو تصور ہی کر لیں گے کہ وہ کہاں خوار ہو رہی ہیں تو شاید ان کا دل نرم پڑ جائے۔ وہ بے حد امید سے ان کی نظروں میں دیکھ رہا تھا۔ چوہدری شہاب الدین نے نرم نظروں سے اسے دیکھا اور تھوڑا آگے ہوتے ہوئے بولے۔

"نا حسنات نے میرے سے پچھ کر اس کم ظرف سے ویاہ کا سوچا تھا نا مجھ سے پچھ کر باہر گیا تھا نا مجھ سے پچھ کر اسے پاکستان لے کر آیا تھا۔ ہر شے میں اس کی مرضی تھی تو خانم کو چھوڑنے میں بھی اس کی اپنی مرضی ہے۔ میرے سر پر سوار نا ہو پتر۔ جا اسے لبھ لیتی ہے تو لیکن حویلی لانے کی جرات نا کرنا۔ ایک بار گولی سے بچ گئی ہے مگر اس بار تیل ڈال کر آگ لگا دوں گا اس بے حیا کو۔ سمجھا میرا پتر۔ چل شاوا۔ آرام کرنے دے مجھے۔" وہ تھوڑا رخ موڑے تکیہ ٹھیک کرنے لگا۔

"آپ کے پاس کیا ثبوت ہے ابا جی، اس کی بے حیائی کا۔" حیات چلا اٹھا۔ "بہتان لگا رہے ہیں آپ بہتان۔ اس کا گناہ معلوم ہے آپ کو۔ اللہ کی پکڑ سے ڈریں ابا جی۔ سارے پنڈ سے تھو تھو کروا لی آپ نے۔ جس سے بھی پوچھوں سب اس کا نام لے کر تھوک دیتے ہیں۔ کوئی میرے ساتھ نہیں کھڑا ہوتا کہ اسے ڈھونڈ سکوں۔ آپ نے یہ نہ سوچا کہ لوگ اسے چوہدری شہاب الدین کی نوہ کہتے ہیں۔ لوگ آپ کی نوہ پر تھوتھو کر رہے ہیں۔ آپ کی عزت خاک میں رُلی ہے ابا جی۔!"

وہ جذباتی ہو کر رو دیا تھا۔ تھک چکا تھا اس بھاگ دوڑ سے۔ اسے کندھے کی ضرورت تھی لیکن کوئی اس کا آسرا بننے کو تیار نہیں تھا۔ اسے ڈور پکڑنے کے لیے کوئی تو سرا ملتا۔ چوہدری شہاب

اسے ملول نگاہوں سے دیکھتے رہے۔ حیات کو لگا کہ اس کی بات نے ان کے دل پہ اثر چھوڑا ہے۔ چند پل یونہیں دیکھتے رہنے کے بعد پھر بولے۔

”جتنی میری پہلے تھی نا اس سے دونی (دگنی) میں عزت دوبارہ بنا لوں گا پتر۔ لیکن خانم دوبارہ یہاں نہیں آئے گی۔ جا اب۔ سونے دے مجھے۔

!

digest library.com

دل جیسے یک دم غم کے کنویں میں جا گرا۔ یعنی وہ کچھ بھی کر لیتا اپنے باپ کو رام نہیں کر سکتا تھا۔ وہ انہیں احساس نہیں دلا سکتا تھا کہ ان کے ہاتھوں کیسا ظلم ہو چکا ہے۔ ان کی اولاد سخت اذیت میں ہے ایک یہاں ذلیل ہو رہا ہے تو دوسرا باہر دیوانہ ہوا پھر رہا ہوگا۔ حویلی کے اندر عورتیں تھیں تو سخت نالاں وافسردہ۔ کشور تو شہاب الدین کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتی تھی اور خالہ پیاری کا بس چلتا تو اسی بندوق سے شہاب الدین کو اڑا دیتیں جس کو تان کر اس دن وہ فرعون بنے پھر رہے تھے۔ بچے سہمے سے کمروں میں گھسے رہتے۔ وہ خود نیم پاگل سا ہو رہا تھا۔ انسان تھا اور ماس بوٹی کا ہی بنا تھا اسے بھی تکلیف ہوتی تھی درد ہوتا تھا رونا آتا تھا جیسے وہ ایک اندھے کنوئیں میں پڑا ہو جس سے باہر آنے کا راستہ وہ نہیں جانتا لیکن کسی کا منتظر تھا کہ کوئی آئے اور اسے یہاں سے نکال لے۔ زندگی کولہو بنی اس کی ہڈیوں کا تیل نکالنے میں لگی تھی!

☆☆☆

وہ پکی سڑک پر اندھا دھند بھاگتی آئی تھی۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ ہو کا عالم تھا۔ اسے پورا یقین تھا کہ ابھی کہیں سے کوئی جانور نکلے گا اور اسے اور اس کی بچی کو چیر پھاڑ ڈالے گا۔ اتنا گھپ اندھیرا اور ایسی گہری کالی رات شاید اس کی زندگی کی آخری رات بننے والی تھی۔ اپنے وجود کے اندر ایک اور وجود لیے اس کا بھاگنا کس قدر دوبھر تھا یہ کوئی اس حال والا جانتا۔ وہ دل سے دعا کر رہی تھی کہ آج اگر موت آنی ہے تو اس سے پہلے زمل کو آ جائے۔ تاکہ اسے اپنے مرنے کے بعد اس کی فکر نہ رہے۔ وہ شہر کی حدود میں داخل ہو چکی تھی۔ لیکن ابھی تک دو رویہ سڑک کے اطراف جھاڑیاں اور درخت ختم نہیں ہوئے تھے۔ اس کے جسم میں شدید درد لپٹیں مار رہا تھا۔ پیروں میں ربڑ کی چپل تھی اور اس یخ بستہ رات میں جسم پہ ایک موٹی شال اوڑھے وہ لاوارثوں سے بھی نچلے درجے پر بے جان دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے زمل کو دیکھا تو اس کا ننھا سا جسم محض ایک اونی فراک اور پاجامے میں ملبوس ٹھنڈ روکنے کے لیے ناکافی تھا۔ وہ اب بھاگ بھاگ کر تھک چکی تھی اس لیے زمل کا ہاتھ تھامے بس گھسٹ رہی تھی۔ ویران سڑک تھی اور بیچوں بیچ دونوں ماں بیٹی اپنی بے بسی اور مجبوری کا سامان لیے چل رہی تھیں!

اللہ توبہ اس کی زندگی تھی یا ہوشربا ڈراؤنی فلم جس کے ہر منظر کے بعد دوسرا پہلے سے زیادہ دہلائے جا رہا تھا۔ اس نے زمل کو خود سے چپکا رکھا تھا۔ آنکھیں پانیوں سے بھر بھر کر رستہ دھندلا رہی تھیں۔ دل کے کسی کونے میں خواہش تھی کہ پیچھے سے کوئی اندھی گاڑی آئے اور ان دونوں کو کچلتی نکل جائے کم از کم زندگی کی صعوبتوں سے چھٹکارہ مل جائے۔ اپنی گیلی آنکھوں کی دھند میں اسے حویلی لکھاں کے مناظر ابھرتے دکھائی دیے!

وہ زمل کے ساتھ کمرے میں تھی۔ رات ہو چکی تھی۔ وہ بس اسے سلانے کی تیاری کر رہی تھی۔ سنہری تینوں وقت کا کھانا خود ہی ایک ٹرے میں رکھ کر چوہدری آفتاب کے برآمدے کے اندرونی حصے میں رکھ جاتی۔ وہاں سے خانم اٹھا کر زمل کو بھی کھلا دیتی خود بھی زہر مار کر لیتی تھی۔ دو دن ایسے ہی گزر گئے تھے شاید اس نے ملازموں کو نہیں بتایا تھا کہ وہ یہاں ہے نا بتانا چاہتی تھی۔ رات اس نے کھانا کھا کر برتن صاف کر کے برآمدے میں رکھے ہی تھے کہ اس نے کسی سائے کو درختوں کے

جھنڈ میں پھرتے دیکھا۔ وہ جھنڈ جو چوہدری آفتاب کی حویلی کے قریب تھا۔ ایک ساتھ کئی وسوسے برچھیوں کی طرح اس کے دل میں اتر گئے۔ وہ ابھی سابقہ تجربات کی بھٹی میں جل رہی تھی۔ تین دن پہلے ہی تو سب کچھ گنوا کر یہاں پہنچی تھی۔ ایسے میں اچانک اس پر وار ہوتا تھا کہ وہ سنبھل بھی نہ پائی تھی۔ وہ بھاگتی ہوئی اندر آئی اور اس نے فوری طور پر سب کھڑکیاں دروازے مقفل کیے۔
اس کا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا لیکن اس نے اپنے حواس مرجھانے نہیں دیے۔ اس بار وہ کسی کو اپنے قریب نہیں آنے دے گی یہ طے تھا چاہے اس بار خود کو جان سے مارے یا سامنے والے کو مار دے۔
برآمدے کا دروازہ جیسے کسی نے دھکا لگا کر کھولنے کی کوشش کی تھی مگر اللہ نے ساتھ دیا تھا وہ کنڈی چڑھا چکی تھی۔ اس نے فوری طور پر ہال کی بتیاں گل کیں کیونکہ یہاں کی روشنی باہر برآمدے میں کھڑے ہو کر صاف دکھائی دیتی تھی۔ کھڑکی کے قریب ہوتے اس نے ذرا سا پردہ ہٹایا اور دیکھنے کی کوشش کی کہ کون تھا جس نے آدھی رات کا وقت چنا تھا اس کی حرماں نصیبی پہ مہر ثبت کرنے کے لیے۔ چوہدری حاکم کا مکروہ چہرہ آدھا چادر میں چھپا اور آدھا صاف دکھائی دیتا اسے اندر باہر سے مجسم کر گیا۔ یہ ملعون یہاں بھی اسے ہراساں کرنے آ چکا تھا لیکن کون جانے یہاں وہ کیسا شیر ہو کر اندر داخل ہوتا۔ پوری حویلی میں وہ اکیلی ایک چھوٹی سی بچی کے ساتھ موجود تھی نہ کوئی ہتھیار نہ کوئی ذی نفس جس کو آواز دے کر مدد کے لیے پکارتی۔ تھک کر وہ دیوار کے ساتھ لگی نیچے فرش پر بیٹھ گئی۔ اسی اثناء میں حاکم نے کھڑکیوں کو دھڑ دھڑانا شروع کیا تھا۔ وہ بس درز ڈھونڈ رہا تھا کہ کیسے بھی اندر داخل ہو سکے اور خانم بے اختیار گھٹنوں میں سر دیے بری طرح رو دی۔ وہ اتنی اکیلی پڑ جائے گی کہ کوئی بھی اسے مفت کا مال سمجھ کبھی بھی نقب لگانے پہنچ جائے گا!

حسنات کی یاد آئی اور اس طرز پر آئی کہ اسے اس کی یاد نے کرب و بلا میں جلا کرنے کے ساتھ ایک اور جذبے کو دل میں پنپنے کی راہ دی۔ اسے پہلی بار حسنات سے نفرت محسوس ہوئی۔ ایسی نفرت جو بے بسی کی انتہاؤں میں لپٹی تھی جس کے گرد اس کی آہوں سسکیوں کا ہالہ تھا۔ اس کی لاچاری اور بے گناہی کی صدائیں تھیں۔ جب کوئی نہیں ہوتا تھا تو وہ ہوتا تھا اور اب جب کوئی نہیں تھا تو اس لیے نہیں تھا کیونکہ اس نے خود اسے اکیلا کر دیا تھا۔ ایک زوردار پتھر کھڑکی کے شیشے پہ آ کر پڑا اور شیشہ ٹوٹ گیا۔ خانم نے ہونٹوں پہ چادر کا پلو دبائے چیخوں کو روکا تھا۔ حاکم کا ہاتھ اندر آیا تھا اور اس ہاتھ نے کنڈی کو ٹٹولا تھا۔ قدرت کی کرنی ایسی تھی کہ کنڈی اس انداز میں ٹوٹی ہوئی تھی کہ وہ کھل نہیں سکتی تھی اس لیے اس کھڑکی کو بند ہی رکھا جاتا تھا۔ ہاتھ واپس چلا گیا اور چند لمحوں بعد پھر اس نے اٹھ کر لرزتے ہاتھوں سے معمولی سا پردہ ہٹا کر باہر جھانکا تو چوہدری حاکم کو تیز قدموں سے اپنی حویلی کی جانب جاتے دیکھا۔ اس کا انداز اور تیزی بتا رہی تھی کہ وہ واپس آنے کے لیے گیا ہے۔ وہ یقیناً کوئی اوزار یا ہتھیار لینے گیا تھا جس کی مدد سے وہ کھڑکی توڑ سکتا یا دروازہ کھول سکتا۔
خانم نے موقع غنیمت جانا۔ یہاں مدد کے لیے کس نے آنا تھا وہ اندر بھاگی اور سوئی ہوئی زل کو اٹھا کر کندھے پر ڈالا اور حتی الامکان آواز پیدا ہونے سے بچاتی وہ دروازہ کھول کر باہر آئی اور مرکزی گیٹ کی طرف چلنے لگی۔ اس کے پاس مختصر سا وقت تھا کہ وہ یہاں سے نکل جاتی۔ پھاٹک کا بڑا سا آہنی کنڈا کھول کر اس نے باہر جھانکا اور ایک دفعہ مارے خوف کے آنکھیں بند کر لیں۔ عزت نہ اندر محفوظ تھی نہ باہر۔ لیکن کردار پر لگا داغ اندر رہ کر دائمی ہو جاتا کہ وہ یقیناً اس کمین کے ساتھ پکڑوائے جانے کے لیے ان حالات سے گزاری جا رہی تھی۔ اس نے سوئی ہوئی زل کے سر پر اپنی

چادر کا پلو دیا اور بھاری وجود لیے وہاں سے نکل پڑی!

اگر پلٹ کر دیکھتی تو اسے اپنے برآمدے میں کھڑی سنہری صاف دکھائی دیتی جو ہاتھ میں تھامی تسبیح ہولے ہولے جھلاتی اسے جاتا دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ایسی کریہہ مسکراہٹ تھی جو کسی کی سانسیں ضبط کر لے۔ سب کچھ سہولت سے ہو گیا تھا۔ یہ تو طے تھا کہ خانم واپس سرخ چوباروں والی حویلی تو نہیں گئی تھی سو خانم نکل گئی تھی سبھی کی زندگیوں سے۔ سنہری کی، قاسم کی، حاکم کی، کشور کی، چوہدری شہاب الدین کی اور اپنے ہمدم حسنات کی بھی۔ اب کسی کی زندگی میں وہ واپس پلٹ کر آنے والی نہیں تھی اس بات کا سنہری کو پکا یقین تھا۔ اپنی چال کی کامیابی پر اسے پورا اعتماد تھا!

اگلا قدم چوہدری حاکم کو یہاں سے نکالنے کا تھا۔ اسے اب یہ حویلی خالی چاہیے تھی۔ صبح قاسم کو پتا چلتا کہ خانم یہاں سے جا چکی ہے تو وہ ظاہری بات تھی اسے بتانے والی تھی کہ رات اس نے حاکم کو چوہدری آفتاب کی حویلی میں داخل ہونے کی کوشش کرتے نہ صرف دیکھا بلکہ اس نے کھڑکی کا شیشہ بھی توڑا تا کہ خانم تک پہنچ سکے۔ قاسم یہ برداشت نہیں کر پائے گا اور حاکم سے لڑ پڑے گا۔ نتیجتاً بات بڑھے گی اور حاکم کو اس حویلی سے نکالنا قاسم کا کام تھا۔ حاکم کا کانٹا خود بخود دور ہو جاتا۔ اس کی اب کسی بھی حوالے سے ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ وہ مفت کا حویلی لکھاں میں جما ہوا تھا۔ اس کا پتر شہروز آ چکا تھا اس لیے پوری حویلی اب اس کے پتر کی تھی باقی وہ اب کسی کو بھی دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔

سنہری نے اپنے ہاتھ جھاڑے تھے اور ہوا کے زور سے کھلے رہ جانے والے پھاٹک کو دیکھتی خانم کو تصور میں سڑک پہ گرتے پڑتے بھاگتے دیکھ رہی تھی۔ کہیں سے کوئی کتا گیدڑ نکل کر نوچ کھائے گا یہ نہ ہوا تو کوئی گاڑی کچل جائے گی اور یہ بھی نہ ہوا تو کسی انسانی شکل کے بھیڑیے کے ہاتھ لگ جائے گی۔ خانم کی زندگی کا باب اب ختم ہوا چاہتا تھا۔ ایک پھانس جو اتنے سالوں سے اس کے جگر میں اٹکی تھی وہ اس طرح نکل چکی تھی کہ اسے خود پہ رشک آ رہا تھا۔ آج اس کا بدلہ حسنات سے بھی پورا ہو چکا تھا۔ جس حسنات نے اسے ذلیل کیا تھا سنہری نے اس کی عزت کو سڑکوں پہ رول دیا تھا اور اسی کے ہاتھوں اس نہج پر پہنچایا تھا۔ اس نے دیکھا دور سے حاکم چوروں کی طرح واپس آ رہا تھا اس کے ہاتھ میں کوئی شے تھی جو وہ یقیناً کھڑکی دروازہ توڑنے کی غرض سے ساتھ لا رہا تھا۔ اسے اب اندر واپس جانا تھا، قاسم کو کال کرنی تھی اور اسے بتانا تھا کہ چوہدری حاکم نے دھاوا بول دیا ہے۔ وہ خود اندر بند ہو چکی ہے۔ نا جانے خانم کا کیا بنا ہو گا۔ چوہدری حاکم وحشی بنا آفتاب کی حویلی کے کھڑکی دروازے توڑ رہا ہے۔ جلدی پہنچو اور آ کر بچاؤ اسے ورنہ کوئی تباہی مچ جائے گی!

وہ ستون کی آڑ میں کھڑی چوہدری حاکم کو مسلسل قریب آتا دیکھ رہی تھی اور دفعتاً اس نے اپنی آنکھوں کو زور سے میچا اس کی زبان تیزی سے حرکت میں آئی اور کچھ پڑھ کر اس نے منہ اونچا کیے آسمان کی جانب زور سے پھونک ماری۔ آن کی آن ایک بڑا سا سیاہ اور بھورا الو اڑتا آیا اور ایسی کریہہ آواز نکال کر وہاں منڈلایا کہ چوہدری آفتاب کے برآمدے میں کھڑا چوہدری حاکم بھی ڈر کر پلٹا تھا لیکن دوسرے ہی پل وہ دوبارہ مشغول ہو گیا تھا۔ الو اڑتا ہوا واپس چلا گیا اور سنہری بھی بنا چاپ کیے اندر جا چکی تھی۔ اب یہاں جو ہونا تھا وہ قاسم اور حاکم کا معاملہ تھا۔ اسے بس یہ معلوم تھا کل حویلی لکھاں میں چوہدری حاکم اور اس کا ٹبر دکھائی نہیں دینے والے تھے اور خانم زندگی بھر اب کسی کو نظر نہیں آنے والی تھی۔!

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

☆☆

مونا نقوی

ڈھنسا چہرے گی آخر

بالوں کو رنگنے والی اسٹریکنگ ہائی لائٹ کیپ سے نکلی لٹوں پہ بڑی سرعت سے بیوٹیشن کی ہیلپر کے ہاتھ چل رہے تھے۔ بال رنگوانے والی کے چہرے پہ الجھن کے ساتھ ساتھ بیزاری واضح عیاں تھی۔ پانچ روز بعد پھوپھی زاد کے بیٹے کی شادی تھی اور شادی پہ مہ جبین کی آمد بھی متوقع تھی جو آنکھوں میں لینز کے ساتھ اسکیننگ مشین فٹ کروا کے پھرتی ہے۔

''لائٹ کلر ہی آئے گا نا بالوں پہ۔'' صوبیہ نے کوئی دسویں مرتبہ پوچھا تھا۔

''جی جی بالکل۔'' ہیلپر نے بمشکل لہجے پر خوش مزاجی کا ریپر لپیٹا۔ ورنہ اس کا جی چاہ رہا تھا کیپ کے سوراخوں سے نکلی اس کے بالوں کی ایک ایک لٹ کو نوچ کے پھینک دے۔

''ہمم۔۔۔ اگر اچھا کلر نہ آیا تو!'' بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے اس نے ایک بار پھر سے پوچھا۔

''آپ فکر نہ کریں آپ کو شکایت ہرگز نہیں ہوگی، ہیر واش ہونے کے بعد۔'' ہیلپر نے ہنوز خوش مزاجی سے کہا۔

صوبیہ نے گردن کو ہلکے سے ہلا کر ''اوکے'' کہا۔ لیکن بے چینی کی شدید اینٹھیں اس کے وجود میں مسلسل اٹھ رہی تھیں۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ بھاگ کے سر دھو آئے اور ہیر کلر کا رزلٹ دیکھے کہ مطلوبہ کلر جو اس نے کہا تھا وہ چڑھا کہ نہیں۔ مگر دل پہ جبر کر کے صبر کیے بیٹھی رہی۔

''پلکنگ کرتے ہوئے بائیں جانب سے بھنویں تھوڑی زیادہ ریموو نہیں ہو گئیں۔ دیکھیں فرق لگ رہا ہے نا۔'' بھنوؤں پہ اچانک ہی اس کی نظر پڑی اور اسے بیوٹیشن کی ہیلپر کی کوتاہی نظر آ گئی۔

''نہیں تو میم، برابر ہے دونوں سائیڈ سے پلکنگ۔'' پلکنگ کرنے والی لڑکی نے گھبرا کر آگے بڑھ کر آئی بروز کو انگلی کی مدد سے سیٹ کرتے ہوئے کہا۔

''جانے مجھے کیوں لگ رہا ہے۔'' اس نے اس انداز میں کہا جیسے اس کی بات پہ یقین نہ آیا ہو۔

''آپ بے فکر رہیں لڑکیاں ٹرینڈ ہیں۔ اب تو برائیڈل میک اپ بھی چابک دستی سے کر لیتی ہیں۔'' صوبیہ کو یقین دلوانے کے لیے بیوٹی سیلون کی مالکن نے کہا۔

''کراچی جانا ہے شادی پہ۔ ہزاروں لگا کے بھی خاندان سے باتیں تھوڑی نا بنوانی ہیں۔'' صوبیہ نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

''یہ آپ کی خام خیالی ہے مسز انصاری، وگرنہ پلکنگ، فیشل، میڈی کیور۔۔۔ پیڈی کیور سے لے ہیر کلر تک سب پرفیکٹ ہے۔'' ہیر اسٹریکنگ ہائی لائٹ کیپ کو اتارتے ہوئے بیوٹیشن کی ہیلپر نے کہا۔ وہ اندر تک اس سے چڑی تھی مگر پیشہ ورانہ اصول کے تحت مسکرا کر بولی۔

''اللہ کرے ایسا ہی ہو۔'' بینچ پر لیٹ کر واشنگ ٹب میں سر رکھتے ہوئے وہ ایسے بولی جیسے اس کی بات کا یقین نہ آیا ہو۔

بال واش ہونے سے لے کر ہیر ڈرائیر سے بال خشک ہونے تک بمشکل صبر کیے وہ چپ بیٹھی رہی۔ ہیلپر اسٹریٹنر سے بال اسٹریٹ کرتے ہوئے

digest library.com

اس کی خاموشی کو غنیمت جان رہی تھی اور اس کی جانب سے اک ہی جملہ سننے کی منتظر تھی۔

"واوا کمال کر دیا۔"

"ارے یہ کلر تو نہیں کہا تھا میں نے الائچی کلر کہا تھا۔" وہ اس طرح چلا کے بولی جیسے سر بازار کسی نے اس کی تمام جمع پونجی لوٹ لی ہو۔

"یہی تو الائچی کلر ہے میم۔" اس بار بیوٹی سیلون کی مالکن میڈم روزی نے آگے بڑھ کر کہا۔

"لیکن بالوں پہ گرین گرین شیڈ آ رہا ہے۔" اس نے سر کو دائیں گھما کر قد آدم شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر کہا۔

"یہی اصل الائچی کلر۔" میڈم روزی نے اس بڑا کتاہٹ سے کہا۔

"دیکھیے میم، پیسے درختوں پہ نہیں لگتے۔ پورے پندرہ ہزار دے کر بھی من چاہا کلر نہ آیا تو پیسے تو گئے نا کھوہ کھاتے میں۔" اس نے خود کو تپش میں آنے سے ہر ممکن روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"کلر سوٹ کر رہا ہے آپ کی گولڈن رنگت پہ مسز انصاری۔" اک اور ہیلپر نے آگے بڑھ اس کے بالوں کو تھوڑا پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

"کلر چینج نہیں ہو سکتا کیا۔" اس نے منت آمیز انداز میں کہا۔

"کم از کم ایک دو ہفتے کے بعد ہی کوئی دوسرا کلر اپلائی کیا جا سکتا ہے بالوں پہ، ایک بار کلر ہونے کے بعد۔ لیکن آپ کو میرے خیال میں دو تین ماہ بعد ہی دوبارہ کلر لگوانے کا سوچنا چاہیے۔ پہلے ہی آپ کے بال کلرز کروا کروا کے بہت ہی ڈیمج ہو چکے ہیں۔" میڈم روزی نے اپنے تئیں اچھے سے سمجھا دیا تھا۔

"پرسوں شادی پہ جانا ہے۔ کل کس وقت آ جاؤں۔" صوبیہ نے لجاجت سے کہا۔

"کل دو برائیڈلز کی بکنگ ہے۔ معذرت کل ٹائم نہیں دے پائیں گی۔" میڈم روزی کا انداز نا چاہتے ہوئے بھی جان چھڑانے والا ہو گیا۔

صوبیہ برا سا منہ بنا کر جمعت کر کے سلیقے سے

سر پہ چادر جما کر سیلون سے باہر نکلی تو گھر والے کیا ریمارکس دیں گے سوچ سوچ کر اس کا جی گھبرا رہا تھا۔ سیلون کے دروازے سے لاک کھول کر گھر کے اندر داخل ہونے تک وہ بے طرح جھنجلائی رہی تھی۔

☆☆☆

''حد ہو گئی محترمہ کوئی ایسے بھی گھر سے دیس نکالا لے کر نکلتا ہے کیا؟ گیارہ بجے کی گئیں شام پانچ بجے لوٹ رہی ہیں آپ۔'' لاؤنج میں انٹر ہوتے ہی شوہر نامدار کی آواز کانوں سے ٹکرائی۔

''کسٹمر زیادہ تھے، لیٹ نمبر لگا۔'' وہ صاف گوئی سے جھوٹ بول کر گزر جانا چاہتی تھی۔

''ارے جو ہمارے پیسوں کو اتنا دریا دلی سے بہا کر آئی ہیں ذرا اس کا رزلٹ بھی تو دکھائی جائیے۔'' شوہر کا جملہ زخموں پہ نمک کی طرح جا لگا تھا۔

''تا کہ آپ کو چار باتیں اور سنانے کا موقع مل جائے۔ غضب خدا کا۔ پورا مہینہ گھر اور بچے سنبھالو۔ کنجوسی کر کر کے خرچ اخراجات کرو مگر چار پیسے خود پہ لگا لوں تو طعنے تشنے شروع ہو جاتے آپ کے۔''

وہ غصہ سے برس پڑی تھی جب کہ تفہیم انصاری نے کچھ ایسا غلط بھی نہ کہا تھا۔ انہیں بھی سجی سنوری صوبیہ ہمیشہ بھاتی تھی۔

''اوفوہ امما، آہستہ بولیں چھت تک آواز جا رہی ہے آپ کی۔'' تیرہ سالہ رانیہ ماں کی آواز سن کر تیزی سے چھت سے سیڑھیاں اتر کر آئی۔

''میری بلا سے۔'' بیٹی کو گھورتے ہوئے وہ اتنا بول کے چپ ہو گئی۔

''واہ! کیا شاندار کلر ہے۔ جیسے اوس سے جھلکتی صبح کی سنہری دھوپ میں چمکتی گھاس۔'' اٹھارہ سالہ جاذب ہاتھ میں ریکٹ پکڑے لاؤنج میں انٹر ہوتے ہی ماں کے بالوں کو دیکھ کر بولا۔ بے خیالی میں اس کے سر سے چادر سرک گئی۔

تفہیم انصاری بمشکل اپنی ہنسی روک پائے۔

''ادھر آ کسی شاعر کی اولاد۔ ماں سے بات کرنے کی تمیز نہیں تجھے۔'' دانت بھینچ کر صوبیہ نے جھٹ سے جاذب کے کان کھینچے۔

''اف امما، کان چھوڑیں میرا۔ تعریف ہی تو کی ہے۔ آپ تو برا مان گئیں۔'' مسکین صورت بنائے جاذب نے کہا تو وہ کان چھوڑ کر منہ پھلا کر صوفے پہ بیٹھ گئی۔

''آج بھوک ہڑتال کا ارادہ ہے کیا۔'' تفہیم نے پیٹ میں دوڑتے چوہوں کو پیٹ پہ ہاتھ پھیر کر سہلاتے ہوئے کہا۔

''میرے قد کے برابر ہو چکی ہے آپ کی دختر نیک اختر۔ سامان لا دیتے، پکا دیتی یہ کچھ۔ ایک چھٹی کے دن مجھے چھٹی نصیب نہیں۔'' صوبیہ نے گھور کر باپ بیٹی کو دیکھ کر کہا اور کچن کی جانب بڑھ گئی۔

شوہر اور بچوں کے ہنسنے کی آواز نے کچن تک اس کا پیچھا کیا۔ وہ پلٹ کے نہایت سست سنانا چاہتی تھی مگر اس وقت اسے بھی کچھ کھانے کی طلب ہو رہی تھی اس نے کل کا پڑا سوپ فریج سے نکال کر اوون میں رکھ کر اوون آن کر دیا تھا۔

☆☆☆

''تفہیم! دیکھیں اچھی لگ رہی ہوں نا۔'' کوئی ساتویں بار صوبیہ نے آئینے میں اپنا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ لائٹ گرین شیفون کے لباس میں ملبوس کندھوں تک جھولتی لٹوں کو انگلیوں کی مدد سے سیٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

''اب کیا سونے کی روشنائی سے حروف زریں میں لکھ کے بتاؤں کہ بہت اچھی لگ رہی ہو، تب یقین آئے گا کیا؟'' تفہیم نے چڑچڑے پن سے کہا۔

''ہاں جی میری تعریف کرتے ہوئے تو زبان جلتی ہے آپ کی۔'' وہ اچھا خاصا برا منا کر بولی۔

''ایک دم پٹاخہ لگ رہی ہو۔ ایسی حسین کہ راہ چلتے دل پکڑ کر رہ جائیں گے۔''

وہ لاہور سے کراچی تک کے سفر کو کسی بدمزگی

کے ساتھ نہیں گزارنا چاہتا تھا تب ہی خوشامدی انداز اپناتے ہوئے رسیلے لہجے میں گویا ہوا۔

"رہنے دیجیے، یہ چھچھورا انداز، عذرا پروین کے لیے سنبھال رکھیے۔ ہوگی وہاں اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ۔"

سانولی سی عذرا پروین سے خار کھانا اس کا مسئلہ عظیم تھا اور تفہیم کو باور کرانا مقصد اولین۔ شادی کے ابتدائی دنوں میں ہنسی مذاق میں اپنے اور عذرا پروین کے بچپن کی کچی محبت کے قصے خوب نمک مرچ اور مسالے لگا کر سنانے کا خمیازہ وہ تین بچوں کی پیدائش کے بعد اور ان کے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے تک بھگت رہے تھے۔

"عذرا پروین تمہاری جان کا وہ خلجان ہے جسے تم قبر کے کنارے پر دہرانا لازمی سمجھوگی۔" کنگھے کو سنگھار میز پر تقریباً پٹختے ہوئے کہہ کر وہ اٹیچی گھسیٹ کر کمرے سے باہر نکل گئے۔

"امی! اس ٹاپک پہ بات کرنا ضروری تھا کیا۔ شادی والے گھر جا رہے ہیں، خاک اچھا سفر گزرے گا جو منہ بنا کے بیٹھے ہوں گے آپ دونوں۔" رانیہ نے ہینڈ بیگ ماں کی جانب بڑھاتے ہوئے رکھائی سے کہا۔

"باپ کے موڈ کی فکر رہتی ہے تم سب کو۔ ماں کے دل پہ کیا گزر رہی، کبھی یہ نہ سوچنا۔" ہینڈ بیگ تقریباً جھٹکتے ہوئے وہ غصے سے بولی تو جاذب نے ہونٹوں پہ انگلی رکھ کر بہن کو چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

☆☆☆

سفر جیسے تیسے گزر گیا بچے بھی کزنز سے مل کے خوش ہو گئے مگر صوبیہ کا پہلا سامنا ہی عذرا پروین سے ہوا اندر تک جلا گیا اسے۔ جبکہ وہ بے چاری بہت محبت سے اسے گلے ملی۔ اس کے نکھرے نکھرے حسن کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے مگر صوبیہ کو تو اس کا بولنا کوفت میں مبتلا کر رہا تھا، بک دکھائی کو مسکرا کے شکریہ بول کر وہ صوفے پہ لسمی سی گئی۔ عذرا کی بڑی بیٹی جھٹ سے سب کے لیے کولڈ ڈرنکس گلاسوں میں ڈال کے لے آئی۔

"ماشاء اللہ سلیقے قرینے میں عذرا کا پرتو ہے انیقہ۔" پھوپی زاد ریحانہ نے تفہیم کو بطورِ خاص دیکھتے ہوئے کہا۔

"ماشاء اللہ جیتی رہو بیٹی۔" تفہیم نے شفقت سے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا تو صوبیہ کی کڑی نظر خواہ مخواہ تفہیم کی جانب اٹھ گئی۔

"اور سناؤ تفہیم، اب بھی تمہاری سوتے میں اٹھ کر چلنے کی عادت ہے؟ یاد ہے جب ہم بچپن میں خالہ شرافت کے بیٹے کی شادی پہ گئے تھے سب بچوں کو اوپری منزل کی چھت پہ سلایا تھا بڑوں نے کہ کھیلتے رہیں اور بڑوں کو تنگ نہ کریں۔ نجانے کس پہر ہم تھک ہار کے سوئے۔ صبح سحری سے پہلے میری آنکھ کھلی تو کیا دیکھا کہ جناب چلتے چلتے چھت کے کنارے پہنچنے والے ہیں۔ آواز دیتی تو ڈر کہ آگے گرنے کا خطرہ تھا۔ بھاگ کے جلدی سے ان کا ہاتھ پکڑ کے پیچھے کھینچا۔ لڑکھڑا کے گرے تو آنکھ کھلی اور بولے میں کہاں ہوں۔۔ میرے اماں ابا کہاں ہیں۔" عذرا وہ منظر یاد کرتے ہوئے آخری جملے پہ قہقہہ لگا کے بولی۔

"تم نے کہا تھا کہ تم خالہ شرافت کے گھر کی چھت پہ ہو۔ اگر مجھے اٹھنے میں ذرا دیر ہو جاتی تو تمہیں آسمانوں میں اڑ رہے ہوتے۔"

تفہیم کو بھی وہ منظر برسوں پیچھے لے گیا۔ گول مٹول سی عذرا اسی لمحے انہیں بھا گئی تھی۔ کیونکہ اس لمحے اس نے نئی زندگی بخشی تھی انہیں۔ کمرے میں موجود خواتین اور بچے بھی یہ واقعہ سن کے کافی محظوظ ہو رہے تھے۔ سوائے صوبیہ کے جو جگ دکھائی کو بھی نہیں مسکرا رہی تھی۔

"ماما! آپ کو عذرا آنٹی کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ آپ کے سرتاج کو ان کی بدولت دوسری زندگی ملی۔ اور ہم تین نگینوں کو اس دنیا میں آنے موقع ملا۔" جاذب نے ماں کے جلے پھپھولوں پہ پانی ڈالنے والے انداز میں کہا۔

"ہٹ بے شرم کہیں کا۔۔۔ بڑوں میں بیٹھ کر بات کرنے کی تمیز سیکھ۔" بجائے شرمانے لجانے کے اس نے بیٹے کو جھڑکتے ہوئے کہا۔ تو جاذب کے ساتھ ساتھ کمرے میں موجود سب پہ خاموشی طاری ہو گئی۔

"ایسا کچھ غلط بھی نہیں کہا جاذب نے۔ شغل شغل میں بول دیا۔ ادھر آ میرا بیٹا، پہلے تو ایسے نا نہ تھی پتا ہے ہم سب کزنوں میں سب سے زیادہ شغل میلہ لگانے والی یہی ہوا کرتی تھی۔" ریحانہ نے جاذب کا اترا چہرہ دیکھا تو پیار سے پچکار کر پاس بٹھاتے ہوئے کہا۔

"اب مزاج شریف ساتویں آسماں پر پہنچ چکا ہے۔ اٹھارویں گریڈ کے سرکاری آفیسر کی زوجہ محترمہ جو ٹھہریں۔" ناچاہتے ہوئے بھی تفہیم کا لہجہ نمکین سا ہو گیا تھا اور صوبیہ کو اس جملے کی تلخی دل میں کھلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

"تھک گئے ہو گے تم لوگ، آرام کرو میں کھانے کا انتظام کرواتی ہوں۔" ریحانہ نے مزید بدمزگی بڑھنے سے پہلے کہا۔

☆☆☆

"آخر عذرا پروین کے لیے کھولتی تلخی کب تمہارے دل سے بجھے گی۔؟ کس قدر اپنائیت سے ملتی ہے وہ تم سے اور تم کس بے رخی سے جواب دیتی ہو۔" کمرے میں آ کر منہ پھلائے بیٹھی صوبیہ کو دیکھ کر تفہیم نروٹھے پن سے بولے۔

"تو آپ کا دل کیوں جلتا ہے۔؟ دو عورتوں کا آپسی معاملہ ہے۔۔۔ آپ کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔" آئینے کے سامنے بیٹھی اس بار وہ نائٹ کریم چہرے پہ لگاتے ہوئے بولی۔

"دو عورتوں کا آپسی معاملہ نہیں، فقط ایک عورت کی نفرت اور کم ظرفی کا معاملہ ہے۔ صوبیہ خاتون اپنے ذہن و دل پہ لگے عناد کے جالے اتار پھینکو اتنے عرصے بعد خاندان میں جو خوشی کا موقع آیا ہے اسے سب کے ساتھ مل کے انجوائے کرو۔"

اس بار تفہیم نے بردباری سے سمجھایا۔

"آپ کو اس بات کی اتنی فکر کیوں ہے میرے اس لہجے اور رویے سے، عذرا پروین کو کوئی تکلیف ہوئی ہوگی۔ آخر اس عورت کے لیے آپ کے دل میں اتنی ہمدردی اور نرم گوشہ کیوں ہے؟" وہ تنک اس کے سامنے کھڑی ہو گئی تھی اور اس سے سوال کناں تھی۔

"تم سے کچھ بھی کہنا بھینس کے آگے بین بجانے کے مترادف ہے۔ تمہارا الٹا دماغ جیسے چلتا ہے ویسے ہی چلتا رہے گا۔ کوئی اچھی بات اس میں فٹ نہیں آ سکتی۔" دبے دبے غصے میں کہہ کر وہ سرتاپا چادر لپیٹ کر کروٹ بدل کے لیٹ گئے۔

"خوب جانتی ہوں تفہیم انصاری صاحب، پہلی محبت وہ شجر ہوتی ہے جسے کاٹ کے پھینک بھی دیا جائے تو اس کی جڑیں پھر بھی دل کو گہرائیوں سے جکڑے رکھتی ہیں اور کسی نہ کسی موسم میں پھر سے پھوٹنے کو تیار رہتی ہیں۔" وہ دل میں سوچ کے رہ گئی۔

نیند اس کی آنکھوں کی سرحد سے کوسوں دور تھی۔ عذرا پروین کی اس گھر میں موجودگی اسے کھل رہی تھی۔ وہ اسی شہر میں ہونے کے باوجود مہمانوں سے بھرے پرے گھر میں رات ٹھہرنے کے لیے رک کیوں گئی۔

"صرف تفہیم کی وجہ سے۔" اک جھنجھناتا سا جملہ اس کی سماعتوں سے ٹکرایا۔ اس نے لاکھ جھٹلانے کی کوشش کی مگر یہ جملہ اس کا سکون غارت کر رہا تھا۔ جب سے وہ بیوہ ہوئی ہے اس کا وہم بڑھ سا گیا تھا۔ وہی جوانی والا چلبلا پن قائم تھا اس کا۔ تفہیم کو کہیں پٹڑی سے اتار نہ لے۔ وہ کچھ بھی منفی سوچنا نہیں چاہتی تھی مگر نجانے کیوں سوچے ہی جا رہی تھی۔

☆☆☆

مہندی کی وہ صبح صوبیہ کے لیے قیامت لے آئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں سجے، سنہرے خواب

digest library.com

کسی مالا کی طرح ٹوٹ کر بکھر چکے تھے۔ آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر خشک ہو چکے تھے۔ زبان گنگ تھی۔ شادیانے بجنے کے بجائے گھر میں ماتمی ماحول تھا۔ شیراز گھر میں دلہن لے آیا تھا جبکہ صوبیہ مایوں کے لباس میں سفید لٹھے سا چہرہ لیے قریب المرگ معلوم ہو رہی تھی۔

"ایک بار بھی نہیں سوچا تم نے صوبیہ کے متعلق یہ حرکت کرنے سے پہلے۔؟" چچا جان نے "بار" لفظ پہ زور ڈالتے ہوئے غصیلے لہجے میں بھتیجے سے پوچھا۔

"اسی کے متعلق سوچا تب ہی تو یہ قدم اٹھایا۔ مجھ سے شادی کر کے اسے کیا ملنا تھا۔ نہ محبت، نہ اپنائیت اور نہ ہی توجہ۔ میں نے اس کی زندگی کو ایک غلط فیصلے کی بھینٹ چڑھنے سے بچانے کے لیے یہ قدم اٹھایا ہے۔" شیراز مجرم بنا اپنا دفاع کرتے ہوئے صحن کے بیچوں و بیچ کھڑا کہہ رہا تھا۔

صوبیہ کے خشک سوتوں سے ایک قطرہ آنسو نہ ٹپک پا رہا تھا۔

"اسے گھر میں لانے سے بہتر تھا تو خود بھی اس دنیا کی بھیڑ میں اسے لے کر کہیں گم ہو جاتا۔ خاندان بھر کے سامنے ہمیں رسوا نہ کرتا۔ ہماری تربیت پہ انگلیاں نہ اٹھواتا، آوازیں نہ کسواتا۔" صوبیہ کے والد گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

تایا کے اس طرح رونے پہ شیراز کا دل بھی پھٹ رہا تھا مگر وہ صوبیہ کو دھوکا نہیں دینا چاہتا تھا۔ جس لڑکی کے لیے اس کے دل میں محبت نہ تھی وہ کیسے اسے من کے سنگھاسن کی ملکہ بنا کے رکھ سکتا تھا۔

اس نے ثمرین سے محبت کی تھی، ساتھ نبھانے کا عہد کیا تھا جسے سب کی مخالفت لینے کے باوجود اس نے پورا کیا تھا۔ اب سب کے روتے چہرے اسے ڈرا رہے تھے۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا اپنی ہمسفر کو لے کر گھر سے نکل جائے یا اجازت ملنے کے انتظار میں رکا رہے۔

کمرے میں بیٹھی صوبیہ اپنے مستقبل کو لے کر فکرمند زیادہ تھی یا لوگوں کے طعنوں تشنوں کا سوچ کے خوف زدہ زیادہ۔ وہ خود بھی اندازہ نہیں لگا پا رہی تھی۔ وہ دل ٹٹول رہی تھی کہ شیراز کو بے وفا سمجھے یا وہ مسیحا جس نے اسے مستقبل میں اس شادی کے نتیجے میں اٹھائی جانے والی کلفتوں سے بچا لیا تھا۔ اس کا ذہن ماؤف تھا اور زبان کوئی بھی بین کیے جانے سے انکاری اور آنکھیں سوگوار ضرور تھیں لیکن آنسو بہانے سے گریزاں۔

☆☆☆

"صوبیہ کیسی ہے۔؟" عذرا پروین کو صوبیہ کے کمرے سے نکلتا دیکھ وہ فٹ سے اس کے سر پہ جا پہنچا۔

"بت بنی بیٹھی ہے۔ ایسا دھچکا اور کیا کر سکتا ہے سوائے اوسان خطا کرنے کے۔" عذرا پروین نے نہایت افسردہ لہجے میں کہا۔

"شیراز کو اگر شادی نہیں کرنی تھی تو نوبت اس موقع تک لایا ہی کیوں۔ عین شادی کی تاریخوں میں یہ کارنامہ کیا اس نے سارے خاندان کے سامنے۔" تفہیم کو شیراز پہ غصہ آ رہا تھا۔ اور صوبیہ کی حالت کا سن کے افسوس۔

"تو چاہے تو صوبیہ کے دل کی مرجھائی کونپل کو نئی زندگی بخش سکتا ہے۔" اس نے اداس سے کھڑے تفہیم کو دیکھ کر کہا۔

"کہنا کیا چاہتی ہو۔؟" عذرا کے بات کرنے کے انداز سے وہ اس کا اشارہ بھانپ گیا۔

"اپنی امی سے کہہ کے صوبیہ کا رشتہ مانگ لو اپنے بڑے ماموں سے۔ خاندان کی عزت بھی بچ جائے گی اور صوبیہ کا مستقبل بھی سنور جائے گا۔" نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا لہجہ روہانسا ہو گیا تھا۔

"زندگی کوئی فلم، ڈرامہ یا ناول نہیں کہ ہیروئن کی بارات لوٹ جائے اور میں ہیرو بن کر ماموں جان کے سامنے اپنی خدمات پیش کر دوں۔ اور تم جانتی ہو میں نے اپنی شریک حیات کے لیے تمہارا انتخاب برسوں سے کر رکھا ہے اور امی جان کو بھی بتا چکا ہوں میں یہ بات۔" عذرا پروین کو کندھوں سے

پکڑ کر آخر میں وہ باور کرواتے ہوئے بولا۔
"زندگی میں جو ہم سوچیں ضروری تو نہیں کہ ویسا ہو بھی۔اس وقت اک زندگی بچانے کا معاملہ ہے۔اور وہ بھی کوئی غیر نہیں تمہاری ماموں زاد ہے۔" اپنے کندھوں سے تفہیم کے ہاتھ ہٹاتے ہوئے وہ بجھی ہوئی۔
"میں اک جیتا جاگتا انسان ہوں جو پور پور تمہاری محبت میں گرفتار ہے کوئی قربانی کا جانور نہیں کہ خوشی خوشی اپنی خوشیاں قربان کر دوں۔" اس بار وہ نروٹھے پن سے منہ پھلا کے بولا۔
"محبت کا دوسرا نام قربانی ہی ہے۔وہ محبت کیسی جو قربان ہونے کے ہنر سے ناواقف ہو۔ہم دونوں محبت بھری زندگی جی لیں گے مگر میرے دل میں قلق رہ جائے گا کہ میں صوبیہ کی زندگی بدلنے کے لیے کوشش کر سکتی تھی۔اسے دائمی خوشیاں دے سکتی تھی۔لیکن میرا ہمسفر قربانی کے جذبے سے عاری تھا۔اس نے اپنی محبت قربان کرنے کے بجائے بڑوں کے سروں میں دھول جھونکے جانے سے لطف اندوز ہونا زیادہ ضروری سمجھا۔" اس نے اس اس بار ناک کر نشانہ لگایا تھا۔
"تمہارے کہنے کا مطلب میں خود غرض ہوں۔اس سارے واقعہ پہ میرا دل افسردہ نہیں؟ عذرا پروین، اگر تمہاری خوشی اسی میں ہے کہ میں قربانی کا دنبہ بنوں تو جیسے تمہاری مرضی۔اگر تم قربانی کے جذبے سے لیس ہو تو کم مجھے بھی نہیں پاؤ گی۔نا صرف صوبیہ کو اپناؤں گا بلکہ تمام عمر ملکاؤں کی طرح رکھوں گا بھی۔"
اور وقت نے ثابت کیا۔کہ تفہیم اپنی اس بات پہ سو فیصد پورا اترا۔ریحانہ نے صوبیہ کی چچازاد کو کانوں سنی من وعن کہہ سنائی یوں۔جیسے کل کی بات ہو۔
"پھر تو صوبیہ کو عذرا پروین کا شکر گزار ہونا چاہیے۔اور یہ ہے کہ ایک آنکھ نہیں بھاتی وہ اسے۔" خالدہ نے افسوس بھرے انداز میں کہا۔
"وہ عذرا کی اتنی بڑی قربانی سے ناواقف ہے۔اگر جانتی ہوتی تو اس کے قدموں کی خاک ماتھے پہ لگاتی۔"
وہ اتنا سن کے خاموشی سے پلٹ آئی تھی۔شادی شدہ زندگی کے انیس سال اس نے اپنی مسیحا کی نفرت میں جلتے کلستے گزار دیے تھے بلکہ اس سے سامنا ہونے پر نہایت سخت سست سنانے سے بھی گریز نہیں کیا۔کاش تفہیم، تم نے یہ نہ کہا ہوتا کہ مجھے جلانے کے لیے عذرا پروین کی تعریف کرتے ہو۔اک بار سچ بتا دیا ہوتا مجھے تو تاعمر اپنے گزشتہ رویے پہ پچھتانا نہ پڑتا اب۔مجھے اس سے معافی مانگ لینی چاہیے۔کچھ تو ملال کم ہوگا دل سے۔وہ کچھ سوچ کے کمرے سے نکل آئی تھی اور اب مہمان عورتوں کی بھیڑ میں اسے کھوج رہی تھی۔
☆☆☆
"بہت حسین لگ رہی ہو۔" عذرا کو آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر جھمکے پہنتے دیکھ کر صوبیہ نہایت ملائمت سے بولی۔
"صبح صبح اٹھ کے لسی پی لی ہے کیا۔؟ میں تو موٹی ہوں، بھدی ہوں اور نجانے وسیم نے کیا دیکھ کر مجھ سے شادی کی تھی۔" وہ کل اک رشتہ دار کے سامنے اس پر کیا گیا صوبیہ کا تبصرہ سن چکی تھی۔
"مجھے معاف کر دو۔۔یہ میری سوچ کا بونا پن تھا جو ایسے بولی۔ورنہ تم تو پاکیزہ روح ہو۔ظاہری اور باطنی حسن سے مالا مال۔جس دل میں بس جاؤ تمام عمر پوجے جانے کے لائق۔" نگاہوں میں تشکر کے جذبات لیے وہ بولے جا رہی تھی۔
"تم یہ سب بولتے ہوئے بالکل اچھی نہیں لگ رہیں صوبیہ۔مجھے دیکھ کر ناک بھوں چڑھاتی، نفرت کی چنگاریاں آنکھوں سے نکالتی زیادہ کیوٹ لگتی ہو مجھے۔" عذرا نے شرارت سے مسکراتے ہوئے دوپٹے کو کندھے پہ اچھے سے سیٹ کرتے ہوئے کہا۔
"شرمندہ تو نہ کرو یار، میں سچ مچ دل سے معذرت کرنے آئی ہوں۔مجھے معاف کر دو۔" اس

کا ہاتھ نرمی سے دباتے ہوئے وہ ملتجیانہ لہجے میں گویا ہوئی۔

''میں کبھی تم سے ناراض ہی نہیں ہوئی تو معافی کس بات کی؟ اپنے دل میں کسی قسم کا ملال یا پچھتاوہ نہ لاؤ۔ پرسکون رہو۔ میں راضی تم سے اور میرا رب بھی تم سے راضی ہو۔ اب جلدی سے تیار ہو جاؤ بارات نکلنے ہی والی ہے۔'' اپنے نرم ہاتھوں سے اس کے گال تھپتھپاتی وہ کمرے سے نکل گئی۔

اس کا دل اس کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے اس کی تعظیم کو جھک گیا تھا۔ کچھ لوگ واقعی وفا اور محبت کی مٹی سے گندھے ہوتے ہیں جنہیں اپنے احسانات جتانا نہیں آتا بلکہ وہ آپ کو یہی باور کرواتے ہیں جو تم نے پایا تم اس کے اہل تھے تو تمہیں ملا اور تمہاری اس کامیابی میں ان کا ذرا سا حصہ بھی نہیں۔ اور عذرا پروین کا شمار بھی انہی لوگوں میں ہوتا ہے۔

☆☆

digest library.com

''سامان پیک کر کے رکھ لو، کل ولیمہ کے فنکشن ختم ہونے کے بعد ہی نکل جائیں گے گھر کے لیے۔'' تفہیم نے بیڈ پہ دارز ہوتے ہی حکم صادر فرمایا۔

''کل نہیں! تین چار دن بعد چلیں گے۔ ایک دو رشتہ داروں کی طرف بھی جانا ہے اور ایک ضروری کام بھی نپٹانا ہے مجھے۔'' وہ شرارت آمیز انداز میں گویا ہوئی۔

''خدا خیر کرے! ایک دو رشتہ داروں سے ملنا تو بات سمجھ میں آتی ہے۔۔ لیکن کام نپٹانا میں کوئی گڑ بڑ گھوٹالا ٹائپ کی وائبز آ رہی ہیں مجھے۔'' تفہیم نے ایک دم سے اٹھ کے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ہاہاہا گڑ بڑ گھوٹالا نہیں، پیار کا پیچ نامہ ٹائپ کچھ ہو سکتا ہے۔'' وہ شرارت سے ایک آنکھ دبا کر بولی۔

''نا کرو زوجہ محترمہ، پہلے ہی عذرا پروین سے تمہارے بہناپے والے سینز ہضم نہیں ہو پا رہے مجھ سے۔ کیا چپک چپک کے اس کے ساتھ سیلفیاں لے رہی تھیں تم افففف۔''

''اب سوچ رہی ہوں اس بہناپے والے تعلق کو کسی مضبوط رشتے کی مالا میں پرو کر کس کر گانٹھ لگا دوں۔'' اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے مصنوعی گانٹھ لگاتے ہوئے کہا۔

''کیسا رشتہ۔۔ کیسی گانٹھ۔۔ کچھ وضاحت فرمانا ضروری سمجھیں گی۔'' تفہیم نے ناسمجھی سے پوچھا۔

''سمدھن والا رشتہ کیسا رہے گا۔'' اس نے بنا مسٹری کریئٹ کیے کہا۔

''آ۔۔۔ج صبح یاد کرو تمہارے سر پہ کچھ وزنی چیز تو نہیں گری جس نے تمہاری پچھلی یادداشت ختم کر دی ہو۔'' وہ فکرمند ہو کر اس کے قریب چلے آئے۔

''میں جو کچھ بھی کہہ رہی ہوں بقائم ہوش و حواس کہہ رہی ہوں۔ مجھے انیقہ جاذب کے لیے بہت پسند آئی ہے۔'' اس اپنے شوہر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

صاحبزادے سے بھی پوچھا ہے کہ من ہی من میں ڈھول تاشے بجاتی سوچ رہی ہو۔'' تفہیم نے شرارتی انداز میں کہا۔

''پوری شادی میں انیقہ کو لے اس کی آنکھوں میں در آنے والی چمک سے اندازہ لگالیا ہے میں نے کہ اسے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ اسے بھی پسند آئی ہے تو عذرا پروین کی بیٹی۔ چاہے جو ہو جائے خون اپنا اثر دکھا کے چھوڑتا ہے۔'' صوبیہ نے بھی شرارت سے کہہ کر لب بھینچ لیے۔

''صوبیہ بیگم باز آجایئے۔'' تفہیم نے بیڈ سے سرہانا اٹھا کر اس کی طرف پھینکا جسے اس نے کیچ کر لیا۔ دونوں کی بے ساختہ ہنسی سارے کمرے میں گونج گئی۔

برسوں سے اس کے دل پہ تنی خود ساختہ نفرت کی دھند بالآخر چھٹ گئی تھی اور اس نئے رشتے کو خوش آمدید کہنے کے لیے پرجوش تھی۔ اور اس تعلق کو دائمی بہار میں پھلنے پھولنے اور پنپتے رہنے کے لیے دعا گو بھی۔

☆☆

Digest Novels Lovers Group

ثنا صادق

ادھورے رشتے

مکمل ناول

"آج ولید آرہا ہے رات کے کھانے پر، کچھ اچھا سا انتظام کر دینا۔"

میں پانی کا گلاس بھر کر فریج کا دروازہ کھول کر کچھ کھانے کا ڈھونڈ رہی تھی، سامنے دال چاول میرا منہ چڑھا رہے تھے، اسی دوران امی کی ہمیشہ کی طرح سپاٹ آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی۔ اور دل چاہا کہ بھرا ہوا پانی کا گلاس دیوار پر دے ماروں یا دال کی پتیلی سر پہ انڈیل لوں۔ امی شاید پیچھے کھڑے ہوئے میرے تاثرات ناپنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"آپ کے چہیتوں کی خدمتیں کرنے کا نہ مجھے شوق ہے اور نہ وقت۔ کھانا کھانے کا سوچ رہی تھی، اپنے حصے کے دال چاول چھوڑ رہی ہوں یہی کھلا دیجیے گا اس منحوس کو۔"

میں نے بمشکل خود کو قابو کیا اور فریج کا دروازہ پٹخ کر کچن سے باہر نکل گئی۔

"باسم۔ باسم۔ تمہیں روز کیا انویٹیشن دے کر پڑھنے کے لیے بلانا پڑے گا، ایک ٹائم پتا ہے نا، آجایا کرو پڑھنے ٹائم سے ورنہ خود ہی پڑھنا کل سے۔" میں نے باقی غصہ اوپر ماموں کے بیٹے پر نکالا تاکہ امی کو نظر انداز کر سکوں۔ لیکن وہ بھی ماں تھیں میری۔

"آرہا ہوں ثانیہ آپی۔" باسم کی آواز کہیں دور سے سنائی دی۔

"ثانیہ۔ کیوں کرتی ہو بیٹے ایسا۔" امی کی کمزور سی آواز مجھے مزید غصہ دلا گئی۔

"کیا کرتی ہوں میں امی۔ خود تو آپ سے ساری زندگی کچھ ہوا نہیں، انفیکٹ سب غلط سلط ہوا۔ اب باقی کی زندگی میں تو ہمیں کچھ صحیح کرنے دیں۔" میں نے زہر خند لہجے میں امی کو مخاطب کیا تاکہ وہ فی الوقت مجھے اکیلا چھوڑ دیں۔

"ابھی ولید کے آنے اور ڈنر کی بات ہو رہی ہے ہر وقت پرانی باتوں کو بیچ میں لانے کی ضرورت نہیں ہے۔" امی نے آنکھیں چراتے ہوئے جواب دیا۔

"میں لا رہی ہوں پرانی باتیں نکال کر؟ آج ولید، کل ولید کا باپ اور پرسوں اس کی ماں۔ یہ سب آپ لے کر آئی ہیں امی، اس گھر میں۔ میں نہیں۔ کبھی تو اپنی اولاد اپنے گھر کا بھی سوچیں امی۔" میری آواز ڈبڈبانے لگی تھی، ہمت ختم ہو رہی تھی، مضبوط انسان بھی کہاں تک مضبوطی دکھائے۔ کوئی سمجھتا ہی نہیں کہ ہم بھی کمزور پڑ سکتے ہیں۔

"رات کو انتظام کر دینا۔ نہیں تو مجھے خود کچھ کرنا پڑے گا۔" امی کی آواز جذبات سے عاری تھی، ہمیشہ کی طرح میرے غصے کا کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ نہ پڑے گا۔

میں ہر بار سوچتی ہوں امی کا دل نہیں دکھاؤں گی، ان سے اس طرح بات نہیں کروں گی لیکن امی کوئی موقع ایسا ہاتھ سے نہ جانے دیتیں کہ ان کی خود ساختہ مظلومیت پر مجھے غصہ نہ آئے۔

آپ لوگ ایسے نہیں سمجھیں گے، میں شروع سے بتاتی ہوں۔ نام ثانیہ مرزا، ولدیت (نام کی اور صرف شناختی کارڈ کی حد تک) عشرت مرزا، امی ثانیہ احمد سے ثانیہ عشرت کا سفر طے کر کے واپس ثانیہ احمد ہو چکی تھیں۔ جی ہاں میری نام نہاد ولدیت کو ہمیں

چھوڑے دس برس کا عرصہ ہو چکا تھا جب میں خود بارہ سال کی تھی ہمارے والد محترم گھوڑی چڑھ ہمارے لیے "چھوٹی امی" گھر لے آئے تھے اور پھر چھوٹی امی کے ہی کہنے پر ہمیں اس نام کے گھر سے بھی باہر نکال پھینکا تھا۔

احسن مرزا مجھ سے تین سال بڑے بھائی اور حسن مجھ سے دو سال چھوٹا۔ اس حادثے کے بعد ہماری فیملی تنکر سے سیدھا کراچی لینڈ ہوئی۔ میرے والد صاحب ساری زندگی امارات میں نوکری پیشہ رہے۔ زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے، چھوٹی عمر میں کسی

طرح بھاگ دوڑ کر کے باہر نکل گئے، چھوٹا موٹا کاروبار شروع کیا جو آہستہ آہستہ بڑھتا گیا۔ شادی کر کے امی کو ساتھ لے گئے۔ وہ الگ بات ہے کہ انہیں امی، شادی اور اس کے بعد ہونے والے بچوں میں کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ میرے والدین کا تعلق اس قوم سے تھا جن کے بیچ محبت ہونا ہو بچوں کی فوج پھر بھی ہو جاتی ہے۔ امی ان کے گھر میں پڑا ہوا ایک شوپیس تھیں جو رشتے داروں، دوست اقارب کے آنے پر الماری سے نکل کر ڈائننگ ٹیبل تک آ کر سج جانے کا کام دیتا اور اس کے بعد واپس اپنی اوقات پر۔ امی نے کبھی اپنے حق کے لیے عشرت صاحب سے مطالبہ نہیں کیا، کبھی اپنے بچوں کے لیے کچھ نہیں مانگا حتیٰ کہ ان کا جائز حق بھی۔ میں شاید سیونتھ اسٹینڈرڈ میں ہوں گی جب عشرت صاحب ایک طرف چھوٹی امی اور دوسری طرف ولید کا ہاتھ تھامے گھر آئے تھے اور اس دن کے بعد کچھ بھی ہماری زندگی میں نارمل نہ رہا تھا۔

امی نے رو رو کر آسمان سر پہ اٹھا لیا تھا کہ عشرت صاحب انہیں طلاق نہ دیں، ان کا نام اپنے نام کے ساتھ جڑا رہنے دیں۔ لیکن عشرت صاحب اپنے وقت کے فرعون بنے ہوئے تھے۔ کی انہوں نے اپنی مرضی۔ امی کو بہت دن تک یقین ہی نہیں آیا تھا شاید کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے ان کے ساتھ، کوئی ان کے اتنا گڑگڑانے، رونے اپنی عزت نفس کو رولنے کے بعد بھی ایسا کر سکتا ہے؟

یہاں میرا دوسرا اختلاف امی سے ہوا، پہلا عشرت صاحب کے رویے پر تھا لیکن شاید اس وقت میں اتنی چھوٹی تھی کہ صحیح سے اپنے احساسات درج نہیں کرا سکتی تھی۔ غصہ ہوتی، کھانا پینا چھوڑتی، اسکول میں سب سے لڑائیاں کرتی۔ کبھی یہ سمجھ نہیں پائی کہ یہ سب امی کے ہر بات پہ سر جھکانے کا غصہ ہے۔ لیکن جب عشرت صاحب کے چھوڑنے پر امی نے واویلا مچایا تب میں نے منہ در منہ ان سے کہا تھا کہ ایک شخص آپ سے بیزار ہے، رہنا نہیں چاہتا، شکل نہیں دیکھنا چاہتا آپ کی۔ اس کے لیے آپ اتنی ذلت کیوں اٹھا رہی ہیں۔ اس سے پہلے وہ آپ کو طلاق دے آپ خود ان سے الگ ہو جائیں۔ میری زندگی کا پہلا تھپڑ، جو امی نے مجھے مارا، وہ اس دن تھا۔ میری ماں جو کبھی بلی کے بچے کو بھی نہ دھتکاریں انہوں نے اپنی سگی اولاد پر ہاتھ اٹھایا وہ بھی اس شخص کے لیے؟ میرا روم روم غصے سے بھر گیا تھا۔ لیکن ایسا صرف میری ماں ہی کر سکتی تھی۔ میری عمر بارہ سال تھی، مجھے وقت نے بہت پہلے بڑا کر دیا تھا!

پاکستان آ کر کچھ وقت ہم نانی کے ساتھ رہے۔ نانی جو چھوٹی چھوٹی عمروں میں سارے بچوں کی شادیاں نمٹا کر فارغ ہو کر اپنا بڑھاپا سکون میں گزار رہی تھیں اس بے وقتی افتاد پر گھبرا گئیں۔ لہٰذا انہیں بھی ہم کچھ خاص پسند آئے نہ ہماری آؤ بھگت ہوئی۔ عشرت صاحب کی مہربانی کہ ایک دھیلا بھی امی کے ہاتھ پر نہ رکھا اور نہ کہتے ہیں پیسہ ہاتھ میں ہو تو درخت اور جانور بھی قدر کرنے لگتے ہیں انسان کی۔ ایک عرصے کے بعد سمجھ میں آیا کہ ماموں خالاؤں کے بچے کھنچے کھنچے کیوں رہنے لگے۔ مامیاں جو ایک وقت میں جان چھڑکتی تھیں وہ اب اتنی الگ تھلگ کیوں ہو گئی ہیں۔ دنیا نے سب کی اصلیت بہت جلدی کھول کر رکھ دی، سب بدل گیا۔ سب کچھ۔ نہیں بدلی تو ہماری امی کی بے وقوفی کی حد تک سادگی اور عشرت صاحب کے سوتیلے بیٹے کے لیے محبت۔ وہ بیٹا جو عشرت صاحب کی دوسری بیوی کے پہلے شوہر کا تھا۔ خود عشرت صاحب کا بھی نہیں۔ قطر میں جو ایک سال ہم نے اس جنجال پورہ گھر میں عشرت صاحب کی دوسری بیوی اور ان کے بیٹے کے ساتھ گزارا، اس میں امی کو اپنے بچوں کا ہوش رہا یا نہیں۔ ولید سے ضرور ان کی گہری رشتے داری بن گئی تھی۔

ہمارے پاکستان آنے کے بعد جب بھی عشرت صاحب اپنی نئی فیملی کے ساتھ پاکستان آتے دنیا دکھاوے کو اولاد سے مل کر جاتے۔ اور ولید امی

ہے۔ آہستہ آہستہ یہ روٹین بھی ختم ہوئی عشرت صاحب کے لیے ہم شاید دنیا میں ایگزسٹ ہی نہیں کرتے تھے۔ لیکن ولید کا روٹین نہیں بدلا، وہ ہر سال اپنے ننھیال آتا اور امی سے ضرور مل کر جاتا۔ ہم تینوں بہن بھائیوں کو وہ نہ تب پسند تھا نہ آج۔ عشرت صاحب کے سگے بہن بھائی بھی ہمیں زیادہ منہ نہیں لگاتے تھے کہ ہم جائیداد میں سے شراکت داری نہ مانگ لیں۔ بیوی کو طلاق دی تھی بچوں کو طلاق دینے کا کوئی فنڈا تو تھا نہیں لہٰذا واحد راستہ یہی کہ نہیں منہ ہی نہ لگایا جائے۔

جن بچوں کو ان کا سگا باپ نہ پوچھے دنیا انہیں روند کر آگے نکل جاتی ہے۔ وہی ہوا اور ہمیں آہستہ آہستہ اس کی عادت پڑ گئی۔ خاندان کی محفلوں میں جانا ہم نے چھوڑ دیا۔ کوئی بات کرنے والا نہیں ہوتا تھا، محلے میں نانی کی سلام دعا تھی، امی خود بھی زیادہ دخل نہیں دیتی تھیں نہ ہمیں دینے دیتیں۔ واحد باہر کی دنیا ہمارے لیے اسکول کالج ہی رہ گئے تھے جہاں کسی کو نہیں معلوم تھا ہم عشرت مرزا کی اولاد ہیں، کسی کو اس سے غرض نہ تھی کہ ہمارا باپ ہمیں نہیں پوچھتا یا ہم کسی کی جائیداد میں سے حصہ بٹا سکتے ہیں۔ امی کا واحد احسان ہم پر یہی رہا کہ انہوں نے سینا پرونا کر کے، اپنے کچھ زیور بیچ کر ہماری پڑھائی کسی طرح قائم رکھی۔ برٹش ورلڈ کلاس اسکولز میں پڑھنے والے بچے، گلستان جوہر کے محلہ اسکول تک آگئے۔ کسی کے سر پہ پہاڑ نہیں ٹوٹا، کسی کی زندگی میں کوئی بدلاؤ نہیں آیا سوائے ہم تینوں کے۔ اور جس کا کوئی حق کسی چیز پر نہیں بنتا تھا وہ انٹرنیشنل لیول کے کالج اور یونیورسٹی میں پڑھ کر آج دندناتا پھر رہا تھا اور امی چاہتی تھیں کہ ہم اس کی خاطر مدارات کریں۔ اب بھی!

☆☆☆

"ابے [illegible]" بھئی۔ کیا سین ہے برو......" احسن ہمیشہ کی طرح گرم جوشی سے گلے ملتے ہوئے بولا "کب لینڈ کیا، کب تک رکے گا۔"

"بھائی سکون کی سانس تو لینے دے، کوئی پانی کوئی چائے کوئی تو مہمان نوازی نبھالے۔ کیا آتے ہی "یو برو۔" میں نے اسے تنگ کرنے کے لیے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے کہا۔ لیکن وہ بھی ایک کائیاں تھا فوراً جوابی وار کیا۔

"ابے او۔ قطری شہزادے۔ یہ ہمارا عوامی اسٹائل ہے تو زیادہ ادب و آداب والا نہ بن، چائے منگاتے ہیں تیرے لیے، تو بتا کب تک ادھر ہے۔"

digest library.com

احسن فون اٹھا کر [illegible] کو چائے لانے کی ہدایت دینے لگا تھا۔

احسن پاکستان میں میرا بچپن کا، واحد دوست، ساتھی، میری بظاہر خوشیاں اور اندرونی غم بانٹنے والا یار۔ احسن کی پیدائش اور تعلیم اسلام آباد کی تھی لیکن اس کی پوری فیملی کراچی سے تعلق رکھتی تھی۔ احسن کے پاپا کسی ملٹی نیشنل فرم کے ملازم ہونے کے باعث اپنی زندگی کا زیادہ تر حصہ اسلام آباد میں خاندان سے دور گزار چکے تھے۔ میں بچپن میں جب بھی گرمیوں کی چھٹیوں میں امی اور عشرت پاپا کے ساتھ اپنے رشتے داروں سے ملنے پاکستان آتا احسن سے ضرور ملتا۔ وہ واحد پڑھا لکھا دوست تھا، میرا جو امی کی فیملی والے محلے میں رہتا تھا اور بہت جلد ہم دونوں کافی قریب آگئے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں پاکستان امی اور عشرت انکل کے خاندانوں سے نہیں بلکہ اسلام آباد میں احسن، اس کے ممی پاپا اور کراچی میں ثانیہ مما سے ملنے آتا تھا۔ پتا نہیں کیوں مجھے ان دونوں گھروں میں وہ سکون ملا جو کبھی مجھے امی اور پاپا کے ساتھ گھر میں بھی نہیں ملتا تھا۔

پاپا کی حادثے میں وفات کے بعد عشرت پاپا اور امی کی شادی اور پھر عشرت انکل کی فیملی کے ساتھ رہتے ہوئے مجھے پہلی بار اندازہ ہوا گھر کیسے کہتے ہیں۔ [illegible] میں ثانیہ مما اور امی کا موازنہ کرتا، ثانیہ مما میرے کام کرتیں مجھے ٹائم دیتیں، مجھ سے پیار کرتیں، اور ان کے بچے اسی لیے مجھ سے برابر تاؤ

کرتے لیکن میں نے کبھی برا نہ منایا۔ مجھے شاید ان اندیکھے جذبے نے باندھ رکھا تھا جو ثانیہ مما کے وجود سے پھوٹتا تھا اور جو میری سگی ماں مجھے نہیں دے سکی تھیں۔ محبت کا جذبہ۔ ویسے ہی احساسات مجھے احسن کے گھر میں محسوس ہوتے جب اس کی مما میرے بالوں میں ہاتھ پھیر کر میرے سلام کا جواب دیتیں، اپنے ہاتھوں سے میرے لیے کھانے کی چیزیں بناتیں۔ بچپن میں کیکس اور براؤنیز اور پھر چائے اور سینڈوچز ان کے ہاتھ کا سب کچھ لاجواب ہوتا تھا۔ احسن ہمیشہ شکایت کرتا کہ اس کی مما اتنا اہتمام اس کے لیے نہیں کرتی تھیں جتنا میرے لیے اور یہ احساس میرے کچلے ہوئے سیلف کانفیڈنس کو سمیٹ کر مجھے دوبارہ سے اپنی نظروں میں عزت دار بنا دیتا تھا۔ احسن یا ثانیہ مما کی اولادیں یہ فیلنگ کبھی نہیں سمجھ سکیں گی۔ انہیں قدرت کی طرف سے ایسی مائیں جو ملی تھیں جو ان سے بے غرض محبت کرتی تھیں۔ زندہ رہنے کے لیے اس سے بڑھ کر کیا جواز ہو سکتا ہے کہ آپ کے گھر میں آپ کی ماں دن رات بیٹھی آپ کے لیے دعائیں کرتی ہو، آپ کے گھر میں داخل ہوتے ہی محبت سے آپ کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتی ہو، آپ کے گھر سے نکلنے سے پہلے دعائیں پڑھ کر آپ پر پھونکتی ہو۔ زندگی اس منظر کے بعد مکمل ہو جاتی ہے۔ ہے کہ نہیں؟ میری اسی لیے نامکمل رہ گئی تھی شاید۔

"بھائی۔ تو کن سوچوں میں گم جاتا ہے۔ کب سے پوچھ رہا ہوں کب تک رکے گا؟ تو پتا نہیں کون سی حسینہ کے خیالوں میں گم ہے۔" احسن اپنے سوال کا جواب نہ ملنے پر ناراض ہو رہا تھا، چائے کے ساتھ ٹیبل پر شہر کی بہترین بیکری کے بٹر کوکیز موجود تھے۔

"واہ بھئی، ایس پی صاحب۔ معصوم عوام کے [illegible] ہمہتیا......" میں نے احسن کو شرارت سے چھیڑا، اس سے پہلے کہ اس کا خفگی بھرا چہرہ مزید پھول کر کپا ہوتا، میں نے جواب دینا بہتر سمجھا۔ "یار میں تیرے سوالوں کا جواب آرام سے دوں گا نا۔ کچھ چیزیں بھی ڈسکس کرنی ہیں تجھ سے، جلدی نہ کر۔ ابھی ہول بین نہیں بلکہ بھائی میں یہیں ہوں کراچی میں۔ ناٹ گوئنگ بیک۔" میں نے مختصراً احسن کو بتانے کی کوشش کی۔

احسن کی پوسٹنگ ان دنوں کراچی میں تھی، بچپن سے اسے پولیس فورس جوائن کرنے کا شوق تھا۔ اپنے باپ کی طرح وہ کوئی کارپوریٹ نوکری نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بقول اس کے۔ "تم سب زندہ لاشیں ہو جن کا خون ان کی کمپنیاں نچوڑ کر کچھ دھیلے ہاتھ پر دھر دیتی ہیں اور بغیر کسی مقصد کے تم سب اپنی زندگیاں چند پیسوں کی خاطر گروی رکھ دیتے ہو۔" یہ کہتے ہوئے وہ یہ بھول جاتا تھا کہ آج وہ جو بھی ہے اپنے والد صاحب کی گروی شدہ زندگی کے عوض ہی ہے۔

"کیا مطلب ناٹ گوئنگ بیک کا۔ تو واپس قطر نہیں جائے گا ولید، ادھر ہی رہے گا؟" احسن کافی ایکسائٹڈ ہو گیا تھا۔ یہ اس کی بچپن کی حسرت تھی کہ میں پاکستان رہتا۔

"ہاں میرے باپ۔ اب تفصیلات مت پوچھ بعد میں آرام سے گھر پہ بات کریں گے اس پر۔" میں نے اس کا کھلا منہ بند کرانے کی ناکام کوشش کی۔

"اچھا بس ایک بات اور پھر بعد میں۔" احسن لجاجت سے بولا۔

"کیا ہے......" میں نے خشمگیں نظروں سے اسے دیکھ کر پوچھا۔ "چائے نہ پینے دو منحوس آدمی تم پوچھو۔"

"تو ادھر کراچی میں رہے گا کہاں؟ ثانیہ مما کو بتایا تو نے اپنے آنے اور اس فیصلے کا؟" احسن نے اٹک اٹک کر سوال مکمل کیا۔

"نہیں۔ آج رات کو جاؤں گا ان کی طرف اور تو چلے گا میرے ساتھ ڈنر پہ، بات کروں گا ان سے میرے ساتھ رہیں۔ [illegible] فار ہر، تو بگ ڈیل۔" میں نے خلا میں گھورتے ہوئے احسن کو جواب دیا۔

"واٹ۔!" احسن کی شاکی نظریں مجھے اچھی طرح سمجھا رہی تھیں وہ کیا کہنا چاہتا ہے جو میں کہنا ہی چاہتا تھا۔ "مطلب تو جاکر ان سے کہے گا کہ برسوں بعد تیرے ساتھ آکر تیرے گھر میں رہیں اپنی سگی ماں کا گھر چھوڑ کر اور وہ مان جائیں گی؟ اور تیرے امی اور عشرت پاپا کا کیا، انہیں کون سمجھائے گا تو جگ......" احسن کی آواز میں بے یقینی تھی، "کوئی عجیب نفسیات ہے بھئی تمہاری فیملی کی، عشرت انکل نے تیری ماں کے کہنے پر ثانیہ آنٹی کو چھوڑا، اتنے سال ان کی خبر لی نہ بچوں کا نام نفقہ دیا۔ اب ان کی دوسری بیوی کا پہلا بیٹا ان کی پہلی بیوی کو گھر لے کر جانا چاہتا ہے، وہ بھی اپنے؟، کیا کھاتے ہو بھی تم لوگ جو دماغ میں اتنا خناس بھر گیا ہے۔"

احسن کی طنزیہ آواز میرے کانوں میں سیسہ گھول رہی تھی لیکن وہ کچھ غلط نہیں کہہ رہا تھا، میں کیسے اسے روکتا۔؟ ویسے بھی وہ ہے، اسے سب جائز ہے، ولید عشرت مرزا کے سینے پر چڑھ کر گردن بھی دبا سکتا ہے اس کی۔ میں خاموشی سے سنتا رہا اور وہ بولتا رہا۔

"اور ان کی ہٹلر اولادیں؟ خاص کر وہ جھانسی کی رانی۔ تیری بہن۔"

"ثانیہ نام ہے اس کا......" میں نے کپ میبل پر پٹخ کر احسن کی بات کاٹی تھی۔ "اور وہ بہن نہیں ہے میری، ان فیکٹ ثانیہ مما کی کسی اولاد سے میرا کوئی بہن بھائی ٹائپ رشتہ نہیں ہے جو ہے ثانیہ مما کی وجہ سے ہے، رہی عشرت پاپا اور امی کی بات تو انہیں میں سمجھا لوں گا، ویسے بھی انہیں پاکستان آنے میں کوئی انٹرسٹ نہیں ہے اور آ بھی گئے تو بھی یہ میری لائف ہے میں جس کو بھی رکھوں اپنے ساتھ اپنے گھر میں میری مرضی۔"

"واہ بھئی واہ۔ سبحان اللہ......" احسن نے حسب معمول طنزیہ نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے تالیاں بجائیں۔ "ولید تیرا دماغ اپنی جگہ پر ہے یا دبئی سے کراچی آکر تھرمل شاک لگ چکا ہے تجھے، جو تو یہ بے سروپا باتیں کر رہا ہے میرے بھائی؟ سوچ، ثانیہ مما اپنی سگی اولادوں کو چھوڑ چھاڑ تیرے ساتھ کیوں آنے لگیں اور جھانسی کی رانی، عشرت پاپا اور تیری اپنی مما اس سب پر سکون سے بیٹھیں گے کیا؟ میرا دماغ ہل چکا ہے اس عالیشان پروپوزل پر۔ چائے ختم کر یہ بات گھر پر ہی ہو گی یہاں ممکن نہیں ہے نکلتے ہیں پھر۔ تو اچھے بھلے آدمی کا دماغ پھرا دے......" شہر کا کامیاب ایس پی اپنے پاگل دوست کی باتوں پر سر نوچ رہا تھا۔ "اور بھائی میں نہیں چلوں گا۔ تمہاری عجیب و غریب سی فیملی کا عجیب و غریب سا ڈنر ہے میں بلاوجہ بیچ میں اٹک جاؤں۔" احسن نے یاد آنے پر پہلے شاک اور پھر سراسر قطعیت سے جواب دیا۔

میں خاموش بیٹھا چائے کا گھونٹ گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے یہی سوچ رہا تھا کہ اس سب کو ممکن کیسے بناؤں۔ مجھے ہر حالت میں ثانیہ مما کو اپنے ساتھ رکھنا تھا۔ عشرت پاپا کے رویوں کی تلافی تو میں نہیں کر سکتا لیکن ایک بیٹا ہونے کا فرض تو پورا کر سکتا ہوں، اپنی امی کی زیادتیوں کا کچھ تو تاوان دے سکتا ہوں! ویسے بھی میری سگی ماں کو مجھ میں اور عشرت پاپا میں کم اور قطری ریالوں میں زیادہ، دلچسپی رہی ہے۔ ان کو منانا مشکل نہیں ہوگا، عشرت پاپا مجھے کسی بات پر نہیں ٹوکتے بزنس میں بھی انہیں مجھ پر پورا بھروسا ہے اپنی سگی اولادوں سے بھی زیادہ انہیں میں منا لوں گا۔ واحد سر درد مجھے ثانیہ دے رہی تھی۔ یہ لڑکی بچپن سے میرے لیے مسئلہ تھی۔ ثانیہ مما کا عکس، سب کے ساتھ اتنی ہمدرد اور پیار سے بات کرنے والی لیکن مجھے دیکھتے ہی اسے کانٹے لگ جاتے تھے اور یہی کانٹے میری چھٹی پرانی عزت نفس کو اور بھی مجروح کرتے، رہ رہ کر مجھے یاد دلاتے کیسے ایک سڑک چھاپ بن باپ کے لڑکے نے تین معصوم لوگوں کے حق پر قبضہ جمالیا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں عشرت انکل اور امی کے گناہوں پر مجرم محسوس کرتا خودکو۔

"ثانیہ بی بی کو کیسے قابو کریں یہ ایک اہم مسئلہ تھا۔ ایک بار وہ مان گئی تو باقی دونوں بھائیوں کو منانا مشکل نہیں ہوگا، اور مجھے اس کا حل سوچ کر ہی رات کو ڈنر پر جانا تھا تاکہ فل اینڈ فائنل بات کرسکوں، ثانیہ مما سے۔

چائے ختم ہوگئی تھی احسن میرا انتظار کر رہا تھا راستے میں اس نے مجھے ہوٹل ڈراپ کرنا تھا۔

"ساڑھے سات بجے لینے آجانا مجھے اور ساتھ ہی چلنا، میری عجیب سی فیملی کے عجیب سے ڈنر میں تو بھی کوئی کم عجیب نہیں لگے گا جو اتنے نخرے دکھا رہا ہے۔" میں نے ہوٹل گیٹ پر اترتے ہوئے احسن کو اس کی پہلے والی بات کا جواب دیتے ہوئے ہدایت کی۔

"میں نہیں چلوں گا۔" احسن کی ہٹ دھرمی اپنی جگہ تھی۔

"تیرا تو باپ بھی چلے گا۔ اگر تو چاہتا ہے کل کہ رات میں تیرے گھر پر گزاروں تو شرافت سے آجانا ورنہ مجھے ہوٹل زیادہ پسند ہے تیرے گھر سے۔" میں نے احسن کو بلیک میل کیا اور وہ دانت کچکچا کر مجھے گالیاں دیتا ہوا، ریس دے کر گاڑی آگے بڑھا لے گیا۔

☆☆☆

امی سے لڑائی تو کر لی تھی لیکن کھانا تو بنانا ہی تھا۔ دل تو تھا کہ جمال کو گٹا یا زہر ہی ملا دوں منحوس کے کھانے میں۔ نہ رہے بانس نہ امی بجاتی پھریں ولید نامی بانسری۔ میں نے جلدی جلدی دو تین کوکنگ آئٹم جو امی کے سگھڑپن کی وجہ سے ہمیشہ فریج میں آدھے تیار موجود ہوتے تھے، پورے کیے۔ پچھلے ہفتے حسن کی سالگرہ پر اس کے دوستوں نے مل کر آئس کریم کا پانچ لٹر پیک بھجوا دیا تھا بس میٹھے میں وہ ہی ہونا تھا، ویسے بھی مرے حساب سے، مٹھاس کھانے میں ہو یا رشتوں میں، ان لوگوں کو پیش کی جاتی ہے جو اس کے اہل ہوں، ولید جیسے ایروں غیروں کو نہیں۔

یہ سب نمٹا کر ٹائم دیکھا تو عصر ہو چکی تھی۔ نماز پڑھ کر روٹھی امی کو منانے کے لیے چائے بنائی اور نمکین باقر خانیوں کے ساتھ امی کے کمرے میں۔

امی اندھیرا کیے جائے نماز پر ہی بیٹھی تسبیحات میں مصروف تھیں۔ میں نے لائٹ کھولی اور چائے سامنے رکھی تو خفا خفا سی منہ موڑ کر بیٹھی رہیں۔

"امی چائے پی لیں۔ باقر خانی بھی ہے آپ کی پسند کی۔"

امی کی شکوہ کناں نظریں میری نظروں سے ملیں تو میں نے چور بن کر ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا۔ وہاں صاف لکھا تھا "واپس ماں کے پاس ہی آنا ہوتا ہے دل جوئی کے لیے تو دل دکھاتی کیوں ہو۔"

[illegible] کبھی یہ نہیں سمجھا پائی کہ مجھے ان سے نہیں ان کی عادتوں سے چڑ ہے، ہار مان لینا، سر جھکا دینا، خاموش رہنا، پل پل سامنے والوں کی بکواس سن کر جیتے مرتے رہنا۔ لیکن امی یہ بات بھی نہیں سمجھ پائیں گی۔ وہ میری طرح باغی نہیں ہیں نا۔

"امی چائے پی لیں۔ آپ کے لاڈلے کے لیے، سب ریڈی کر دیا ہے، دیکھ لیں۔ کچھ اور کہیں گی تو وہ بھی بنا دوں گی، اب تو ناراضی ختم کریں۔" میں نے کمرے کے پردے ہٹا کر تازہ ہوا کے لیے کھڑکیاں کھولنی شروع کیں۔

"تم یہاں آ کر بیٹھو میرے پاس۔" پیچھے سے امی کی آواز آئی، وہی نرم ملائم آواز لیکن ایکدم سپاٹ جذبات سے عاری آواز۔

اففففف! اب پھر لیکچر ہوگا۔ میں نے دل میں سوچا لیکن ابھی دوبارہ امی کو ناراض کرنے کا رسک نہیں لے سکتی تھی اس لیے ان کے پاس بیٹھ کر حقوق العباد پر پورا لیکچر سنا۔ امی ہمیشہ کہتی ہیں ولید بن باپ کا بچہ ہے، اس سے اچھا سلوک کریں گے تو اللہ میاں خوش ہوں گے، اور یہ کہ مجھے اس کی ماں کی عزت کرنی چاہیے اور ان کی یا عشرت صاحب وجہ سے ولید کا دل نہیں دکھانا چاہیے، اس کو جو ملا وہ اس کے نصیب کا تھا۔ اس پر ہمیں خدا سے شکوہ نہیں کرنا

digest library.com

چاہیے۔

میں اپنی معصوم ماں کی شکل دیکھ کر یہ نہیں کہہ پاتی کہ اس نئے نویلے بن باپ کے لڑکے کے آتے ہی ہم جو باپ کے ہوتے ہوئے بھی یتیم ہو گئے۔ اس کا کیا؟ ہماری جو حق تلفی ہوئی تھی وہ کس کھاتے میں؟ یونیورسٹی کالج کے سارے سال میں نے دس اور بارہ روپے میں پبلک بسوں سے جوجھتے، لوگوں کی گھٹیا نظروں سے بچتے اور پیسوں کا حساب کرتے کرتے، سڑی گرمی میں نکالے۔ اور یہ سوکالڈ بن باپ کا بچہ امپورٹڈ گاڑیوں میں اے سی میں گھومتا تھا۔ میرا بڑا بھائی ٹیوشن فیس زیادہ ہونے کی وجہ سے اپنی پسند کی تعلیم نہ حاصل کر سکا اور وہاں اس بن باپ کے بچے کو اچھی سے اچھی ہوم ٹیوشنز نصیب ہوئیں۔

کیسی تفریق ہے جس پر امی ہمیں راضی کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہیں۔ ان کا بس ایک ہی ماننا ہے کہ نصیب سے بڑھ کر کچھ مل نہیں سکتا اور جو تمہارے حق میں لکھا ہے وہ کوئی تم سے چھین نہیں سکتا۔ اور اس بات پر نہ چاہتے ہوئے بھی ہم تینوں بہن بھائی سر جھکا دیتے۔

امی کے پاس سے اٹھنے سے پہلے انہوں نے مجھ سے وعدہ لے لیا تھا کہ رات کو ولید سے سب تمیز سے پیش آئیں گے۔ اور ہم نے بھی چار و ناچار ہز ہائنس پرنس ولید کے آگے گھٹنے ٹیک دیے۔ کچھ گھنٹوں کی تو بات تھی کھانا کھا کر اس نے ویسے بھی چلے جانا تھا۔ میں نے بھی سوچا کیا ضرورت ہے رخنہ ڈالنے کی اب یہی بات مجھے حسن کو بھی گھول کر پلانی تھی، محسن بھائی پھر سمجھ دار تھے بردباری کا مظاہرہ کرتے، یا شاید ان کی فطرت بالکل امی جیسی پرسکون اور مطمئن تھی، ہر حال میں شکر ادا کر کے خوش رہنے والی۔ میں ہی شاید عشرت صاحب کی گندی عادتیں لے کر پیدا ہوئی تھی، جلد باز، خود غرض، بے اعتباری اور نجانے کیا کیا۔

حسن مجھ سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے کافی کلوز تھا اور اکثر باتوں میں مجھے کاپی بھی کرتا تھا، اس کا بی اے کا لاسٹ سمسٹر تھا، نوکری ملنے کے بعد میں اس قابل ہو گئی تھی کہ اپنے چھوٹے بھائی کو اچھے انسٹیٹیوٹ سے پڑھوا سکوں۔ کچھ وہ خود بھی اسمارٹ تھا ہاتھ پیر مار کر پارٹ ٹائم کام ڈھونڈ ہی لیتا تھا، کچھ اسکالرشپس کی مہربانی کیونکہ وہ پڑھائی میں تیز بھی بہت تھا اس لیے میرے حساب سے ہم تینوں میں کم سے کم اس کا فیوچر تباہ ہونے سے بچ گیا تھا۔ امی کہتی ہیں میں ناشکری ہوں، اچھی جگہ پڑھنے اور اب نوکری کرنے کے بعد بھی یہی کہتی رہتی ہوں۔ لیکن مجھے لگتا ہے انسان میں جب تک خوب سے خوب تر کا لالچ نما عزم نہیں ہوتا وہ آگے نہیں بڑھتا، کسی ایک جگہ جا کر رک جاتا ہے، ساکن۔ اور میں ابن صفی کے مشہور کردار علی عمران کی اس بات کو ایمان مان کر چلتی ہوں کہ زندگی چلتے رہنے کا نام ہے، رک گئے تو بس ختم۔ اور اسی رکنے سے بچنے کے لیے میں نے تیز رفتاری کا فارمولہ چنا، اپنی اسپیڈ اتنی بڑھا لی کہ کوئی چاہے تو بھی نہ روک پائے، بس میں یہ بھول گئی تھی کہ اوور اسپیڈنگ میں ہونے والے حادثات جان لیوا بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔ اور امی سے بات کرتے وقت مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ آنے والا ڈنر اپنے ساتھ ایسا ہی ایک طوفان فل اسپیڈ میں لے کر آ رہا ہے جو ہماری ٹوٹی پھوٹی فیملی کے باقی ماندہ فیملی ڈنرز کو بھی آگ میں جھونک جائے گا۔

☆☆☆

کی چین انگلیوں پر گھماتے ہوئے حسب معمول بلیک اسکن فٹنگ شرٹ پہنے خوشبوؤں میں نہائے حسن صاحب سیڑھیوں سے اترے اور اس سے پہلے میں انہیں روک کر بات کر پاتی، وہ ہوا کے گھوڑے پر سوار دروازہ پٹخ کر اپنے جدید زمینی گھوڑے یعنی بائیک پر سوار ہو چکے تھے۔ بمشکل ہانپتی کانپتی میں گیٹ تک بھاگم بھاگ پہنچی تا کہ انہیں روک کر امی کا گیان پہنچا سکوں۔

"حسن۔ بہرے ہو گیا، سنائی نہیں دیتا۔ یا کانوں میں روئی ٹھونسی ہوئی ہے۔"

اس سے پہلے کہ حسن میاں بائک کو کک لگا یہ جا وہ جا ہوتے میں نے اسے جالیا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی میں ایک لمحے کو ٹھٹکی، اتنی تیاری؟ کسی کے ولیمے میں جا رہا ہے کیا، میں نے اوپر سے نیچے تک اسے گھور کر دیکھا۔

"کیا ہو گیا تانیہ باجی۔ کیوں پریشر ککر کی طرح سیٹیاں مار رہی ہو۔ کوئی کام ہے کیا؟ ابھی نہیں کر سکتا، لیٹ ہو رہا ہوں جم کے لیے۔" شان بے نیازی سے بائک کے سائڈ ویو مرر میں دیکھتے ہوئے حسن نے جواب منہ پہ مارا۔

میں ابھی اس کی تیاری پر غور ہی کر رہی تھی کہ پوچھوں یا نہیں کچھ، اتنے میں آگے سے جواب آ گیا۔

"باجی ہینڈسم ہوں، پتا ہے۔ نظر لگا چکی ہو تو بات بھی کر لو جس کے لیے اوپر سے لڑھکتی ہوئی آرہی ہو۔"

حسن فٹنس فریک تھا۔ کالج ٹائم سے ہی ڈائٹ کنٹرول، ایکسرسائز، جمنگ اور نماز کی طرح باسکٹ بال ٹورنامنٹس کی پابندی کرنا اس کا روٹین تھا۔ شہر کی ایلیٹ کلاس یونیورسٹی میں پڑھنے کے توسط اس کے دوست بھی کچھ ایسے ہی بن گئے تھے۔ ایک کا باپ ملک کا مشہور سیاستدان تھا اور بیٹے کو شوقیہ شہر کے پوش علاقے میں جم بنا کر دے رکھا تھا جہاں اس نے حسن کو باقاعدہ ٹرینر کے طور پر ہائر کر لیا۔ حسن دوستی اور کام کو الگ رکھنے والا بندہ تھا اور پھر یہ اس کا صف اول شوق بھی، لہذا آمدنی اور شوق کے رہتے حسن روز شام کو سات سے نو جم میں پایا جاتا۔

"او بھائی وزیر اعظم کے جانشین، میری بات سنتے جاؤ تمیز سے پانچ منٹ......" میں نے اس کی تیاری کو فی الحال پس پشت ڈالتے ہوئے جلدی جلدی کہنا شروع کیا، "رات کو امی کا چہیتا ولید آرہا ہے ڈنر پر، امی نے مجھے بہت گیان دیا ہے تمیز تہذیب کا، لہذا انسانیت کے جامے میں رہنا ورنہ یہی ہوگا کہ تانیہ نے کہا ہوگا، اور ٹائم سے گھر آجانا۔"

میں نے اپنا مدعا بیان کر دیا تھا۔

"ڈیئر سسٹر......" انتہائی گندے تاثرات کے ساتھ حسن نے منہ بنا کر بات شروع کی۔ یہ ڈیئر سسٹر کا سابقہ اس کی ترجمانی تھا کہ اب حسن بھی میری کلاس لینے والا ہے امی کی طرح۔ "تمہارے پاس آج کل کام کم ہے جو دماغ میں فضول شگوفے پھوٹ رہے ہیں؟ محسن بھائی نے بتا دیا تھا مجھے۔ ولی بھائی سے بھی بات ہو گئی تھی ان کی فلائٹ سے پہلے۔ سب کے تمہاری طرح حساب نہیں نکلتے ان سے جو چیر پھاڑ کرنے دوڑ پڑیں۔ جا کر آرام سے اندر بیٹھو، آجاؤں گا میں ان شاء اللہ ٹائم سے۔"

حسن بائک کو کک لگائے ہوا ہو چکا تھا اور میں صحن میں کھڑی سوچ رہی تھی کہ اس سارے گیم میں کیا میں ہی سلطان راہی ٹائپ ولن ہوں؟ اور حسن کی ولید سے کب سے اتنی دوستی ہو گئی کہ وہ "ولی بھائی" ہی بن گیا، بہت ہی غدار بھائی ہیں بھئی میرے اللہ معاف کرے، بہن کو دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال باہر کیا۔ یہی سب سوچتے سوچتے میں واپس اندر کی جانب ہو لی۔ بہت گھر گھرستی ہو گئی تھی امی کو منانے کے چکر میں، کچھ کام ابھی آفس کے کرنے والے باقی تھے جو میں ڈنر سے پہلے پہلے نمٹانے کا سوچ رہی تھی۔

☆☆☆

"پرسوں شام رضا عابدی نے کنونشن سینٹر میں ایک مشاعرہ منعقد کروایا ہے۔ آپ تیاری رکھیے گا، تمام احباب کی فیملیز مدعو ہیں۔"

عشرت مرزا نے کن انکھیوں سے اپنی حسین بیوی کو دیکھا جو ڈریسنگ ٹیبل پر بیٹھے دس قسم کی نائٹ کریموں کے ساتھ مشغول تھیں۔ یہ ان کا روز کا معمول تھا۔ رضا عابدی سے عشرت مرزا کی پرانی جان پہچان تھی، رضا کا تعلق بھی پاکستان سے تھا اور دوحہ کے کسی شیخ کی ایک مشہور کنسٹرکشن کمپنی میں اچھے عہدے پر فائز تھا۔ لہذا عشرت کا جانا ضروری تھا۔

"بھئی، آپ خود ہی چلے جایئے گا ان ٹٹ

پوچھوں کی پارٹی میں……" شمع نے نخوت سے ناک چڑھائی۔"میرے پاس کرنے کو اور بہت سے کام ہیں……" انہوں نے صفاچٹ عشرت مرزا کے منہ پر انکار کیا۔"اور ذرا اپنے سپوت کی خیر خبر تو لیں، فون اس کا دو دن سے آف جا رہا ہے، چھٹیاں منانے پاکستان گیا ہے کم سے کم ماں باپ کو فون تو کر کے خیریت کی اطلاع دے دے۔"

شمع کے صاف انکار پر عشرت مرزا کوفت کا شکار تو ہوئے لیکن وہ جانتے تھے شمع کو اپنی جگہ سے ہلانا بہت مشکل کام تھا اس لیے چپ ہو رہے۔ پچھلے کچھ سالوں میں جب سے ولید نے پہلے اپنا گھر پھر اپنا بزنس الگ کیا، اور شمع نے عشرت مرزا کی ناز برداریوں میں خاطر خواہ کمی کر دی تھی، عشرت مرزا کو اپنے پہلی بیوی سے ہوئے بچے یاد آنے لگ گئے تھے۔ وہ اب ساٹھ کے پیٹے میں تھے اور شمع اپنی عمر کو کہیں بہت پیچھے چھوڑ آج بھی تتلی بنی گھومتی پھرتی تھیں۔ شمع کی پچھلے کچھ سالوں کی رفاقت اکثر انہیں ثانیہ کی یاد دلاتی کہ اگر وہ ہوتیں تو کس بردباری سے کام لیتیں لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ عشرت مرزا نے جو بویا وہی کاٹنا تھا۔

شمع اب ڈریسنگ ٹیبل سے اٹھ کر کمرے کی لائٹس آف کر رہی تھیں۔ عشرت مرزا نے گہری سانس لے کر آنکھیں موند لیں۔ کل صبح انہیں ولید کو فون کر کے خیر خبر بھی لینی تھی۔

☆☆☆

شمع عشرت مرزا، اپنے شوہر نامدار کی دوسری بیوی تھیں، بہت چھوٹی عمر میں ان کے والدین نے غربی اور بچوں کی فوج سے تنگ آ کر کوئی چودہ پندرہ سال کی عمر میں شمع کو بیاہ کر دوحہ روانہ کر دیا تھا۔ ان کے پہلے شوہر وادان، لیبر طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ کئی غریب پاکستانیوں کی طرح پشاور سے آنکھوں میں خواب سجائے وہ ایک کنسٹرکشن کمپنی سے منسلک ہو کر شادی سے کچھ سال پہلے دوحہ آئے اور اس شہر کی چکاچوند زندگی میں ہی بس کے رہ گئے۔ محنتی اور حلال کمانے والے آدمی تھے، محنت سے کام کرتے گئے اور کچھ سالوں میں شمع سے شادی کر کے بیوی کو بھی ساتھ ہی دوحہ لے آئے۔ شمع سے ان کا ایک بیٹا ہوا ولید، جسے وہ اپنے ہاتھ کا چھالا بنا کر رکھتے۔ شمع جو اپنے بچپن میں بے حد غربت دیکھ کر اب نئی عمر میں شادی کر کے دوحہ آن بسی تھیں، ان کی تعلیم، اٹھنا بیٹھنا، بات کرنے کا سلیقہ طریقہ سب بے حد عامیانہ اور واجبی تھے، اور انہوں نے خود بھی کبھی ان سب باتوں کو اہمیت دینے یا بہتر کرنے کی کوشش نہ کی۔ وادان، نیک فطرت تھے بیوی کو کھلا ہاتھ دیا لیکن تعلیم اور شعور کی کمی کے ساتھ ساتھ شمع بیگم کے لالچی مزاج نے ان کو کسی اور ہی دنیا میں پہنچا دیا تھا۔ بے حد حسین و جمیل ہونے کے باعث انہیں بس اسی چیز کا زعم تھا کہ حسن سے وہ سب کو زیر کر سکتی ہیں۔ بے چارے وادان خود تو تعلیم حاصل نہ کر پائے تھے لیکن ان کا شوق کہ اپنے بیٹے کو ضرور اعلیٰ تعلیم یافتہ بنائیں گے، وادان کا ماننا تھا کہ ان کے جنتی ماں باپ نے ان کا نام کچھ سوچ کر ہی رکھا تھا اور وہ اپنے نام کا اثر خود میں نا سہی لیکن اپنے بیٹے میں ایک دن ضرور دیکھیں گے کہ ولید ان سے بہت کامیاب اور خوش حال بنے گا۔ یہاں وادان کی نیک خواہشات اور وہاں شمع کی لاپروائی، لالچ اور لاابالی پن۔ وادان اپنے معاملات میں تو خاموشی اختیار کرتے کیونکہ شمع سے ان کی ہر طرح کی امید نے اتنے سالوں کی بے مول رفاقت میں دم توڑ دیا تھا، لیکن ولید کے معاملے میں وہ کسی کو نہیں بخشتے تھے۔ گھر میں اکثر لڑائیاں ہونے لگیں۔

ولید بڑا ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے گھر کے عجیب ماحول کو اپناتا جا رہا تھا۔ تعلیمی میدان میں بہت ہوشیار لیکن ماں باپ کے بیچ کی چپقلش اسے دن بدن ایک عجیب سے ٹرامہ کا شکار بنانے لگی۔ وادان اپنے بیٹے کے ساتھ ہر ممکن وقت گزارتے لیکن شمع کا دھیان اپنے حسن کی دیکھ بھال، مختلف فلموں ڈراموں، پرائے ملک میں دیسی محلوں کے

digestlibrary.com

مسائل سے شروع ہو کر وہیں ختم ہو جاتا۔ کسی نہ کسی طرح الغرض اس گھر کا پہیہ چل رہا تھا۔ اسی دوران، کسی پاکستانی کمیونٹی کے میل ملاپ میں شمع پر عشرت مرزا کی نظر کرم ہو گئیں جو اس تقریب کے فائنسرز میں سے تھے۔ شمع کم عمر تھیں، خوب صورت تھیں اور کتنی ہی بے وقوف ہو اپنے اوپر پڑنے والی عورت نظروں کو اچھی طرح سے پہچانتی ہے۔ عشرت مرزا کے التفات اور پیسے نے شمع جیسی کم عقل عورت کو زیر کرنے میں وقت نہیں لگایا، ان کی دلچسپی وادان اور ولید میں کم ہوتے ہوتے نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی، ادھر وادان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان کی بیگم چار چھ مہینے میں کسی اور ہی راہ پر چل پڑی ہیں، وہ اس سب کو شمع کی کام چوری اور نااہلی سے ہی منسوب کرتے رہے۔ ولید اب بچہ نہیں رہا تھا، اٹھ اسٹینڈرڈ میں آچکا تھا۔ اسے ماں کے ساتھ اور بچوں کی طرح کوئی جذباتی وابستگی نہ تھی، اور وادان نے اپنے اخراجات اور شمع کے اطوار دیکھتے ہوئے دوسرے کسی بچے کی خواہش کی اور نہ ہی کوشش۔ ان کا پورا دھیان ولید کی تربیت پر رہتا تھا۔ ولید بھی اپنے باپ سے بہت قریب تھا اور انہیں اپنا آئیڈیل مانتا تھا۔ اسی دوران قدرت نے ایسا کھیل کھیلا کہ ولید اپنی سب سے پیاری ہستی سے محروم ہو گیا اور شمع کے نصیب کی شمع مزید جل اٹھی۔

وادان کو ایک روز کام کے دوران دل کا ایسا دورا پڑا کہ وہ جانبر نہ ہو سکے، گھر میں ہونے والی بے سکونی نے آہستہ آہستہ انہیں ہائپر ٹینشن اور دل کا مریض بنا دیا تھا۔ ولید اس واقعے کے بعد بالکل اپنے آپ میں ہو کر رہ گیا، شمع نے عدت پوری کی اور عشرت مرزا نے پہلی فرصت میں شمع سے نکاح کر کے ولید اور انہیں گھر لانے کا فیصلہ کر لیا۔ ولید اپنی ماں کے اس فیصلے سے بالکل خوش نہ تھا اور اب تھوڑا بہت سمجھتا بھی جا رہا تھا [illegible] کہ [illegible] ناچاقی کی وجوہات کیا رہی ہوں گی۔ شمع نے وادان کی زندگی میں بھی پاکستان میں موجود وادان کے دیہاتی خاندان سے تعلق رکھنے کی کوشش نہ کی اور نہ اپنے میکے کو پلٹ کر دیکھا تھا تو اب تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

عشرت مرزا کے گھر تو وہ آ گئی تھیں لیکن عشرت مرزا کی پہلی بیوی اور تین بچے ہمیشہ ان کی آنکھوں میں کھٹکتے رہے، اوپر سے ولید کا عشرت مرزا کی بیوی کی طرف جھکاؤ انہیں اور پریشان کرتا۔ ثانیہ مرزا سلجھی ہوئی سی پڑھی لکھی عورت تھیں، انہوں نے ولید کو کھلے دل سے قبول کیا تھا، ولید ان کے پاس جا کر اکثر پڑھائی کے معاملات ڈسکس کرتا، اور نجانے کیا کیا دنیا زمانے کی باتیں۔ ثانیہ بیگم کے پاس کتابوں کا خزانہ تھا اور ولید کو تو اپنے باپ کے مرنے کے بعد گویا ثانیہ کی شکل میں ایک نیا خضر ٹکرا گیا تھا گو کہ عشرت مرزا کے بچے اپنی ماں کی طرح دل بڑا نہ کر سکے تھے لیکن ولید اس میں بھی خوش تھا۔

شمع کو ولید کا ثانیہ بیگم سے لاگ لگاؤ پسند نہیں تھا اور اپنی چھوٹی ذہنیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہوں نے عشرت مرزا کو بالآخر ثانیہ اور ان کی اولادوں سے چھٹکارا پانے پر راضی کر ہی لیا۔ عشرت مرزا اپنی نویلی بیوی کے حسن میں اتنے اندھے ہو گئے تھے کہ اپنے بچوں اور خوب سیرت بیوی سے اپنی دوسری شادی کے سال بھر بعد ہی جان چھڑا لی۔ ویسے بھی انہیں ثانیہ اور ان سے ہوئی اولادوں میں کبھی کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ وہ ان کے لیے ان کی اماں کی پسند کردہ بہو رہیں، عشرت مرزا کی بیوی نہ بن سکیں۔ ولید کو دوسری بار اپنی ماں سے شدید نفرت محسوس ہوئی تھی، وہ جان گیا تھا کہ اس کی ماں نے پہلے اس کے فرشتہ صفت باپ کے ساتھ کیا کیا اور اب ثانیہ اور ان کے بچوں کے ساتھ کیا کر چکی ہیں۔ عشرت مرزا سے اس کا خون کا رشتہ نہیں تھا اس لیے وہ انہیں الزام دیتا نہ کسی اور معاملے میں گردانتا۔ شمع نے واحد اچھائی جو شاید کی وہ عشرت مرزا کو ولید کی پڑھائی لکھائی پر مرکوز کرا سکیں۔ آخر بیٹا تو ان کا ہی تھا۔ اس لیے ولید کی پڑھائی کا کوئی حرج نہ ہوا۔ اور

مرحوم دادا ان کا ایک خواب تو ایسے پورا ہوا۔

☆☆☆

موبائل فون کی بیل پر میں نے دیکھا، احسن کال کر رہا تھا۔

"ہاں بھائی۔ کدھر پہنچا؟" میں نے فون اٹھاتے ہی پوچھا تھا۔

"بھائی۔ پارکنگ میں کھڑا ہوں، فٹافٹ نیچے آ جاؤ۔"

احسن کی بےزار آواز فون پر سنائی دی، میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ایک ہزار گالیاں دینے کے بعد ہی سہی احسن میرے ساتھ ثانیہ مما کے گھر ڈنر پر جا ہی رہا تھا۔

"بس میں نیچے اتر رہا ہوں تم عین گیٹ تک لے آؤ گاڑی، اور جو تم سے کہا تھا وہ ساتھ لائے ہو کہ نہیں؟" میں نے پرفیوم کی بوتل انڈیلتے ہوئے احسن سے پوچھا۔

"بھائی۔ تو نیچے آ کر خود دیکھ لے، اب ظاہر ہے آیا ہوں تو پورا کام کر کے آیا ہوں گا نا۔" احسن کی جلی بھنی آواز اسپیکر پر ابھری۔

"اچھا اچھا زیادہ آگ بگولا نہ ہو، آ گیا میں۔" میں نے مسکراہٹ روکتے ہوئے کمرے کے دروازے سے چابی نکالی اور فون آف کرتے ہوئے لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔

احسن کی پھولوں میں چوائس گاڈ گفٹڈ تھی۔ ایسے بکے بنواتا کہ انسان دیکھتا رہ جائے۔ ثانیہ مما نے ہمارے دوحہ والے گھر میں بھی ایک گرین ہاؤس بنا رکھا تھا، انہیں گارڈننگ کا بہت شوق تھا اور پھولوں کا تو اس سے بھی زیادہ، اس لیے میں نے احسن سے کہہ کر کیک اور بکے منگوایا تھا ثانیہ مما کے لیے۔ حسن کے لیے میں دوحہ سے ہی لیدر والٹ لے کر آیا تھا۔
[illegible]
سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے سب سے زیادہ غیر جانبدار بھی تھا۔ پچھلے چند سالوں میں جب بھی میں پاکستان آتا اور ثانیہ مما سے ملتا، حسن ہمیشہ مجھے اچھی طرح ٹریٹ کرتا۔ آہستہ آہستہ مجھے وہ اپنے چھوٹے بھائیوں جیسا ہی لگنے لگا تھا۔ چند ایک بار ثانیہ مما کو کال کر کے مجھ سے دوحہ بات بھی کروائی اس نے۔ رہی سہی کسر سوشل میڈیا نے پوری کر دی تھی۔ حسن اب میرے لیے چھوٹے بھائی جیسا ہی تھا۔ جب اس نے پہلی بار فون پر ولی بھائی بلایا تو اتنی انجان سی خوشی ہوئی مجھے کہ میں خود اپنے جذبات نہیں سمجھ پایا۔ پاپا کے بعد پہلی بار مجھے ثانیہ مما نے اور اب حسن نے "ولی" بلایا تھا۔ اپنائیت کا وہ احساس جو میں نے پاپا کے میت کے ساتھ ہی زمین میں دفن کر دیا تھا وہ کہیں سے پھر واپس آ گیا تھا۔ حسن سے میری اکثر چیٹ ہوتی رہتی، اس نے بھی اپنی پڑھائی، دوستوں اور روزمرہ روٹین کے علاوہ مجھ سے کوئی ادھر ادھر کی بات نہیں کی تھی۔ پاکستان آنے سے پہلے میں نے حسن کو ہی کال کی تھی کہ میں پاکستان آ رہا ہوں اور وہ ثانیہ مما کو بتا بھی دے۔

☆☆☆

احسن کی سوک ہوٹل ایگزٹ پر میرے انتظار میں تھی، میں نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے گفٹ بیگز پیچھے ٹرنک میں ڈالے اور اندر بیٹھ کر احسن کو سلام کیا، سیٹ بیلٹ کی کلک کے ساتھ ہی اس نے گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔

"کہاں جانا ہے؟" احسن نے پوچھا۔

"یار میں میپس پر لگا لیتا ہوں پن لوکیشن ہے میرے پاس۔" مجھے کراچی کے رستوں کی کوئی خاص جان پہچان نہیں تھی، سال میں ایک بار آنا ہوتا اور اس میں بھی گاڑی ڈرائیور ساتھ ہوتے تو کبھی ضرورت نہ پڑی۔

"آپ مجھے سینڈ کر دیں ذرا لوکیشن، میں دیکھ لیتا ہوں، یہ کراچی ہے دوحہ نہیں۔ یہاں کب کون سا
[illegible]
سہارے چلے تو پہنچ چکے ہم۔" احسن کے جملہ مکمل کرنے سے پہلے میں لوکیشن بھیج چکا تھا۔

گاڑی سبک رفتاری سے اپنی منزل کی جانب

بڑھنے لگی اور میں آنکھیں بند کر کے دل ہی دل میں مناسب الفاظ ترتیب دینے لگا۔ ثانیہ مما اور ان کے بچوں سے ہونے والی متوقع گفتگو کے لیے۔ اتنی دیر میں احسن کی آواز کانوں میں پڑی۔

"ایک بات بتا۔"

"ہمم" میں نے آنکھیں بند کیے کیے جواب دیا۔

digest.library.com

"عشرت مرزا نے کیا پرفیومز کی ایکسپورٹ بھی کرنی شروع کر دی ہے؟"

"نہیں۔ کیوں؟ اور تجھے عشرت مرزا کے بزنس میں اتنا انٹرسٹ کیوں ہے......" میں نے آنکھیں کھول کر جلے بھنے لہجے میں جواب دیا، عشرت مرزا کا نام لے کر سارا موڈ خراب کر دیا تھا احسن نے "اور اس بے تکے سوال کی وجہ، وہ بھی اس وقت۔"

"بھائی پوری گاڑی میں لگ رہا ہے پرفیوم کا ٹرک الٹا دیا ہے کسی نے، اس لیے پوچھا۔" احسن نے اپنی خباثت بھری ہنسی چھپاتے ہوئے معصوم منہ بننے کی کوشش کی۔

"بہت ہی کوئی گھٹیا آدمی ہو......" میں نے اسے گھورتے ہوئے جواب دیا۔ "گاڑی چلاؤ فضول باتیں نہ کرو۔" میں واپس گاڑی کی سیٹ سے سر ٹکا کر آنکھیں موند چکا تھا۔

"لو ایک تو اتنی ٹینشن میں ہیں، ان کا دھیان بھی بٹاؤ اور گالیاں بھی سنو۔"

احسن کی بڑبڑاہٹ پر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی تھی۔ وہ ہمیشہ سے ایسا ہی تھا، اسی طرح غیر محسوس طریقوں سے میرا خیال رکھنے والا۔

مزید بیس منٹ کی ڈرائیو کے بعد احسن نے اعلان کیا کہ ہم منزل مقصود تک پہنچ چکے ہیں اور وہ گاڑی پارک کر رہا ہے۔ میں نے آنکھیں کھول کر [illegible] بمشکل اپنی گاڑی لگائی، تھوڑا سا آگے روشنیاں اور شاید کوئی نوڈ اسٹریٹ شروع ہو رہی تھی۔ کیمیکل کراچی کا رش والا علاقہ۔ میرے چہرے پر نا چاہتے

۔ ہولئے بھی تنا۔ گواری کا احساس ابھر آیا تھا۔ مجھے ایسے خستہ حال علاقے تو بالکل پسند نہیں تھے۔ اگر ثانیہ مما کا گھر نہ ہوتا تو قیامت تک مجھے ایسی جگہ پر کوئی نہیں لا سکتا تھا۔

احسن گاڑی میں بیٹھا تھا، اور میں ٹرنک کھول کر اس میں سے سامان نکالنے کے لیے جھکا تھا کہ ایک باریک زنانہ آواز نے میرے ہاتھ روک دیے۔

"مسٹر وائٹ گاڑی، آپ کو پتا نہیں ہے کسی کے گھر کے گیٹ کے آگے گاڑی نہیں پارک کرتے۔" احسن نے گاڑی سے باہر قدم رکھا تھا کہ نہ اچانک افتاد آن پڑی۔ جھانسی کی رانی شاید گاڑی لگنے کی آواز پر باہر تشریف لا چکی تھیں اور اب گھر کے گیٹ پر کھڑی احسن کی کلاس لگا رہی تھیں۔

"چل بھئی۔ اب سارا دن جو احسن نے مجھے تنگ کر رکھا تھا سب کا حساب بے باق ہو جائے گا۔" میں دل ہی دل میں سوچ کر مسکراتے ہوئے مزید ٹرنک میں جھک گیا، سامنے سے ٹرنک کے کھلنے کی وجہ سے دکھ نہیں رہا تھا کہ پیچھے بھی کوئی ہے۔

"مس وہ......" احسن نے کچھ کہنا چاہا۔

"اور یہ تو نمبر پلیٹ بھی گرین ہے۔ بس پاکستانیوں کی شان یہی تو ہے، ذرا جو سرکاری نوکری لگی، پورے شہر کو اپنے باپ کی جاگیر ہی سمجھ لیا، جہاں دل چاہا گاڑی لگا لی، جس سے دل چاہا جھگڑا کیا۔" مزید فرمودات کی آمد ہوئی۔

احسن اپنی سرکاری گاڑی پر آیا تھا اور اب وہ اسے مہنگا پڑ گیا۔

"محترمہ۔ آپ سنیں تو ہم مہمان......" احسن نے پھر کچھ کہنے کی کوشش کی۔

"ارے بھئی، کیا سنوں......؟ آپ سنیں میری، اور ہٹائیں یہ شاہی سواری ادھر سے۔ غضب خدا کا [illegible] ایمرجنسی ہو جائے تو گھر سے نکل کر بندہ ان جیسے ناہنجاروں کو ڈھونڈتا رہے۔ جو یہاں آتے وہاں نطفہ ناتحقیق کی طرح اپنی گاڑیاں چھوڑ جاتے ہیں۔

ہوئے آئے، جہاں مہمان آئے ہیں وہیں لگائیں اپنی گاڑیاں بھی۔"

آواز کڑک دار ہوگئی تھی مزید۔ میں بمشکل ہنسی روکے ٹرنک کے اندر گھسا ہوا تھا "نطفہ ناتحقیق گاڑی" واہ کیا اصطلاح تھی۔ اس وقت باہر نکل کر اپنی شکل دکھانا غصے کو مزید ہوا دینے کے برابر تھا۔ میں نے موبائل نکالا تاکہ حسن کو فون کر کے باہر بلا سکوں، ساتھ ہی سائیڈ ویو سے احسن پر نظر پڑی وہ منہ کھولے ہک دک کھڑا یہ سوچ رہا تھا کہ اس کے ساتھ ہو کیا رہا ہے۔

پیچھے کوئی بائک آ کر رکی تھی، اور اس سے پہلے میں حسن کو فون کرتا اس کی آواز عین پیچھے سے سنائی دی۔"

"السلام علیکم ولی بھائی، آپ ڈکے میں گھسے کیا کر رہے ہیں؟"

میں کھنکار کر پیچھے پلٹا، سامان نکال کر ٹرنک بند کیا اور آگے کی طرف نظر ڈالی۔ اب حسن آ چکا تھا تو نقص امن کے اندیشے میں خاطر خواہ کمی کی امید تھی۔

"کیسے ہو حسن؟" میں نے گرم جوشی سے اسے گلے لگایا۔

"ارے ولی بھائی، سامان دیں آپ مجھے چلیں اندر چلیں، باہر کیوں کھڑے ہیں..." حسن نے جلدی سے سارے شاپر میرے ہاتھ سے لیے۔ "یہ آپ کے دوست ہیں جنہیں ساتھ آنا تھا۔" حسن نے احسن کی شکل پر بے چارگی اور اپنی ہٹلر بہن کو گیٹ پر دیکھ لیا تھا اسی حساب سے سوال پوچھا۔

"ہمم۔" میں نے مسکراہٹ کنٹرول کرتے ہوئے احسن اور جھانسی کی رانی پر ایک سرسری نظر ڈال کر حسن کو جواب دیا۔

"ارے ثانیہ باجی۔ کیا گیٹ پر ہی تم نے پھڈا شروع کر دیا، یہ ولی بھائی کے دوست ہیں۔ ان کے ساتھ آئے ہیں تو گاڑی یہیں پارک کریں گے نا!" حسن مجھے آگے چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے ثانیہ سے مخاطب ہوا۔

بے بی پنک کاٹن کے کپڑوں میں ماتھے پر فرنچز، کالے رنگ کے چشمے اور ہو بہو ثانیہ مما کے نقوش اور چہرے کی معصومیت۔ اتنا کڑوا کیسے بول لیتی ہے یہ بندی۔

احسن مجھے دیکھتے ہی دو قدم پیچھے ہو کر فوراً میرے ساتھ آ کر کھڑا ہو گیا۔

"محترمہ۔ میں یہی کہنا چاہ رہا تھا کہ ہم مہمان ہیں اور ولید کے ساتھ آیا ہوں۔" احسن نے جلدی سے اپنی صفائی پیش کی جیسے اس کے بغیر وہ اندر نہیں آنے دے گی۔ حسن ہمیں لے کر لان میں آ چکا تھا اور گیٹ بند کر رہا تھا۔

"تو مہمان کو بھی پہلے انفارم کرنا چاہیے نا کہ کون ہے، کون ساتھ آ رہا ہے۔ اب ہمیں الہام تو ہونے سے رہا، بیسک مینرز ہوتے ہیں یہ بھی..." جلا کٹا لہجہ اب بھی وہیں کا وہیں تھا۔ شکر میری شکل دیکھ کر سر نہیں توڑا احسن کا۔ "بہرحال میں معذرت خواہ ہوں، یہاں اکثر لوگ بغیر اجازت اس قسم کی حرکتیں کرتے ہیں، آپ اندر تشریف لائیں۔"

"نن نہیں نہیں کوئی بات نہیں، آپ نے ٹھیک کیا جو ٹوک دیا۔"

احسن کو لقوہ ہو گیا تھا۔ شاید یا ایس پی صاحب کی اتنی عزت افزائی پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ میرا تو بس نہیں چل رہا تھا بھنگڑے ڈالوں۔ سارے بدلے برابر کر دیے تھے جھانسی کی رانی نے میرے۔ احسن مجھے بری طرح گھور رہا تھا جیسے ابھی کچا چبا لے گا اور میں انتہائی شریف بنا حسن کی معاونت میں لان پار کرتا ہوا اندر کی طرف قدم اٹھا رہا تھا۔

ثانیہ نے مجھے سلام تک نہیں کیا تھا، احسن کو کم سے کم اندر آنے کا تو کہا۔ میں کن انکھیوں سے اسے دیکھتا رہا، اندر داخل ہوتے ہی حسن ہمیں ڈرائنگ روم تک لے گیا تھا اور ثانیہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر کہیں غائب ہو چکی تھی۔

کمرے کی کھڑکیاں کھلی تھیں اور باہر چھوٹا سا گارڈن ثانیہ مما کے شوق اور ذوق دونوں کی گواہی

دے رہا تھا۔ میں آنکھ بند کر کے ایک بار پھر پندرہ سال پہلے دوحہ والے گھر کے گارڈن میں پہنچ گیا تھا۔ جہاں پہلی بار میں نے ثانیہ مما کے ساتھ اپنی زندگی کا پہلا بیج بویا تھا۔ مجھے آج بھی یاد ہے ثانیہ مما نے کہا تھا۔

"نیکی بھی ان پودوں کی طرح ہوتی ہے، اس کی دیکھ بھال کرو اور پانی دیتے رہو تو ایک دن آپ کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت سے لوگوں کو فائدہ دیتی ہے۔ بس آپ کو صبر سے اس کی آبیاری کرنی ہوتی ہے۔"

میں ان کی باتیں کم ہی سمجھ پاتا تھا وہ بولتی ہی اتنا عالم فاضل ٹائپ تھیں لیکن یاد مجھے سب رہتا تھا جیسے یہ بات۔ میں اپنے ماضی کے گنتی کے چند حسین پلوں میں سے ایک میں مزید کھو جاتا، اس سے پہلے حسن کی آواز آئی۔

"ولی بھائی، آپ بیٹھیں پلیز۔ اپنے دوست کے ساتھ، میں امی کو بلاتا ہوں۔ یہ پانی کا جگ ہے۔ آپ پلیز، ریلیکس کریں اینڈ ہلپ یور سیلف۔"

"حسن، یہ احسن ہے میرا بچپن کا دوست۔ پولیس فورس میں ہوتا ہے ایس پی ہے۔" میں نے جلدی سے تعارف کروایا۔ "اور احسن یہ حسن ہے، ثانیہ مما کا سب سے چھوٹا بیٹا۔"

احسن نے دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ حسن سے مصافحہ کیا۔ حسن تھوڑا گھبرا گیا تھا احسن کی پرسنالٹی بھی کافی بارعب تھی۔

"جنٹلمین تمہارا بہت ذکر سنا ہے ولید سے۔" احسن نے حسن سے کہا تھا۔

"آئی ہوپ آل ان گڈ نوٹ۔" حسن نے شرارت سے جواب دیا۔

"ہاہاہا بالکل بالکل۔" احسن محظوظ ہوا۔

"احسن بھائی، وہ میں معذرت کرنا چاہ رہا تھا ثانیہ باجی کی طرف سے......" حسن نے اٹک اٹک کر کہنا شروع کیا۔ "پہلے ایک بار نانی کی طبیعت خراب ہو گئی تھی اچانک اور گھر کے باہر کوئی گاڑی پارک کر گیا تھا بہت ایمرجنسی ہو گئی تھی۔ ثانیہ باجی اور امی گھر پہ اکیلے تھے، کسی طرح ثانیہ باجی نے مینج کر لیا تھا لیکن اس دن سے ثانیہ باجی گھر کے باہر خاص دھیان رکھتی ہیں ذرا بھی دیر ہو جاتی تو شاید نانی آج ہمارے ساتھ......"

حسن کی بات بیچ میں تھی کہ احسن نے اسے ٹوک دیا۔ "ارے اٹس او کے، غلط بات غلط ہوتی ہے، تمہاری باجی نے ٹھیک کیا، بس شکر تم وقت پر آ گئے تو بچت ہو گئی۔" احسن نے دل پر پتھر رکھ کر مذاق میں بات ٹالی اور ساتھ ہی خشمگیں نگاہوں سے مجھے گھورا۔

"ہاہاہا یہ تو ہے۔ میں نہ آتا تو آپ کی خیر نہ ہی ہوتی۔" حسن پھر مسکرایا۔ "آپ بیٹھیں میں امی کو لے کر آیا۔"

حسن باہر نکلا اور میرے منہ میں دبا ہوا قہقہہ ہوا آزاد ہوا۔ احسن پانی کے تین گلاس چڑھا چکا تھا دانت کچکچا کر دبے لہجے میں بولا۔

"ذلیل انسان۔ تو مجھے اس لیے لے کر آیا تھا تا کہ اپنی طرف سے توپوں کا رخ موڑ سکے؟ تو اپنی خیر منا۔ جسے اپنے گھر کے پورچ پر دوسرے کی گاڑی نہیں پسند وہ اپنی ماں کو کسی دوسرے وہ بھی تجھ جیسے دوسرے کے حوالے کیا خاک کرے گی۔"

احسن کی اس بات پر میری ہنسی کا گلا گھٹ گیا تھا۔ میری سب سے بڑی پرابلم تو یہ ہی تھی۔

"ویسے کیوٹ بہت ہے، نہیں؟ بس منہ بند رکھے تو!" احسن نے میرا مشورہ لینے کی کوشش کی۔ میری نظروں کے سامنے ماتھے پر پڑی تیوریاں اور غصے بھری کالی چمکدار آنکھیں گھوم گئیں۔

"یار احسن۔ اللہ کے واسطے چپ ہو جا تو، اور ٹینشن نہ دے مجھے۔"

احسن کھڑکیوں سے باہر کے لان کا نظارہ دیکھنے لگ گیا تھا اور میری نظریں سائیڈ ٹیبل پر رکھی فیملی فوٹو پر تھیں جس میں سفید چادر سر پہ لیے ہلکی سی

مسکراہٹ کے ساتھ ثانیہ مما کرسی پر اور پیچھے حسن، ثانیہ اور محسن کھڑے تھے۔ ثانیہ مما کے چہرے کی طمانیت اور باقی تینوں کے چہروں کی مسکراہٹ اتنی جاندار تھی کہ لمحہ بھر کو مجھے شدید جلن محسوس ہوئی، غیر ارادی پور پر میں وہ فوٹو دیکھتا رہا۔ دل میں کہیں چپکے سے ایک خواہش نے سر اٹھایا کاش اس تصویر کے ایک کونے میں میرے لیے بھی جگہ نکل آئے ا اور مے بی آئی واز بینگ ٹو آئیڈیلسٹک۔ واز نٹ آئی؟

digest library.com

☆☆☆

''امی۔ ولی بھائی آگئے ہیں آپ کا ویٹ کر رہے ہیں نیچے۔ حسن نے کمرے میں آکر امی کو بتایا میں امی کے بستر پر بیٹھی لیپ ٹاپ پر کام میں مگن تھی، پہلے ہی ''ولی بھائی'' کے دوست کے ساتھ بحث نے دماغ ہلا دیا تھا۔

''آ گیا ولی، کب سے آیا ہوا ہے حسن پہلے ہی بتا دیتے۔'' امی کے چہرے کی پر مسکراہٹ واضح تھی۔

''امی، ثانیہ باجی کے سامنے تو آئے تھے انہوں نے نہیں بتایا؟'' حسن نے مکاری سے میری طرف مسکرا کر دیکھا۔ میرے گھورنے پر فوراً بات پلٹ دی۔

''ارے امی۔ ابھی آئے بس۔ میں پانی وغیرہ دے کر آیا ہوں اوپر آپ کو بلانے۔ ان کے کوئی دوست بھی ساتھ آئے ہیں۔''

امی حسن کی بات ختم ہونے سے قبل باہر نکل چکی تھیں کمرے سے اور پیچھے ان کے حسن۔ کہ اچانک وہ پلٹ کر آئیں۔

''ثانیہ بیٹا۔''

''جی امی، میں نے جھٹ سے سر اٹھا کر جواب دیا، مجھے لگا حسن نے بے غیرتی دکھاتے ہوئے انہیں نیچے والا اسٹنٹ بتا دیا میرا، اب میری خیر نہیں۔ بزنس ولید کے دوست کی خبر گیری کے چکر میں میری خبر لیں گی امی۔

''بیٹے، تم بھی آجاؤ، نیچے ٹیبل وغیرہ لگا دو۔ محسن آنے والا ہوگا بس پھر ساتھ میں کھانا کھاتے ہیں سب۔''

''امی کی بات پر میرا سینے میں اٹکا ہوا سانس بحال ہوا۔

''جی امی، بس آئی دس منٹ میں آپ چلیں۔''

میرا کام تقریباً مکمل تھا بس مجھے اب پوائنٹس بنانے تھے کہ پریزینٹیشن سے پہلے ایک بار فائنٹ دیکھنے کے لیے۔ وہ میں رات کو بھی کر لیتی، لیپ ٹاپ بند کر کے میں اٹھی اور جان بچ جانے کی خوشی میں خراماں خراماں نیچے کچن کی طرف چل پڑی۔

☆☆☆

''کیسے ہو ولی بیٹا۔'' میں نجانے کب تک سائڈ ٹیبل والی تصویر کو گھورتا رہتا کہ میرے کانوں میں ثانیہ مما کی لطیف آواز سنائی دی۔

السلام علیکم مما۔'' میرے منہ سے نکلا اور ثانیہ مما نے ہمیشہ کی طرح میرے سر جھکانے پر میرے بالوں کو سہلایا۔ اف کیا سکون ہوتا ہے اس ہاتھ کے لمس میں۔

''السلام علیکم آنٹی۔ میں احسن ہوں، ولید کا دوست۔

''ارے بیٹھو بیٹے۔ جیتے رہو۔ ولی کے دوست ہو تو ہمارے لیے ولی جیسے ہوئے۔ گھر مل گیا آسانی سے؟''

ثانیہ مما نے بات شروع کی، حسن بھی کمرے میں آگیا تھا، میں کرسی سے اتر کر نیچے قالین پر ثانیہ مما کے گھٹنے پر سر رکھ کر بیٹھ گیا تھا، اور ان کا ہاتھ ہمیشہ کی طرح میرے ماتھے اور بالوں کو چھو رہا تھا۔ تھوڑی دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔

''حسن، بیٹے محسن سے پوچھو کب تک پہنچے گا گھر، کھانا لگائیں پھر رات زیادہ ہو رہی ہے لیٹ کھانا نہیں کھانا چاہیے۔

ثانیہ مما نے بیچ میں حسن کو ہدایات دیں۔ اور سنو، ثانیہ سے کہو یہاں ہی ٹیبل سیٹ کر دے۔''

حسن سر ہلاتا باہر چلا گیا۔ احسن کا فون بجا اس کی کوئی امپارٹنٹ کال تھی۔ وہ ایکسکیوز کر کے باہر لان کی طرف چلا گیا۔ میرے پاس سنہری موقع تھا، ثانیہ مما کے ساتھ بات کرنے کا۔ میں نے ان کی طرف دیکھا وہ مجھے ہی دیکھ رہی تھیں۔ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ گویا ہوئیں۔

"کچھ کہنا چاہ رہے ہو دلی؟ پریشان ہو، کام کی ٹینشن ہے:" انہوں نے گویا میری مشکل آسان کی۔

"ثانیہ مما...... میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہ رہا تھا لیکن وعدہ کریں آپ ناراض نہیں ہوں گی۔ میں نے اٹک اٹک کر بات شروع کی۔

"ارے ایسی بھی کیا بات ہے بیٹے...... اور میں تمہاری باتوں پر ناراض نہیں ہوتی۔ اب بتاؤ جلدی سے، کیا پریشانی ہے؟" انہوں نے میرا حوصلہ بڑھا دیا تھا۔

"مما، میں پاکستان آگیا ہوں، ہمیشہ کے لیے......" ان کی آنکھوں میں مجھے لگا میں نے خوشی دیکھی اپنے اس فیصلے کی۔ "اور میں یہیں سے بزنس کروں گا اب، ضرورت پڑی تو دوحہ کا چکر لگے گا لیکن مستقلاً نہیں۔ میں نے یہاں گھر بھی خرید کر لیا ہے، آپ دیکھیں گی تو آپ کو بہت پسند آئے گا، اس میں بہت بڑا سا گارڈن بھی ہے، آپ کو بہت اچھا لگے گا۔" میرے جملوں میں روانی آتی جا رہی تھی۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے بیٹے، بہت اچھا فیصلہ کیا، میں تو ہمیشہ کہتی ہوں آدھی روٹی کھاؤ لیکن اپنی زمین پر کھاؤ۔ ماشاء اللہ برکت دے۔" ان کی دعائیں شروع ہو گئی تھیں۔

"مما، میں آپ کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔۔" میں نے ہمت کر کے کہہ ڈالا۔

"ارے ہاں ہاں بیٹا، میں ضرور ساتھ چلوں گی تمہارا نیا گھر دیکھنے، حسن کو ایڈریس بتا دینا اس کے ساتھ آجاؤں گی ان شاء اللہ۔

"نہیں مما۔ آپ سمجھیں نہیں۔" میں نے ان کو بیچ میں ٹوکا۔

"میں آپ کو اس گھر سے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ میرے گھر۔ اپنے بیٹے کے گھر میں رہیں آپ۔۔ میں افورڈ کر سکتا ہوں۔" میں نے جلدی جلدی الٹی سیدھی بات مکمل کی۔

ثانیہ مما کی دعائیں رک چکی تھیں، ایک عجیب سی مسکراہٹ ان کے چہرے پر تھی۔

"میں کیسے جا سکتی ہوں بیٹا۔ وہ تمہارا گھر ہے تمہارے ماں باپ کو......"

"وہ نہیں آنا چاہتے پاکستان۔" میں نے جلدی سے ان کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے بات سنبھالی، "اور بیچ بیچ میں آئے بھی تو الگ ہی رہیں گے۔ مما پلیز۔ میں اتنے سالوں سے اپنا ذاتی بزنس اسی لیے اسٹیبلش کر رہا تھا تاکہ یہاں پاکستان آکر رہ سکوں۔ آپ کے پاس، آپ کے ساتھ۔ آپ جانتی ہیں مجھے، میں نے بہت صبر سے اتنے سال گزارے صرف اس آس میں کہ یہاں سیٹلڈ ہو جاؤں اور آپ کو آرام سے رکھ سکوں۔ آپ چلیں گی نا میرے ساتھ۔؟ محسن، احسن، ثانیہ، آپ سب چلیں میں آپ کو ان سے الگ نہیں کر سکتا بس اتنا کہہ رہا ہوں کہ مجھے بھی اپنے ساتھ رکھ لیں۔ پلیز۔"

میری آواز بھاری ہو گئی تھی، ولید وادان ایک بار پھر سے پندرہ سال پیچھے چلا گیا تھا، میرا سر واپس مما کے گھٹنے پر ٹک گیا۔ مما خاموش تھیں اور میرا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ میں فیصلے کا انتظار کر رہا تھا۔ کیا وہ میرے حق میں ہوگا۔ کیا مما مان جائیں گی؟

میں تھوڑی دیر اسی طرح ساکن بیٹھا رہا، جذبات قابو میں آئے تو میں نے مایوس ہو کر سر اٹھانے کا سوچا۔ اسی لمحے مما کا ہاتھ دوبارہ میرے بالوں پر ٹھہر گیا تھا۔ میری سینے میں اٹکی ہوئی سانس باہر آئی۔ فیصلہ ہو گیا تھا۔

میں نے خوشی سے سر اٹھا کر مما کو دیکھا ان کے

چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

"تو آپ چلیں گی نا؟" میں نے بچوں کی طرح پوچھا۔

"ولید، میں وعدہ نہیں کرتی مجھے پہلے محسن اور تانیہ سے بات کرنے دو۔ ٹائم لگے گا وہ شاید نہیں مانیں گے۔ مان تو میرا دماغ بھی نہیں رہا لیکن دل کو تم نے راضی کر لیا ہے۔ اتنے سالوں میں پہلی بار کچھ مانگا ہے تم نے۔ مجھے بہت الجھن میں ڈال دیا ہے۔"

مما کی آواز میں تھوڑی پریشانی تھی لیکن کم سے کم وہ مان گئی تھیں۔ میرے لیے اتنا ہی بہت تھا۔ آدھی جنگ میں جیت چکا تھا۔ احسن کی کال شاید ختم ہو گئی تھی باہر لان میں فون بند کرتے ہوئے اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا اور میرے بے ساختہ قہقہے پر وہ ایک منٹ میں سمجھ گیا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔

مما! آپ آرام سے بات کریں محسن اور تانیہ سے بلکہ آپ کہیں تو میں بات کر لیتا ہوں۔ مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ آپ چاہیں تو ہم نانی کو بھی ساتھ لے جائیں گے وہ آپ پر ڈیپینڈنٹ ہیں، میں سمجھ سکتا ہوں اور آپ میری امی اور مرزا صاحب کی فکر نہ کریں انہیں میں ہینڈل کر لوں گا۔" میں نے انہیں یقین دہانی کرائی۔

"اچھا اچھا ٹھیک ہے۔ ابھی تانیہ یا محسن سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ محسن شاید پھر سمجھ جائے لیکن تم جانتے ہو تانیہ کو......" انہوں نے نظریں چراتے ہوئے جملہ مکمل کیا۔ "مجھے جا کر دیکھنے دو محسن آیا کہ نہیں، ٹیبل بھی سیٹ نہیں ہوئی اب تک۔" وہ کھڑی ہونے لگی تھیں کہ احسن اندر آ گیا۔

ارے آنٹی، آپ بیٹھیں نا۔ ولی حسن اور تانیہ کے ساتھ مل کر ٹیبل لگا لے گا۔ یہ آپ کی اتنی باتیں کرتا ہے مجھے آپ سے ملنے کا شدید شوق تھا۔

احسن نے اپنی میٹھی زبان کا جادو مما پر چلانا شروع کر دیا تھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے باہر جانے کا اشارہ کیا۔ میں سمجھ گیا تھا وہ مجھے فائنل اور سب سے خطرناک راؤنڈ کے لیے راہ ہموار کرنے کا اشارہ تھا۔ آپ سمجھ گئے نا؟ جھانسی کی رانی کچن میں تھی۔ ولی نے زندگی میں کبھی ٹیبل نہیں لگائی کھانے کی بلکہ اٹھ کر پانی تک نہ پیا۔ تانیہ مما کو لے جانے کے لیے، اس گھر میں سب سے تعلقات بحال کرنے تھے۔ میں نے اپنی شرٹ پر ہاتھ مار کر شکنیں دور کیں اور آل تو جلال تو پڑھتا ہوا باہر کی طرف ہولیا۔

☆☆☆

"ارے ولی بھائی۔ آپ کیوں باہر آ گئے کچھ چاہیے کیا؟"

حسن کی مجھ پر نظر پڑی تھی۔ وہ سلیب پر بیٹھا پیر ہلا ہلا کر کھیرے کھا رہا تھا۔ میں نے نظر گھما کر کچن کا جائزہ لیا تانیہ دکھائی نہیں دی تھی۔ جیسے ہی حسن نے مجھے دیکھا دھم سے نیچے اترا۔ ہاتھ اس کا کھیروں کی پلیٹ پر اور پلیٹ ٹھاہ کر کے زمین بوس ہوتے ہی کرچی کرچی ہو گئی۔ فریج کے پیچھے غالباً اسٹور نما جگہ سے تانیہ کا سر اور پھر وہ پوری خود برآمد ہوئی۔

"ستیاناس حسن کے بچے، اتنی محنت سے میں نے سیلڈ کے لیے کھیرے کاٹے تھے۔ کام کر نہیں سکتے تو بڑھاؤ تو نہیں کم از کم۔" تانیہ کی آواز تھی یا صور اسرافیل۔

"تانیہ باجی، میں سمیٹ دیتا ہوں سو سو سوری۔" حسن گھبرا گیا تھا۔

"بخشو میاں تم۔ جا کر اندر بیٹھو اپنے ولی بھائی اور ان کے چمچے کو کمپنی دو۔"

تانیہ کی بیزار آواز اور احسن کی شان میں ادا ہوئے کلمات پر بے ساختہ میرے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی تھی، شاید اس کی نظر نہیں پڑی تھی مجھ پر ابھی تک۔ میں دو تین قدم آگے بڑھا اور جائے وقوعہ پر پہنچ گیا۔

"باجی۔" حسن نے شاید اس کی توجہ میری طرف دلانے کی کوشش کی تھی۔

"کیا ہے باجی باجی، جاؤ نا اندر۔" تانیہ ہاتھ

میں شیشے سمیٹنے کے لیے وائپر لیے جھنجلا کر پلٹی اور مجھے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

''آپ کو کچھ چاہیے؟'' نپا تلا سوال۔

''جی، مجھے برتن دے دیں......'' میں نے کھنکار کر بات شروع کی۔ ''میرا مطلب، ڈائننگ ٹیبل پر کھانا لگانا ہے تو برتن دے دیں، میں ہیلپ کے لیے آیا تھا۔'' ثانیہ کی کالی آنکھیں مجھے نروس کر رہی تھیں میں نے اٹک اٹک کر بات پوری کی۔

''رہنے دیں۔ ہم مہمانوں سے کام نہیں کراتے آپ جا کر اندر بیٹھیں۔'' ثانیہ نے سیدھا جواب دیا اور شیشے سمیٹنے کے لیے واپس مڑی۔

''نہیں۔ میں لے جاؤں گا، ثانیہ مما نے بھیجا ہے مجھے۔'' میرے جرأت اظہار پر ثانیہ نے دوبارہ پلٹ کر گھورا مجھے۔

''اس اسپیڈ سے لے کر جائیں گے چیزیں اندر آپ۔؟'' پرسکون لہجہ اور ہاتھ میں موجود وائپر نما ڈنڈا ہلا تھا۔'' مجھے لگا میرے سر پر پڑنے والا ہے۔

''کس اسپیڈ؟'' میں نے الجھ کر پوچھا۔

''جس اسپیڈ سے اٹک اٹک کر آپ گفتگو کر رہے ہیں۔'' ڈائریکٹ جواب آیا تھا، میرے اٹک کر بولنے پر۔ میں شرمندہ ہو گیا ادھر حسن کی ہنسی چھوٹ گئی۔

''نن نہیں۔ میرا مطلب نہیں......'' میں نے اسٹرانگ آواز نکالنے کی کوشش کی۔ ''میں ہلپ کرا سکتا ہوں تم ٹرسٹ تو کرو۔'' میں نے کانفیڈنس بحال کرتے ہوئے جواب دیا۔

''اچھا۔ پھر یہ لیں۔''

ارے واہ۔ لڑکی مان گئی، دیکھنے میں سخت ہے لیکن ایسی بھی بات نہیں مان جاتی ہے۔ میں اپنے خیالی پلاؤ بنا رہا تھا کہ میرے ہاتھ پر پے در پے چار مختلف سائزوں کی شدید بھاری پتیلیوں کے سیٹ قیام پذیر ہو چکے تھے۔ ایک لمحے کو میں لڑکھڑایا لیکن اب تو عزت کا معاملہ تھا پتا نہیں خواتین اتنے بھاری بھرکم کام کیسے کر لیتی ہیں۔

''چلیے، کرا لیجیے ہیلپ۔ کم تو نہیں؟ ایک سیٹ اور رکھ دوں اس پر۔'' طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ سوال آیا تھا۔

''نہیں بس کافی ہے میں واپس آتا ہوں۔'' میں نے جلدی سے کہا اور واپس جانے کے لیے پیچھے مڑا تھا۔

''تم نے محسن بھائی کو فون کیا؟'' ثانیہ حسن سے پوچھ رہی تھی۔

''جی کیا تھا وہ لیٹ ہو جائیں گے'' آفس میں کام ہے انہیں۔'' حسن نے لاپروائی سے جواب دیا۔

''کچھ زیادہ ہی لیٹ نہیں ہونے لگے یہ۔ کال سینٹر میں کون سا روز روز لیٹ آورز کام۔'' ثانیہ کی آواز میں بھائی کے لیے فکرمندی تھی۔

یہ آخری الفاظ تھے جو میں نے کچن سے لاؤنج میں جاتے ہوئے سنے۔

کھانا خوش گوار ماحول میں کھایا گیا۔ میرا موڈ تو پہلے ہی بہت اچھا تھا۔ خلاف توقع ثانیہ نے بھی کوئی دل آزاری والی بات نہیں کی۔ ثانیہ مما کا بس نہیں چل رہا ہے تھا مجھے پوری دیگ کھلا دیتیں۔

کھانے کے بعد چائے کے دوران ہونے والی گفتگو میں حسن، احسن اور مجھے بتا رہا تھا کہ اسے جم کتنا دور پڑتا ہے۔ ثانیہ سائڈ چیئر پر بیٹھی کوئی سا میگزین کھنگالتے ہوئے چائے میں ڈوبی ہوئی تھی۔

کھانے سے پہلے میری مزید کوئی بات نہ ہو سکی تھی اس سے۔ ساڑھے دس ہو گئے تھے میں سوچ رہا تھا چائے پیتے ہی احسن کو اٹھنے کا کہوں، کہ پیچھے سے آتی آوازوں پر میرے کان کھڑے اور پیر زمین میں گڑ گئے۔ حسن کہہ رہا تھا۔

''احسن بھائی، ہر دن کوئی نہ کوئی جلسہ جلوس ہی لگا رہتا ہے یہاں، جم میں سب پروفیشنل لوگ ہیں، بینگ ٹرینرز آپ لیٹ نہیں ہو سکتے۔ محسن بھائی کا کال سینٹر بھی دو کلو وار پر ہے ان کا بھی روز کا مسئلہ ہے دو ڈھائی گھنٹہ تو ایک طرف کے سفر میں ہی لگ جاتا ہے

digest.library.com

ہمارا۔"

"ارے پھر تو بہت اچھا ہو جائے گا ، ولید کا گھر بھی اولڈ کلفٹن پر ہے، تم لوگوں کو شفٹ ہونے کے بعد آنے جانے میں آسانی ہو جائے گی انفیکٹ پیدل ڈسٹنس رہ جائے شاید۔"

احسن کے منہ سے بے دھیانی میں نکلی بات ،میری اور ثانیہ مما کی نظریں ٹکرائیں، انہوں نے مجھے منع کیا تھا کسی سے کوئی بات نہ کرنے کو اور بیچ میں ٹائم ہی نہیں ملا اتنا کہ میں احسن کو بتا پاتا اور وہ محترم اتنے جلد باز کہ منہ کھول بیٹھے۔ میں نے ثانیہ مما کو آنکھوں سے اشارہ کیا کہ وہ خاموش رہیں میں سنبھالتا ہوں۔

ثانیہ میگزین سائڈ پر رکھ چکی تھی اور حسن کے چہرے پر بھی سوالیہ نشان تھا۔

"کون کہاں شفٹ ہو رہا ہے؟ ثانیہ کا نپا تلا سوال آیا۔

"ولید بھائی آپ نے گھر لیا ہے یہاں؟ آپ ادھر ہی رہیں گے ۔کیا؟" احسن کی خوشی میں ڈوبی ہوئی آواز نے اصل سوال کو پس پشت ڈال دیا۔

"تم ذرا چپ کرو گے۔" ثانیہ نے اسے گھورا

۔

"آپ نے بتایا نہیں کون کہاں شفٹ ہو رہا ہے؟" ثانیہ نے کالی کالی آنکھیں احسن پر جما کر دوبارہ اپنی بات دہرائی۔ احسن مخمصے میں تھا سمجھ تو گیا تھا وہ ہو گیا ہے جو نہیں ہونا تھا۔

"وہ۔ میں......" احسن نے بات شروع کرنا چاہی تھی جو میں نے بیچ میں کھنکار کر کاٹ دی۔

"ثانیہ، میں دوحہ سے کراچی شفٹ ہو رہا ہوں۔ میرا گھر بھی دو تین ہفتے میں فرنش ہو جائے گا۔ میں چاہتا ہوں ثانیہ مما میرے ساتھ چل کر رہیں۔ اپنے بیٹے کے گھر میں آف کورس تم سب کے ساتھ۔ میں یہی بات کرنے آیا تھا آج بھی۔ احسن اسی کو ریفر کر رہا ہے۔"

میں نے سید ھا سید ھا مدعا بیان کر دیا کوئی اور آ پشن نہیں بچا تھا احسن کی بے وقوفی کے بعد، مجھے اس پر اتنا غصہ آرہا تھا۔

ثانیہ کے چہرے پر عجیب سے کیفیات تھیں، وہ شاید ضبط کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ثانیہ مما کے چہرے کی پریشانی الگ۔

"سیریسلی ولی بھائی؟" صرف حسن ہی ایکسائٹڈ تھا اس پورے سین میں۔" بھئی میں تو ضرور چلوں گا آپ کے ساتھ، اتنا مزا آئے گا نا۔"

"حسن، ول یو پلیز شٹ اپ؟" ثانیہ کا خول چٹخا تھا۔

احسن اپنی سیٹ سے کھڑا ہوا اور یہ کہہ کر باہر نکل گیا اس آئیمیلی میٹر میں باہر لان میں ہوں تب تک تم بات کرو۔ اس کے چہرے پر شرمندگی صاف بتا رہی تھی اسے اپنی غلطی کا پورا احساس ہے لیکن اب پچھتائے کیا ہوت۔

"ثانیہ، وی کین ٹاک۔ میری بات ایک بار پوری سن لو۔" میں نے دوبارہ ہمت کی۔

"امی، آپ سے اس بات کا ذکر ہوا ہے یا میں اسے ہوائی تیر سمجھوں جو ولید صاحب زبردستی نشانے پر بٹھانا چاہ رہے ہیں۔" ثانیہ کا سوال ثانیہ مما سے تھا اور وہ کبھی جھوٹ بول ہی نہیں سکتی تھیں۔

"میں نے بس ذکر کیا تھا مما سے۔" میں نے دوبارہ بیچ میں بولا۔

"آپ دو منٹ چپ نہیں رہ سکتے؟ یہ میرا سوال اپنی ماں سے ہے، انہیں جواب دینے دیں پلیز۔"

میں سناٹے میں آ گیا تھا، مجھے ایک بار پھر احساس دلایا گیا کہ یہ میری فیملی تو تھی ہی نہیں۔

"ثانیہ!۔" ثانیہ مما کی شاکڈ آواز آنسوؤں میں بھیگی ہوئی تھی۔ "ولید بھی اسی گھر کا بچہ ہے۔"

"تو آپ نے انہیں اس گھر کا بچہ بناتے بناتے اپنے بچوں کو ہی چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ پوچھنے کا بھی نہیں سوچا ہم میں سے کسی سے کہ ہم کیا چاہتے ہیں. کیا صرف ولید کی خوشی امپارٹنٹ ہے

ہمیشہ؟"

"نہیں بیٹا، تم بات تو سن لو اس کی۔" تانیہ مما اپنی صفائی دے رہی تھیں۔

"سنا میں کیا سنانا چاہتے ہیں۔ تانیہ واپس پلٹی تھی۔

میں نے دوبارہ اپنی بات دہرائی۔

"تانیہ مما نے کوئی فیصلہ نہیں لیا ہے۔ انہوں نے مجھے یہی کہا تھا کہ وہ تم سے اور محسن سے پوچھے بغیر مجھے ہاں نہیں کہہ سکتیں بس اتنی سی بات ہے۔ یہ میری خواہش ہے اس میں مما کا کوئی قصور نہیں انہیں غلط مت سمجھو۔"

"امی۔ آپ کیا چاہتی ہیں۔؟"

تانیہ کا دوسرا سوال مما سے تھا۔ "یا میں جو سمجھ رہی ہوں آپ وہی چاہتی ہیں۔" اس نے مما کو بولنے کا موقع نہیں دیا تھا۔

مما کے چہرے پر آس اور پریشانی دونوں نمایاں تھیں۔ وہ مجھے بہت پیار کرتی تھیں لیکن میں جانتا تھا وہ تانیہ حسن اور محسن کو بھی اتنا ہی پیار کرتی تھیں۔ ایک لمحے کو مجھے لگا کہ میں نے اپنی خودغرضی کے ہاتھوں انہیں ایک بڑے امتحان میں ڈال دیا ہے۔

"تانیہ اس پر ہم بعد میں بات کر سکتے ہیں۔ مہا بھارت کھولنے کی ضرورت نہیں ہے ابھی۔ ولید نے ایک آپشن دیا ہے اور ہم ڈسکس کر کے اسے جواب دے سکتے ہیں۔ بس کرو اب یہ تماشا ان لوگوں کو دیر ہو رہی ہے۔ لیٹ دیم گو۔" مما نے خلاف عادت اتنی لمبی بات کی تھی۔

"نہیں امی، بعد میں نہیں ابھی بات ہوگی۔"

تانیہ کے لہجے میں کچھ عجیب تھا۔ ہم تینوں نے الجھ کر اسے دیکھا۔

"ایک آپشن ولید نے دیا ایک میں دے دیتی ہوں۔ انہیں آپ کے ساتھ رہنا ہے اور اس کے لیے یہ کچھ بھی کریں گے۔ اور امی بھی ظاہر ہے یہی چاہتی ہیں۔ تو آپ ہمارے اسی گھر میں پی جی کے طور پر رہ لیں نا ولید۔ ہم کیوں در بدر ہوں آپ کی وجہ سے۔"

تانیہ کا آپشن تھا یا بم۔ مجھے تو سن کر ہی چکر آنے لگے تھے۔

"تانیہ دماغ ٹھیک ہے یہاں کہاں رہے گا یہ۔" مما کی آواز دور سے آتی سنائی دی۔

"کیوں۔ کیوں نہیں رہ سکتے۔ مان لیا مڈل کلاسیوں کا محلہ ہے اور یہ پرنس آف دوحہ لیکن محبت اور جنگ میں بندہ کچھ بھی کرتا ہے نا...... آپ سے انہیں اتنی ہی محبت ہے بس؟" تانیہ کے لہجے میں ایکسائٹمنٹ اور طنز دونوں تھے۔ میں اسے گھورتا رہا۔

"ویسے اتنا برا آئیڈیا بھی نہیں ہے۔ اور سب سے امپارٹنٹ بات تانیہ باجی بغیر بحث کے خود سے مان گئی ہیں۔" حسن نے بھی اپنا حصہ بٹایا۔ تانیہ کی توصیفی نظریں حسن کو دیکھ رہی تھیں۔

"بس۔ میں نے دے دیا اپنا پوائنٹ آف ویو، جب آپ کو موو کرنا ہو بتا دیے گا۔ ہم گراؤنڈ فلور پر اسٹڈی روم آپ کے لیے سیٹ کر دیں گے، نانی اور ماموں کا پورشن الگ ہے انہیں کوئی مسئلہ نہیں ہونا چاہیے۔ ہوگا تو امی بتا دیں گی آپ بہت سارے قطری ریالوں میں کرایہ دیں گے دونوں چپ ہو جائیں گے۔

تانیہ نے میگزین اور چائے کی پیالی دونوں سائڈ ٹیبل پر رکھیں اور مسکراتے ہوئے کھڑی ہوئی۔

یہ لڑکی کیا شیطانی پلان کر رہی ہے۔ میں صرف یہ سوچ رہا تھا۔ فی الحال اتنا ہی بہت تھا کہ اس نے میری ضد میں سہی مجھے ساتھ رکھنا گوارا کر لیا تھا۔ حسن ٹھیک کہہ رہا تھا اتنا برا آئیڈیا بھی نہیں تھا لیکن اگر میں ابھی اپنی آمادگی ظاہر کرتا تو یہ الٹی کھوپڑی کی لڑکی پھر کوئی نیا فتور بھرا پلان لے آتی کچھ پتا نہیں یہ آفر بھی کھٹائی میں ڈل جاتی۔

تانیہ مما سر پکڑے بیٹھی تھیں۔ تانیہ کچن میں جا چکی تھی، میں نے مما کو تسلی دی اور ان سے دعا لے کر حسن سے گلے مل کر باہر نکلا جہاں لان میں احسن

جذ دلم کی طرح چکر کاٹ رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی میری طرف لپکا، پیچھے مما اور احسن دونوں ہی سی آف کرنے آئے تھے۔ احسن انہیں دیکھ کر رک گیا۔ سب کو خدا حافظ کہ کر ہم باہر نکلنے لگے تھے۔ جھانسی کی رانی اندر والے گیٹ پر بے تاثر چہرے کے ساتھ کھڑی تھی۔ فارمیلٹی کے طور پر بھی اس نے ہمیں خدا حافظ نہ کہا۔ میں سر جھٹک کر باہر آ گیا تھا۔ احسن گاڑی اسٹارٹ کیے میرے انتظار میں تھا۔

☆☆☆

اگلی صبح میری آنکھ عشرت مرزا کی فون کال پر کھلی تھی۔ اسکرین پر نمبر دیکھ کر میرا حلق کڑوا ہو گیا تھا۔ ویسے ہی ثانیہ مما کے گھر سے واپس آنے کی جھنجلاہٹ اور اب یہ۔ مرتا کیا نہ کرتا فون اٹھایا۔

"السلام علیکم انکل۔"

"والسلام بیٹا۔ کیسے ہو۔ کیا حال چال ہیں؟" عشرت انکل نے حسب عادت بے دلی اور رسمی کارروائی کیں۔ میرے رسمی جواب کے ملنے پر انہوں نے بات آگے بڑھائی۔

"بیٹا، تمہاری ماں تمہیں کب سے فون کرنے کی کوشش کر رہی ہیں، دو دن ہو گئے ہیں تمہیں پاکستان پہنچے ہوئے۔ اپنی خیر خیریت تو بتا دیا کرو انہیں، وہ پریشان ہوتی ہیں۔"

"جی انکل، تھوڑا بزی ہو گیا تھا دھیان نہیں رہا آئندہ خیال رکھوں گا۔" میں نے بھی رسمی جواب دے کر جان چھڑائی، مجھے پتا تھا ماما کے بار بار کال کرنے کا مقصد، اور اب ان کی بات نہیں بنی تو یہ عشرت انکل سے فون کروا دیا، انہیں بس یہ جاننا ہو گا کہ میں کہاں ہوں، ورنہ ساری دنیا گھومتا ہوں میں کسی اور ملک میں تو انہیں دو دن میں میری یاد نہیں ستاتی۔

"آپ کی ماما سے بات کروا رہا ہوں۔ آواز سنا دیں انہیں اپنی۔" عشرت انکل نے میری طرف سے مزید کوئی جواب نہ آنے پر کہا۔

دوسری طرف سے ماما کی آواز سنائی دی۔

"ولی بیٹا، کہاں ہو تم، فون کیوں آف تھا، سب ٹھیک ہے نا، تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے، منرل واٹر ہی پینا بیٹا اور۔"

"جی ماما، ٹھیک ہوں میں۔ بزی تھا کام میں نہیں کر سکا کال۔ اس سے پہلے کہ ماما کی نصیحتیں کسی اور طرف جاتیں میں نے جلدی سے ان کی بات کے بیچ میں بول دیا۔

"تھینک گاڈ۔" ماما نے طویل سانس لی تھی۔ "واپس کب آ رہے ہو؟"

"ماما، ابھی تو آیا ہوں، کام پہ دیکھیں کتنے دن لگیں یا شاید کچھ مہینے۔"

"واٹ؟ مہینے؟ مطلب تم وہاں اتنا ٹائم اتنے کہاں کرو گے اور یہ کون سا کام ہے جو مہینوں چل رہا ہے۔"

ماما حسب عادت پینک ہو گئی تھیں لیکن انہیں سلوموشن میں باور کرانا ضروری تھا کہ میں واپس نہیں آ رہا ہوں ایک ساتھ بتانا زیادہ بڑا شاک ہوتا۔

"ماما نئی مارکیٹ میں بزنس جمانا ٹائم ٹیکنگ ہوتا ہے ویسے بھی میں دوحہ میں بھی الگ ہی رہتا تھا یہاں احسن ہے ساتھ میرے، آپ پریشان نہ ہوں میں فون کرتا رہوں گا۔ آپ کے پاس عشرت انکل ہیں نا ویسے بھی!"

ماما کو کسی طرح تسلی دے کر میں نے فون منقطع کیا۔ میری بھوک فون کے بعد بڑھ کر سوا ہو گئی تھی اور چائے کی شدید طلب۔ فریش ہو کر ناشتے سے فارغ ہوا تو پچھلی رات کا کسوٹی سوال دماغ میں گھوم گیا۔ مجھے کل بہت اہم میٹنگ کے لیے ایک پارٹی سے ملنے جانا تھا۔ جانا مانا گروپ تھا، شام پانچ بجے میریٹ میں تھی ملاقات، ٹرکش مارکٹنگ کمپنی تھی اور فیملی اونڈ بزنس تیمور اور حلیل دونوں بھائی بہت کمپیلنٹ اور پروفیشنل لوگ تھے۔ تیمور میرے کلاس فیلو کا بچپن کا دوست رہا تھا اور بزنس آپریشنز وہی دیکھتا تھا، خلیل سپروائز کرتے، ان کا کوئی فیملی فنکشن تھا جس میں انہوں نے کچھ قریبی دوستوں کو مدعو کر

رکھا تھا، میرا آکسفورڈ کا کلاس فیلو تھا جس نے مجھے ریکمنڈ کیا اور یوں یہ ملاقات ممکن ہوئی لہٰذا کل شام سے پہلے مجھے اپنی پریزنٹیشن مکمل کرنی لازمی تھی جس کی تیاری میں پچھلے کئی دنوں سے کر رہا تھا۔ اس لیے تمام ادھر ادھر کے خیالات کو جھٹک کر میں لیپ ٹاپ کھول کر بیٹھ گیا۔

☆☆☆

"مرزا صاحب، کیا حال چال ہیں؟" رضا عابدی نے عشرت مرزا کو روک کر حال چال پوچھا۔

"اللہ کا شکر عابدی صاحب، کرم مالک کا۔"

"آپ پھر شام میں تشریف لا رہے ہیں نا بیگم کے ساتھ مشاعرے میں۔" عابدی نے یاد دہانی کرائی۔

"جی ان شاء اللہ ضرور۔" عشرت مرزا نے ہچکچاتے ہوئے بات مکمل کی۔ "شمع نہیں آسکیں گی، ان کی کوئی اور مصروفیات ہیں اور میں نے انہیں بتایا بھی آج صبح ہی اس کیے، میں ضرور حاضر ہو جاؤں گا۔"

"اچھا اچھا، چلیں شمع بھابھی آتیں تو بیگم بچوں سے بھی ملاقات ہو جاتی۔" عابدی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ارے مرزا صاحب، یاد آیا، اسمٰعیل ماربلز کے ساتھ کیا آپ نے کوئی نیا کام شروع کیا ہے؟" عابدی نے جاتے جاتے پوچھا۔

"جی نہیں۔" "ابھی تک تو نہیں، مارکیٹ میں نیوز بھی کوئی نہیں ہے ان کے کسی نئے پراجیکٹ کی۔" مرزا نے حیرت سے پوچھا۔

اسمٰعیل ماربلز بہت بڑی پارٹی تھی، جس کا اونر اسمٰعیل قدسی، مصری تھا، ایک نمبر کا ئیاں اور پکا بزنس مین۔ مرزا صاحب کی بہت خواہش تھی ان کے ساتھ کام کرنے کی۔ ظاہر ہے بڑی کمپنی، اچھی شہرت اور کام، تو پرافٹ مارجن بھی زیادہ۔ اور سب سے بڑھ کر نئے اور بڑے کانٹیکٹس۔

"اچھا۔ پچھلے ہفتے "دی گرانڈ" میں ایک کانفرنس میں گیا تھا میں، وہاں اسمٰعیل کے ساتھ مجھے لگا شمع بھابھی ہیں، جلدی میں تھا اس لیے پوچھ نہیں سکا۔ مجھے لگا شاید تم بھابھی کو ساتھ لے کر گئے ہو گے کسی میٹنگ کے لیے۔"

عابدی تو بول کر چلتے بنے اور مرزا صاحب کے دماغ میں نیا فتور کا بیج بو گئے۔ ان کو پچھلے چند ماہ میں شمع کے بدلتے ہوئے تیور یاد آنے لگے۔۔ مرزا صاحب ٹھنڈی سانس بھر کے واپس پلٹ گئے۔ ان کا دل کہہ رہا تھا کہ کچھ غلط ہونے جا رہا ہے۔

☆☆☆

"امی، میرا مسٹرڈ دوپٹا دیکھا آپ نے؟ مجھے کل شام کو پہننا ہے۔"

"بیٹی، تم خود رکھتی ہو اپنی چیزیں میں کیا بتاؤں، ڈھونڈو الماری میں۔"

"امی، ڈائی کرا کے لائے تھے تو سارے کپڑے ساتھ ہی رکھ دیے تھے اب مل ہی نہیں رہا۔" میری آواز رونے والی ہو گئی تھی۔

کل شام کو حلیمہ نے مجھے اپنے کسی گھر کے فنکشن پر انوائٹ کیا تھا، حلیمہ سے میری دوستی دوحہ میں برٹش اسکول میں ہوئی تھی، اس کے پیرنٹس ترکی سے دوحہ آئے تھے، بہت بڑا بزنس تھا، اس کے ابا اور بڑے بھائی نے پہلے دبئی پھر عمان اور اب پاکستان میں اپنا بزنس ایکسپینڈ کیا تھا، اسی کی ان اوگریشن پارٹی تھی۔ حلیمہ خود ایک ہفتے کے لیے پاکستان آئی تھی اپنی فیملی کے ساتھ۔ مجھے تو ساری ایکسائٹمنٹ ہی اس سے ملنے کی تھی، حلیمہ کی مما بھی مجھے میری فیملی ہسٹری سمیت اچھی طرح جانتی تھیں، اور باوجود سب کے ہمیشہ بہت پیار سے ملتیں، گو کہ انہیں ترکش اور عربی کے علاوہ کوئی زبان بولنی نہیں آتی تھی لیکن کہتے ہیں نا محبت کی اپنی زبان ہوتی ہے۔ وہ گونگے کو بھی سمجھ آ جاتی ہے بس وہی معاملہ سمجھ لیں۔ اتنا اہم فنکشن، مجھے حلیمہ کو پاکستانی فیشن والا قمیص شلوار بھی دکھانا تھا اب اینڈ ٹائم پر اتنی محنت سے بنائے ہوئے نئے سوٹ کا دوپٹا کھو گیا۔ اتنا غصہ آ رہا تھا۔

"امی، شام میں حلیمہ آئے گی پک کرنے
ہیں اس کے ساتھ باہر جاؤں گی کافی پر۔ سوری
جلدی جلدی میں پلان بنا بتانا بھول گئی۔ اچانک
مجھے یاد آیا۔"

"تانیہ، کتنی دفعہ منع کیا ہے بیٹی، شام کو نہیں نکلا کرو گھر سے، آتے آتے رات ہو جاتی ہے۔ میرا دل ہولتا ہے۔" امی کی فکرمندی والی آواز سنائی دی۔

ہماری اماں ان لوگوں میں سے تھیں جن کی لغت میں مغرب کے بعد گھر سے نکلنا کفر تھا، اور میرے لیے تو وہ زیادہ ہی پریشان رہتیں ظاہر ہے لڑکی، پھر ہمارے ہاں کے حالات۔ جب کہ حسن امی کو کہتا بھی تھا باجی چار کو مار کر آئے گی اس کی فکر نہ کیا کریں۔ لیکن ماؤں کے دماغ کو آپ نہیں سمجھ سکتے۔

"امی، حلیمہ گھر ڈراپ کرے گی اکیلے نہیں آؤں گی، پریشان نہ ہوں، وہیں سے دوپٹا بھی دیکھ لوں گی۔" میں نے ان کے گلے میں ہاتھ ڈال کر گال پر پیار کیا اور ان کی ہلکی سی مسکراہٹ دیکھ کر باہر نکل گئی۔

شام پانچ بجے حلیمہ کی بڑی سی کالی بی ایم ڈبلیو ہمارے گیٹ پر تھی۔ حلیمہ ان لوگوں میں سے تھی جسے دوستی کے لیے کسی کا بینک بیلنس یا ظاہری حالات جانچنے کی ضرورت نہیں ہوتی، انہیں بس دوست چاہیے ہوتے ہیں جو انہیں سنیں ان کی قدر کریں۔ بے لوث اور بے غرض، شاید یہی وجہ تھی کہ عشرت صاحب کے گھر کی عیش و عشرت والی زندگی اور رکھ رکھاؤ چھن جانے کے باوجود بھی حلیمہ نے کبھی میرا ساتھ نہ چھوڑا۔

اس سے پہلے کہ اس کا شوفر گاڑی لگاتا وہ شور مچاتی ہوئی گاڑی سے اتری تھی۔

"کیسی ہو میری جان تانی۔" ہمیشہ کی طرح لپک جھپک کر اس نے میری گردن میں ہاتھ ڈالا تھا۔

"پرے ہٹو۔ ویسے ہی اتنی دیر سے آئی ہو۔" میں نے مصنوعی خفگی دکھائی۔

"سوسوری تانی، تمہیں پتا ہے بھائی کی کل کی پریزینٹیشنز کے چکر میں اتنا ٹائم لگ گیا۔ حالی بھائی اپنی ٹینشن نہیں دیتے لیکن چھوٹے بھیا تو بھئی اللہ معاف کرے پرفیکشن کا بھی کوئی نیکسٹ لیول چاہیے انہیں ہر چیز میں۔"

حلیمہ جلدی جلدی بولے جا رہی تھی۔ مجھے اس کے بھائیوں اور ان کے گھریلو معاملات میں اتنی ہی دلچسپی تھی جتنی حسن کو کچن کے کاموں سے۔ اس کا دل رکھنے کے لیے گاڑی میں بیٹھنے تک میں بے تکان سنتی گئی۔

"اور تمہیں پتا ہے حالی بھائی کی بیگم اور ان کا بیٹا بھی آئے ہیں۔ ویسے نام تو اس کا تنویر رکھا تھا لیکن سب اسے ٹنی بلاتے ہیں، اب وہ تین سال اولڈن ناؤ۔ بالکل چھوٹے بھیا پہ گیا ہے۔ تم کل آ ؤ گی۔ تو ضرور ملواؤں گی۔ یو ول لو ہم، ہی از سو ایڈورایبل!"

حلیمہ کی باتوں، پرانی یادوں اور روڈ پر رش نے اتنا موقع ہی نہیں دیا کہ کچھ الٹا سیدھا خیال ذہن میں آتا۔ جب کہ میں سوچ کر بیٹھی تھی کہ حلیمہ کو ضرور ولید کی ہٹ دھرمی کی داستان سنانی ہے۔ غائبانہ طور پر وہ ولید کو اچھی طرح جانتی تھی۔

حلیمہ نے کل مجھے جلدی آنے کا کہا تھا، اسے کوئی ضروری بات کرنی تھی، میں نے ہزار بار کہا کہ ابھی بتاؤ لیکن اس نے میری ایک نہ سنی۔ اپنی مما کے ساتھ شاید کوئی سرپرائز پلان کیا تھا اس نے میرے لیے۔ یقیناً کوئی مہنگا گفٹ جو وہ مجھے سرپرائز کرنے کے لیے آنٹی کے ساتھ مل کر دینا چاہتی تھی۔

ایک بھرپور شام گزار کر رات جب نو بجے گھر میں گھسی تو امی کا منہ بنا ہوا تھا۔ میں نے خیریت اسی میں جانی کہ چپ چاپ کمرے کا رخ کروں بجائے مزید ڈانٹ کھانے کے۔ کل کی تیاری بھی کرنی تھی، کپڑے پریس، شوز، بیگ سب ریڈی کرنا تھا۔

سال میں ایک آدھ بار ہی ایسے مواقع آتے تھے جب میں دل سے کسی پروگرام میں شرکت کرتی۔ یہی سب کرتے کرتے ٹائم گزر گیا اور میں اگلے دن کی پارٹی اور حلیمہ کی ضروری بات کا سوچتے سوچتے نیند کی وادیوں میں اتر گئی۔

☆☆☆

digest.library.com

احسن مجھے ٹائم سے میریٹ کے گیٹ پر چھوڑ گیا تھا۔ بقول اس کے۔ "اتنا تو لوگ بر دکھوے کے لیے تیار نہیں ہوتے جتنا ٹنشن میں تو لگ رہا ہے۔"

مجھے پر یزینٹیبل لگنا پسند تھا۔ ویل گرومڈ اور ڈسپلنڈ۔ جوتوں سے لے کر ہیئر اسٹائل تک سب کچھ صاف ستھرا اور انسانی شخصیت کے حساب سے ہونا چاہیے۔ اور پھر یہ تو بزنس میٹنگ تھی، انڈسٹری کے بہت سے نامور لوگوں سے ملاقات ہو سکتی تھی تو اتنا تو بنتا تھا۔

میں اپنے آپ کو کول ڈاون کرتا ہوا بتائے گئے ہال میں داخل ہوا۔ خلیل اور تیمور دونوں بہت گرم جوشی اور پر اخلاق طریقے سے ملے۔ شروعات اچھی تھی اب آگے آگے دیکھنا تھا کیا ہوتا ہے۔ میں باتیں کرتا ہوا ڈرنک کا گلاس ٹیبل پر رکھ کر پیچھے مڑا تھا، تیمور سے میں اس کی کمپنی کے اسٹیک ہولڈرز پر بات کرنا چاہ رہا تھا کہ سامنے نظر پڑتے ہی میرے الفاظ گلے میں ہی گھٹ گئے۔ ایک لمحہ تو میں پہچان نہیں پایا کہ یہ ننھی منی لڑکی جھانسی کی رانی ہے۔ پر یہ یہاں کر کیا رہی ہے؟

"از دیئر اینی پرابلم ولید؟" تیمور نے میری بے دھیانی شاید نوٹ کر لی تھی۔ اس لیے فوراً پوچھا۔

"نو۔ آف کورس ناٹ۔" میں نے سنبھل کر فوراً پروفیشنل مسکراہٹ چہرے پر سجالی اور بات وہیں سے جوڑی جہاں چھوڑی تھی۔ میرا دماغ جب کہ آف وائٹ فراک اور مسٹرڈ دوپٹے میں موجود لڑکی میں ہی الجھا ہوا تھا، جو شاید میری یہاں موجودگی سے نا واقف تھی۔

☆☆☆

میں اپنی سات کلیوں کی آف وائٹ فراک اور لمبے مسٹرڈ دوپٹے میں ابھی وقت سے پہلے پہنچ گئی تھی، اس کی ماما بہت پیار سے ملیں۔ ہمیشہ کی طرح ٹوٹی پھوٹی انگلش اور عربی میں مجھ سے حال چال پوچھا۔ حلیمہ کے بھتیجے سے میری تھوڑی دیر میں ہی بہت دوستی ہو گئی تھی۔ نتیجتاً وہ ہال میں آگے آگے اور میں اس کے پیچھے پیچھے۔ بچوں سے میری دوستی ایسی ہی تھی۔ کیونکہ وہ صاف دل ہوتے ہیں، فائدہ نہیں اٹھاتے، انسانوں کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال بھی نہیں کرتے۔ حلیمہ مجھ سے ایکسکیوز کر کے اپنے بھتیجے کے ساتھ کہیں ادھر ادھر ہوئی تھی۔ اس کے بھائی نے کسی سے ملنے کے لیے بلایا تھا، اس کی امی کے برابر میں کوئی جاننے والی خاتون آن بیٹھی تھیں جن کی نظریں مجھے الارم دیتی محسوس ہوئی ہیں۔ اچھا خاصہ تاڑ رہی تھیں محترمہ۔ اور ساتھ ہی حلیمہ کی امی کے ساتھ کانا پھوسی میں مشغول، میں جہاں موجود تھی وہاں سے بس "ہو از شی؟ (یہ کون ہے؟)" ہی سن پائی تھی۔

ناٹ ہیئر پلیز۔ (یہاں نہیں پلیز) میں نے لمبی سانس بھر کر خود بخود اپنے آپ پر لعنت بھیجی۔ ایسی آنٹیاں مجھے ویسے ہی زہر لگتی ہیں جو یہاں وہاں کی سوشل پارٹیز میں اپنے جوان ہوتے بیٹوں کے لیے گھریلو خادمائیں نما بہوؤں کو ڈھونڈتی پھرتی ہیں۔ مجھے اندازہ تھا میرے ساتھ ساتھ انہوں نے اور چھتیس لڑکیوں کو تاڑنا ہے ابھی، کوفت زدہ ہوتے ہوئے، ان پر لعنت بھیج کر میں اپنا دھیان بٹانے کو دوبارہ حلیمہ کے بھتیجے کو تلاشنے لگی۔ ہال سے باہر پول سائڈ کی طرف کھلتے گیٹ پر مجھے وہ نظر آیا۔ آس پاس مجھے کوئی فیملی والا نہیں دکھا۔ میں اس ڈر سے کہ کہیں بچہ گم نہ جائے فوراً لپکی۔ وہ میری نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ میں تقریباً بھاگتی ہوئی باہر کی جانب بڑھی اور ساتھ ہی فون پر حلیمہ کو کال کرنے کی

...بش بھی کی۔ کس سے پوچھوں؟ کیسے ڈھونڈوں، ...نا پروائی۔

تو بھلا کس قسم کے بھائی ہیں، بھتیجے کو بلوایا اور ...ے ایسے چھوڑ دیا اتنے لوگوں کے بیچ۔ میں باہر پول ...ئیڈ ایریا میں دیکھتے ہوئے یہی سوچ رہی تھی کہ اب کیا کروں۔ آواز دیتی ہوں۔ ذہن میں جھماکا ہوا۔ ...ہی بچہ میری آواز پہچانتا ہے ابھی اتنی دیر کھیلتا رہا ہے ...ن کر جواب تو دے گا۔ حلیمہ کا فون مسلسل بزی جا رہا تھا اور میں اندر جا کر اس کی امی کو بتانے میں وقت نہیں ضائع کرنا چاہتی تھی۔ اس کی بھابھی بھی مجھے نہیں دکھ رہی تھیں اور اس کی فیملی میں کسی اور سے میرا تعارف تھا نہیں۔۔ کیا نام تھا بھلا بچے کا؟ میں نے ذہن پر زور ڈالا۔

"تیمور۔ تیمور۔۔" میں حلق کے بل چلائی۔

ساتھ ہی ساتھ پوری جگہ بھی اسکین کرتی جا رہی تھی۔ کہاں چلا گیا بچہ۔ پودوں کی لمبی باڑھ کے پیچھے مجھے لگا کوئی کھڑا ہے۔ میں اس جانب لپکی

"تیمور۔ تیمور۔ ویئر آر یو۔؟ آنی از ویٹنگ ٹو پلے ود یو۔" (تم کہاں ہو تیمور، آنی تمہارے ساتھ کھیلنے کا انتظار کر رہی ہیں)

تین سال کے بچے کو خاک اتنی انگریزی سمجھ میں آتی میں تو بس بات کو لمبا کھینچ رہی تھی شاید آواز پہچان لے بات سمجھے نا سمجھے۔

"یس۔ ہاؤ کین آئی ہیلپ یو مس؟"

پیچھے سے ایک اجنبی آواز نے مجھے مڑنے پر مجبور کیا، سر گھما کر جو پیچھے دیکھا تو ایک سوٹڈ بوٹڈ ڈشنگ قسم کے صاحب ہاتھ میں مہنگا سگریٹ لیے کھڑے تھے۔

میں نے کوفت سے ناک سکیڑی۔ وہ میرے تاثرات شاید سمجھ گئے تھے جب ہی سگریٹ فوراً بجھایا گیا۔

"پارڈن۔ ڈو آئی نو یو؟ اف ناٹ دین پلیز ایکسکیوز می آئی ایم بزی ود سم تھنگ ریئلی ارجنٹ" (معذرت، کیا میں آپ کو جانتی ہوں؟ اگر نہیں تو معاف کیجیے میں اس وقت بہت اہم کام میں مصروف ہوں)

میں نے جلدی سے اپنے تئیں پیچھا چھڑایا۔

"تیمور۔ تیمور۔ کہاں ہو تم؟" تلاش دوبارہ جاری۔

وہ صاحب پیچھے کھڑے محظوظ نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے اور میرا پارہ آسمان پر جاتا جا رہا۔ اگر تیمور کو ڈھونڈنے کی ٹینشن نہ ہوتی تو ان کا دماغ ٹھکانے لگاتی۔

اس اثناء میں حلیمہ کا فون مل چکا تھا۔

"حلیمہ، جلدی سے پول سائڈ آؤ ، تیمور یہاں اکیلا آیا تھا اب مل نہیں رہا۔" میں نے جلدی جلدی پریشانی میں بات مکمل کی۔

"کیا مطلب؟" دوسری طرف سے حلیمہ کی حیرت زدہ آواز آئی۔

"یار۔ تم آؤ تو۔ سوال بعد میں پوچھنا۔" میں نے جھنجلا کر فون پر ہی اسے ڈانٹ کر فون رکھ دیا۔

"اتنی غیر ذمے داری۔ توبہ۔"

تیمور۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو سب لوگ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔"

ایک جانی پہچانی آواز پر میں نے پیچھے مڑ کے دیکھنا چاہا۔

"ہاں میں آ رہا تھا کہ کسی نے میرا نام پکارا تھا۔" ان ہی سوٹ بوٹ والے محترم کی محظوظ ہوتی آواز سنائی دی۔

میں نے پیچھے پلٹ کر دیکھا اور میری آنکھوں کے آگے تارے ناچ گئے۔ یہ منحوس یہاں کیا کر رہا ہے۔۔ ولید کو ان صاحب کے برابر دیکھ کر میرا حلق تک کڑوا ہو گیا۔ تو اس کی تھی وہ جانی پہچانی آواز۔ ۔ دل پر جبر کر کے میں نے سلام کیا، جس کا بہت عجیب سا رسپانس مجھے ملا۔ جیسے میرا مذاق اڑایا جا رہا ہو۔

واٹس ہیپنگ تانی۔۔ کیوں پریشان تھیں فون

پر؟" اس سے پہلے کہ دونوں حضرات میں سے کوئی کچھ بولتا حلیمہ کی آواز پر میں نے دائیں جانب دیکھا۔ وہ تیمور کا ہاتھ پکڑے کھڑی تھی۔

اف، شکر خدا کا۔ بچے کو دیکھ کر میرا سانس بحال ہوا۔

"اووو جانی جانی تیمور۔" میں فوراً لپک کر آگے بڑھی تھی اسے گود میں اٹھانے پیچھے والے صاحب کی مسکراہٹ اور گہری ہوگئی جب کہ ولید مجھے سڑے ہوئے موڈ میں لگ رہا تھا۔۔ بھاڑ میں جائے مجھے کیا۔

"تانی۔ یہ تیمور بھائی ہیں۔" سامنے کھڑے سوٹڈ بوٹڈ شخص کی طرف اشارہ کر کے حلیمہ نے کہا۔

"اور میرے بھتیجے کا نام "تنویر" ہے۔" حلیمہ شاید سارا معاملہ سمجھ گئی تھی، جلدی جلدی ہنسی ضبط کرتے ہوئے بولی۔

"واٹ!"

میرے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ پیر جہاں تھے وہیں رک گئے سمجھ میں نہیں آرہا تھا آگے بڑھوں کہ زمین پھٹے اور میں اس میں سما جاؤں۔ "جانو جانو تیمور۔" کی صدائیں کان میں گونج اٹھیں۔ لاحول ولاقوت، کہاں جا کر سر ماروں۔ اتنی شرمندگی!

"میں معذرت خواہ ہوں تیمور بھائی، میں بچے کو ڈھونڈ رہی تھی۔" بلآخر میں نے شرمندہ ہوتے ہوئے منہ کھولا۔ نظریں میری زمین پر ہی تھیں۔

"کوئی بات نہیں آپ مجھے تیمور بلا سکتی ہیں۔ تنویر کے لیے پریشان ہونے کا شکریہ۔" دبی دبی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب آیا۔

"کیونکہ آپ دونوں یہاں موجود ہیں۔ تو میں آپ کا تعارف کرا دیتا ہوں۔ ولید، یہ میری بہن حلیمہ، ہمارے پراجیکٹ کے آئی ٹی ونگ کو یہی لیڈ کریں گی اس لیے اٹس امپارٹنٹ کہ آپ ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ حلیمہ نے کنگ فہد سے اپنا آئی ٹی میں ایم ایس کیا ہے اور اپنی فیلڈ میں بہت کامپیٹنٹ ہیں۔ اور حلیمہ، یہ ولید ہیں۔ ہمارے پاکستان میں ہونے والے بزنس پارٹنر، کیمبرج سے بزنس اسٹڈیز کمپلیٹ کر چکے ہیں۔ یہاں آنے سے پہلے قطر اور عمان میں اپنا بزنس سکسیس فلی سیٹ اپ کر چکے ہیں۔"

"نائس ٹو میٹ یو۔" حلیمہ نے پروفیشنل طریقے سے ہاتھ آگے بڑھایا جسے ولید نے فوراً مصافحے کے لیے تھام لیا۔

اس پورے سین میں مجھے خود اپنا آپ غیر ضروری لگ رہا تھا۔ لہٰذا تنویر کا ہاتھ پکڑ کر میں نے وہاں سے کھسکنا چاہا۔ ویسے ہی بہت بے عزتی ہوگئی تھی میری چچا۔ بھتیجے کے ناموں کے چکر میں۔

"مس، آپ نے اپنا انٹرو نہیں کرایا۔" چچا میاں کی شوخ آواز سنائی دی۔

میں نے گہری سانس بھر کر پلٹ کر دیکھا۔ ولید کے منہ پر موجود شدید نحوست مجھے مزید خاکستر کر گئی۔

"تیمور بھائی، یہ تانیہ ہے، یاد ہے میری دوحہ کی اسکول فرینڈ؟ جس کے پاپا نے سیکنڈ میرج کر لی تھی اور ان کی اسٹیپ مدر کے کہنے پر تانیہ کی مما کو ڈیوارس دے دی تھی؟" حلیمہ نے میرے بولنے سے پہلے تعارف کروایا۔

ولید کا چہرہ سرخ پڑ گیا تھا۔ یکا یک مجھے لگا میرے دل میں سکون اتر گیا۔ ایک غائبانہ بے عزتی۔۔۔ اگر اس کے ہونے والے بزنس پارٹنر کو پتا چل جاتا کہ یہ اسی اسٹیپ مدر کا اکلوتا بیٹا ہے تو کیا عزت رہ جاتی تھی۔ اس پورے ایپیسوڈ میں پہلی بار میرے چہرے پر مسکراہٹ آئی۔

"نائس ٹو میٹ یو تانیہ۔" تیمور کا بھاری بھرکم ہاتھ میرے آگے ڈول رہا تھا۔ ولید کی نظریں پہلے مجھ پر پھر تیمور کے ہاتھ پر پڑیں۔

اس سے پہلے میں آگے بڑھ کر مصافحہ کرتی، ولید کی آواز تیمور کو یاد دہانی کرا رہی تھی کہ اندر اس کا انتظار ہو رہا ہے۔ تیمور نے مسکراتے ہوئے ہم سے اجازت چاہی اور ولید کے ساتھ اندر ہو لیا۔

"ہاہاہاہاہاہاہا۔" بہت دیر سے حلیمہ کے پیٹ میں رکا ہوا قہقہہ برآمد ہوا۔ "واٹ۔؟ جانو جانو بور"

تنویر ابھی بھی میری انگلی پکڑے کھڑا تھا۔ میں نے اس کا لحاظ رکھتے ہوئے حلیمہ کو گالیاں دینے سے گریز کیا اور ایک ناراض نظر ڈال کر تنویر کی انگلی پکڑے اندر بڑھ گئی۔

☆☆☆

"تمہیں مجھ سے کوئی ضروری بات کرنی تھی حلیمہ......" میں نے کل والی گفتگو یاد کرتے ہوئے پوچھا۔ مجھے بھی تمہیں کچھ بتانا ہے، امپارٹنٹ۔"

یار، بات تو کرنی تھی لیکن تم پلیز مائنڈ مت کرنا۔ اٹس ٹوٹلی اپ ٹو یو، ٹو کمپلون۔" حلیمہ نے اٹک اٹک کر بات مکمل کی۔

"ایسی بھی کیا بات ہے بھئی، بولو بھی۔ سسپنس کیوں پھیلا رہی ہو۔ میں نے جواب دیا۔

"تانی، ایسا ہے کہ مما چاہتی ہیں، میرا مطلب میں اور مما چاہتے ہیں کہ تیمور بھائی کی شادی کر دی جائے۔ وہ خود بھی ریڈی ہیں، میرا مطلب مما سے کہہ چکے ہیں کہ اب پاکستان والا بزنس بھی اچھا چل رہا ہے الحمدللہ اور ایکسٹینشن بھی ہو رہی ہے اور ان کا ارادہ بھی فی الحال پاکستان میں رہنے کا ہی ہے، جلیل بھائی اور پاپا قطر اور دبئی برانچز دیکھیں گے، تو ہی از ریڈی ٹو سیٹل ڈاون ہئر۔"

میرے سامنے سوٹڈ بوٹڈ ہینڈسم چہرہ گھوم گیا۔

"ارے واہ، یہ تو بہت اچھی بات ہے، تو ہم کیا خدمت کریں آپ کی؟ امی سے پوچھوں کوئی اچھی میچ میکر کا؟ تیمور بھائی کو کوئی لڑکی پسند نہیں ہے آئی مین آج کل کون کرتا ہے ارینجڈ میرجز وہ بھی اس عمر میں۔" میں نے حلیمہ سے پوچھا۔

"نہیں نہیں۔ میچ میکر کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اگر او کے ہو تو میں مما اور بھابھی کے ساتھ تمہاری امی سے ملنے آ جاؤں، اب تو تم تیمور بھائی سے مل بھی چکی ہو۔"

حلیمہ کی بات مجھے کچھ کچھ سمجھ میں آ رہی تھی اور کچھ میں سمجھنا چاہ نہیں رہی تھی۔

"حلیمہ، تمہارا دماغ اپنے حواسوں میں ہے؟ یا تم مجھ سے اپریل فول قسم کا کوئی کھیل کھیل رہی ہو!" میں نے بہت نپے تلے طریقے سے اس سے پوچھا تھا۔

"تانی، پلیز تم ناراض نہ ہو۔ یہ میرا آئیڈیا تھا، تیمور بھائی کی کوئی پسند نہیں ہے، گھر میں جب یہ ذکر ہوا تو میں نے تمہارا نام لیا تھا، مما تمہیں ہمیشہ سے پسند کرتی ہیں سو باقی کسی کو کوئی اعتراض نہ تھا، میں نے اسی لیے تم سے پہلے پوچھا ہے، کوئی مجبوری نہیں پلیز، مجھے غلط نہیں سمجھنا۔

"حلیمہ، میری بات غور سے سنو......"، میں نے اپنی پیاری سی دوست کو ہاتھ پکڑ کر اس کے کمرے میں صوفے پر بٹھایا۔ نیچے شور شرابے سے تنگ آ کر ہم اوپر حلیمہ کے ہول روم میں آ گئے تھے۔ "شادیاں ایسے نہیں ہوتی ہیں دوست۔ ہمارا کلچر، رہن سہن سب بہت ڈفرنٹ ہے۔ تمہارے بھائی، ان کا سوشل اسٹیٹس اور پسند ناپسند سب کچھ مجھ سے میرے لائف اسٹائل سے بہت الگ ہے، تمہارے بھائی کو بے شمار اچھی ڈیسنٹ فیملیز سے رشتے مل جائیں گے ڈوآبٹ آف سرچ۔ ایون اگر انہیں پاکستان میں ہی شادی کرنی ہے تو بھی۔ اور تم بھول رہی ہو کہ میں اپنی امی کو چھوڑ کر کبھی نہیں جا سکتی۔ میں آل ریڈی ایک بروکن فیملی کا حصہ ہوں حلیمہ، وہ بھی ایسی فیملی جہاں باپ دوسری عورت کے حسن سے متاثر ہو کر پہلی بیوی اور جوان ہوتے بچوں کو اکیلا چھوڑ دیتا ہے۔ مجھ سے گھر بسانے کی توقع کرنا بیکار ہے۔" میرے لہجے میں تھکن عود آئی تھی۔

سچی بات یہی تھی کہ امی اور عشرت صاحب کے حالات دیکھ کر میرے ذہن میں شادی وادی کا کوئی کونسیپٹ کبھی فٹ بیٹھا ہی نہیں تھا۔

تانی، تم ایک بار پھر سوچ لو پلیز۔ میری اور مما کی بہت خواہش ہے کہ تم ہمارے گھر آؤ۔ میری

digest library.com

دوست کے ساتھ ساتھ میری بھابھی کی حیثیت
سے......" حلیمہ کے لہجے میں دوست کے لیے سچائی
اور محبت تھی۔

"حلیمہ، مجھے اپنا سب سے اچھا اور پکا دوست
رہنے دو۔ مزید رشتوں کی ڈور میں نہ الجھاؤ۔ مجھے ڈر
ہے کہیں میں اپنی واحد اور سب سے اچھی دوست کو
بھی ان کمسن پھیریوں میں آن کر نہ کھو بیٹھوں۔
پلیز۔"

میرے حتمی الفاظ کر حلیمہ ڈس اپوائنٹڈ لگ رہی
تھی۔

"چلو مجھے گھر ڈراپ کرا دو اب۔ لیٹ ہو رہا
ہے امی ویٹ کر رہی ہوں گی۔"

حلیمہ اثبات میں سر ہلا کر اٹھی، ہم دونوں روم
سے نکل کر واپس لاؤنج میں پہنچے۔

"تم تھوڑی دیر ویٹ کرو، میں ڈرائیور ارینج کر
کے آتی ہوں۔"

حلیمہ ایک بار پھر مجھے مین ہال میں چھوڑ کر جا
چکی تھی۔ لوگ اسنیکس اور چائے سے لطف اندوز ہو
رہے تھے۔ میں کچھ دیر اپنے موبائل میں بزی رہی،
اچانک پیچھے سے آنے والی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"ثانیہ، آئیں میں آپ کو گھر ڈراپ کر دوں
، لیٹ ہو رہا ہے، ثانیہ مما پریشان ہو رہی ہوں گی۔"

"شکریہ۔ حلیمہ مجھے ڈراپ کروا دے
گی۔" میں نے روکھے لہجے میں جواب دیا۔

ڈرائیور، مجھ سے زیادہ قابل اعتبار ہے؟ آواز
شاکی تھی۔

"ارے بھئی، میں اس کی مہمان ہوں، پک
بھی اس نے کروایا تھا ڈراپ بھی کرا دے گی۔" "آ
پ تو اتفاقیہ طور پر مل گئے یہاں۔" میں نے چڑ
کر کہا۔

"جی، آپ کی لغت کے حساب سے منحوس
اتفاق۔" جواب واپس آیا۔

اسے پتا ہے میں اسے منحوس بلاتی ہوں۔
اوپس۔ میں نے دل میں سوچا اور تھوڑی شرمندہ
ہوئی۔

"آپ جائیے، میں آرام سے گھر چلی جاؤں
گی۔" میں نے دوبارہ بے مروتی دکھائی۔

"ثانی۔ ڈرائیور تو کوئی اویلیبل نہیں ہے اگر تم
بیس منٹس ویٹ کر لو تو تیمور بھائی تمہیں ڈراپ کر
دیں گے۔ آئی ایم سو سوری یار، مجھے پہلے سے
ڈرائیور کو روکنا چاہیے تھا۔" حلیمہ کی پریشان کن آواز
تھی۔

ہاااااا۔۔۔ تیمور اگین، میں نے سوچا۔ سچ بات
تو یہ تھی کہ میں پول سائڈ والے انٹریکشن اور پھر حلیمہ
کی فرمائش کے بعد پرنس چارمنگ تیمور کا ہرگز سامنا
نہیں کرنا چاہتی تھی۔ بلا وجہ کی شرمندگی، کا
ملٹیپلیکیشن۔ اوبر یا کریم سے اس وقت نہ حلیمہ مجھے
جانے دیتی اور گھر پہنچ کر امی سے بھی دس باتیں سننا
پڑتیں۔ مطلب کے وقت گدھے کو بھی باپ بنا لیتا
ہے انسان۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ولید سینے پر
ہاتھ باندھے گھورتی آنکھوں سے میری ہی سمت دیکھ
رہا تھا۔

"آپ مجھے ڈراپ کر دیں گے؟" نظریں
نیچی کیے میں نے شرافت سے پوچھا۔

"اور میں اتنی دیر سے کیا کہہ رہا تھا......" چڑی
ہوئی آواز آئی، "میں پارکنگ میں ہوں، احسن کی
وائٹ کرولا وہیں موجود ہے آپ آ جائیے۔" ولید
کہہ کر مڑ گیا تھا۔ شاید ناراض ہو گیا تھا میری حرکت
پر، لیکن سانوں کی! اس وقت ٹائم سے گھر پہنچنا اہم تھا
اور اس کے لیے ظاہر ہے حلیمہ کے ڈرائیور اور بھائی
سے زیادہ قابل بھروسا ولید تھا۔

حلیمہ کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ "اب مجھے بھی
کچھ بتاؤ گی؟ یہ بھیا کا بزنس پارٹنر تمہیں لفٹ دے
رہا ہے اور تم لے رہی ہو؟" اس کے لہجے میں حیرت
تھی۔ واٹ از دس بی ہیویر؟

"بہن یہی بتانا تھا تمہیں......" میں لمبی سانس
لی، "لیکن تفصیلات پھر کبھی سہی۔ ولید، عشرت
صاحب کی دوسری بیوی کا پہلا بیٹا ہے جو اب

پاکستان سیٹل ہو رہا ہے اور ہمارے ساتھ رہنا چاہتا ہے۔"

"واٹ!" حلیمہ کا منہ کھل گیا تھا۔ "اور یہ تم مجھے اب بتا رہی ہو؟"

"تو تم نے موقع کب دیا مجھے کچھ بتانے کا۔ نہ کل نہ آج۔" میں نے منہ بنا کر جواب دیا۔

"اچھا اچھا۔ یہ تو بہت ہی اسپائسی اسٹوری لگ رہی ہے۔ رات میں فری ہو کر کال پہ بات کرتے ہیں۔" حلیمہ نے مجھ سے گلے مل کر اللہ حافظ کہتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

گاڑی میں مکمل سناٹا تھا۔ میں نے بیٹھتے ہی سب سے پہلی کال امی کو کی تھی یہ بتانے کے لیے کہ ولید مجھے گھر ڈراپ کر رہا ہے۔ بھئی اب کسی پر اتنا اعتبار بھی نہیں کرنا چاہیے۔ گھر کا کہہ کر کہیں اور لے جاتا تو؟ امی کو بتانا لازم تھا۔ امی سے فون پر بات کرنے کے بعد بھی صاحب کا موڈ بگڑا ہی رہا۔ میں بھی خاموشی سے بیٹھی گھر آنے کا ویٹ کر رہی تھی۔ گھر کے گیٹ پر خاموشی سے گاڑی رکی۔

"ثانیہ مما کو سلام کہیے گا میرا۔ اس وقت جلدی میں ہوں ورنہ رکتا۔" سنجیدہ لہجہ میرے کانوں میں پڑا۔

"او کے۔" میں نے گیٹ بند کرتے ہوئے اللہ حافظ کہنا چاہا لیکن "چلیں رحیم انکل" ڈرائیور کو کہا گیا تھا نے میرے الفاظ گلے میں ہی گھونٹ دیے۔

"کمال ہے بھئی، اتنا بھی کیا طنطنہ ڈراپ کرنے کو منع ہی تو کیا تھا۔ پھر آ بھی گئی، انسان اتنا تو رک کے دیکھ لے کہ میں گیٹ کے اندر چلی گئی کہ نہیں۔" میں کچھ غصے اور کچھ حیرت سے بڑبڑاتی ہوئی گھر کے گیٹ سے اندر داخل ہوئی تھی

☆☆☆

رحیم انکل نے مجھے گھر ڈراپ کیا تو احسن آلریڈی وہاں موجود تھا۔ میرے گھر کی ایکسٹرا چابی ہمیشہ اس کے پاس رہتی تھی۔ فی الحال میں کسی سے

بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے غصہ کس بات پر آ رہا تھا۔ احسن میرا موڈ بھانپ چکا تھا۔

"کیا ہوا ولی، سب ٹھیک ہے، کیسی گئی تمہاری بزنس میٹنگ؟"

اس کے پوچھنے پر ایک بار پھر میری آنکھوں کے سامنے ثانیہ کے لیے تیمور کا بڑھا ہوا ہاتھ گھوم گیا۔

"ہاؤ ڈیئر ہی از۔" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔

"کیا ہو گیا میرے بھائی، لال پیلا چہرہ لیے کس کی ڈیئرنگ کو سلامی دے رہا ہے۔ سب ٹھیک رہا؟" احسن نے تشویش ناک لہجے میں پوچھا۔

"ہاں۔ ہاں ہاں سب فٹ اللہ کا شکر۔" میں نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے احسن کو مختصراً کہانی سنائی، تیمور کے ساتھ اگلی میٹنگ فکس ہونے کی خبر خوش آئند تھی احسن میرے لیے بہت خوش تھا۔ اور میں اسے دیکھ کر بس یہی سوچ جا رہا تھا کہ کہاں ہوتے ہیں ایسے بے غرضے لوگ دنیا میں۔ ایک میری سگی ماں جنہیں کوئی احساس اور فکر نہیں رہی کہ ان کی باتوں اور حرکتوں سے میں کتنا ہرٹ ہوتا ہوں۔ ایک طرف احسن اور ثانیہ مما جیسے لوگ جو بنا کہے میری تکلیف سمجھ جاتے ہیں اور بنا بتائے میری ہر خوشی ہر غم کا حصہ بن جاتے ہیں۔

"چل بھائی۔ میں نکلا، کل مجھے تین دن کے دورے پر شہر سے باہر جانا ہے، آفیشل ٹور ہے، رحیم انکل کو میں یہیں گاڑی سمیت چھوڑ کر جاؤں گا تجھے جب ضرورت ہو بلا لینا انہیں۔" احسن جلدی جلدی بولتا ہوا باہر نکلا تھا۔

اسے بھیجنے کے بعد میں فریش ہو کر چائے بنا کر کمرے میں آ گیا۔ اسٹڈی ٹیبل پر ڈائری میرے سامنے کھلی پڑی تھی لیکن میرا دھیان لکھنے سے زیادہ مسٹرڈ دوپٹے اور چوڑے مردانہ ہاتھ میں الجھا ہوا تھا۔ میں کیوں اتنا سر پر سوار کر رہا تھا ان دونوں کو، میری بلا سے ہاتھ ملائیں یا گلے ملیں۔

"تم نے بھی تو حلیمہ سے آگے بڑھ کر ہاتھ ملا لیا تھا تو یہ ڈبل اسٹینڈرڈ کیوں۔" میرے اندر سے آواز آئی۔

"حلیمہ سے میری پروفیشنل پارٹنر شپ ہونے جارہی ہے اور ہاتھ اس نے آگے بڑھایا تھا۔" میں نے کمزور سے لہجے میں اپنا دفع کیا۔

"بس۔ یا کوئی اور بات ہے جو تمہیں تنگ کر رہی ہے۔" میرے اندر والا ولی شدت سے مسکرایا تھا اور اس بات کا جواب یا تو میرے پاس تھا نہیں یا میں جانتے بوجھتے دینا نہیں چاہ رہا تھا۔

میں نے پیالی میں موجود گرم چائے بڑے بڑے گھونٹ بھر کے ختم کی اور لاؤنج میں جا کر اسپورٹس چینل لگا کر اپنا دھیان بٹانے لگا۔

☆☆☆

"عشرت صاحب، میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہ رہی تھی۔" شمع کے لہجے میں معمول سے ہٹ کر پختہ پن تھا۔

عشرت مرزا دن بھر کے تھکے ہارے گھر آئے تھے، حسب روایت گھر میں کچھ کھانے کو موجود نا تھا، انہوں نے چائے خود بنائی اور اود بیکری کے بن اور مکھن لے کر ٹیبل پر آئے ہی تھے کہ شمع چہرے پر ماسک سجائے ان کے سامنے ٹیبل پر آن بیٹھی تھیں۔

"بولیں، میں سن رہا ہوں۔"

عشرت مرزا نے اپنا دھیان چائے پر ہی مرکوز رکھا۔ انہیں امید تھی اب کوئی سے نئے گولڈ کے سیٹ یا اسی طرح کی فرمائش کی۔ اپنی جائداد کا بڑا حصہ وہ پہلے ہی شمع کے نام کر چکے تھے، شادی کے وقت اور پھر آہستہ آہستہ آنے والے سالوں میں۔ پاکستان میں جو کچھ بنایا تھا وہ انہوں نے اپنے بہن بھائیوں کو وقف کر دیا تھا، ثانیہ جس کو وہ سب کچھ ہوتے ہوئے بچوں کے لیے اسکول فیس یا مہینے کا خرچا تک نہ دیتے اور وہ اف نہ کرتی تھیں، ان کے مقابلے میں شمع کا لالچی پن اب انہیں کھلنے لگا تھا۔ اس عمر میں وہ اب تھکنے لگے تھے، نہ ان کی اپنی اولاد پاس تھی اور نہ شمع کا بیٹا ان کے کسی کام کا۔ جب کہ شمع اب بھی جوان لگتی تھیں بے فکری کی زندگی اور من موجی انسان کو بوڑھا کہاں ہونے دیتی ہے۔

"آپ دھیان دیں گے تو بات کروں گی نا۔" شمع کی آواز میں چڑچڑاہٹ تھی۔

"بیگم، میں صبح سے ابھی گھر میں گھسا ہوں، چائے تو پینے دیں، سن رہا ہوں آپ کی بات بولیں آپ۔" عشرت مرزا کا صبر جواب دے گیا تھا۔

"مجھے ڈیوارس چاہیے۔" شمع کے منہ سے نکلنے والے الفاظ تھے یا بم کا گولہ۔

عشرت صاحب کے ہاتھوں سے چائے کی پیالی چھوٹ کر گری تھی اور فرش پر چکنا چور ہوگئی۔ چند لمحے تو وہ سمجھ ہی نہیں پائے کہ ہوا کیا ہے۔ پھر ان کے منہ سے کچھ گڈمڈ الفاظ نکلے تھے۔

"آپ حواسوں میں تو ہیں؟ جانتی ہیں کیا کہہ رہی ہیں۔"

"اچھی طرح جانتی ہوں مرزا صاحب۔" شمع کے لہجے میں لاپروائی تھی۔

"آپ دیکھ لیں کس طرح لے کر چلنا ہے اسے۔ ولید کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے میں خود اس سے بات کرلوں گی۔" ناخن فائل کرتے ہوئے فائل پھینک دے کر وہ ٹیبل سے اٹھی تھیں۔

عشرت مرزا کی آنکھوں میں پانی آنا شروع ہو گیا تھا۔

"لیکن وجہ کیا ہے، اس عمر میں کیوں میرے سر میں خاک ڈلوا رہی ہیں آپ۔ ایسا کیا ہے جس کے لیے آپ بسا بسایا گھر اجاڑ رہی ہیں۔" مرزا صاحب کا لہجہ بہت کمزور تھا۔

"مرزا صاحب، آپ خواہ مخواہ بات کو ڈرامائی رنگ نہ دیں۔ میں مزید آپ کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔ عجیب گھٹن زدہ زندگی ہوگئی ہے۔ میری جب سے اس گھر میں آئی ہوں۔"

"کہاں جائیں گی اس عمر میں طلاق لے کر؟"

"کہاں جائیں گی کیا مطلب، میں کرلوں گی

digest.library.com

انتقام، میرا بیٹا ہے مجھے رکھنے والا، آپ کی اولاد کی طرح نہیں جو باپ کو پلٹ کر نہ پوچھیں۔" شمع نے طنزیہ لہجے میں جواب دیا۔

"وہ بیٹا جو آپ کا فون تک نہیں اٹھاتا؟" کم ظرف تو عشرت مرزا بھی کم نہ تھے فوراً پلٹ کر وار کیا

شمع تلملا کر کچھ کہنا چاہتی تھیں لیکن عشرت مرزا نے موقع نہیں دیا۔

"یہ تو آپ کو بتانا پڑے گا کہ آپ آخر اس طلاق کا مطالبہ ولید وادان کے بھروسے کر رہی ہیں یا اسمٰعیل قدسی کے۔" عشرت مرزا نے زہر خند لہجے میں بات مکمل کی۔

شمع بیگم کا چہرہ لحہ بھر کو رنگ بدلا تھا۔

"آپ کو جو سمجھنا ہے سمجھیں۔ لیکن یاد رکھیے گا، میرا فیصلہ اٹل ہے۔ بہتر ہوگا آپ جلد از جلد اور خوش اسلوبی سے یہ کام مکمل کر لیں ورنہ میں قانونی چارہ جوئیوں سے بھی واقف ہوں اور میرے اتنے کانٹیکٹس بھی ہیں جو اس کام میں میری مدد کر سکیں۔" شمع کھردرے انداز میں گویا ہوئیں اور لاؤنج سے باہر نکل گئیں۔

عشرت مرزا ان کے باہر جاتے ہی کٹی ہوئی شہتیر کی طرح کرسی پر گر گئے تھے۔۔ پندرہ سال پہلے کے مناظر ان کی آنکھوں کے آگے ریل کی طرح چلنے لگے تھے۔ ثانیہ کی ملتجی نظریں، اپنے بچوں کے معصوم لیکن خوف زدہ چہرے۔ جس سب کو وہ کبھی سمجھ نہیں پائے آج انہیں احساس ہو رہا تھا کہ طلاق سے صرف عورت کی نہیں مرد کی عزت بھی داغدار ہوتی ہے۔ پندرہ سال پہلے ثانیہ انہیں خدا رسول کے واسطے دے رہی تھیں کہ طلاق نہ دیں انہیں رسوا نہ کریں۔ عشرت مرزا نے ایک نہ سنی اب وہ سوچ رہے تھے اس عمر میں شمع جب طلاق لے کر جائیں گی تو لوگ کیا کہیں گے؟ عشرت مرزا ایک عورت کو نہیں بسا سکا۔ ان کی مردانگی پر بھاری ضرب پڑنے والی تھی۔

وقت اپنا انتقام لینے جا رہا تھا، جو کچھ انہوں نے چند سال پہلے کیا وہ پلٹ کر ان کے پاس آ رہا تھا اور وہ کچھ بھی نہیں کر پا رہے تھے۔

☆☆☆

اگلے تین چار دن کافی مصروف گزرے تھے۔ تیمور سے اگلی ملاقات کافی فرحت افزا ثابت ہوئی تھی۔ مجھے ثانیہ مما سے بات کرنے کا موقع بھی نہیں ملا، البتہ ثانیہ کی شرط میرے دماغ میں اب بھی گونج رہی تھی اور مجھے بہت جلد اس کا فیصلہ بھی کرنا تھا۔ بلکہ فیصلہ تو دل نے اسی دن کر دیا تھا، بس کچھ ہچکچاہٹ تھی جسے دور ہونے میں وقت درکار تھا۔ میں نے ثانیہ مما کو فون کر کے جمعے کی شام انہیں اپنے گھر انوائٹ کیا تھا۔ رہنے نا سہی میرا ذاتی گھر دیکھنے تو آ ہی سکتی تھیں وہ۔ انہوں نے حسن کے ساتھ آنے کا وعدہ کیا تھا۔ بہت مشکل سے دل میں آنے والی خواہش کا منہ بند کیا لیکن اچھی امید رکھتے ہوئے ڈھیٹ بن کر یاد دہانی بھی کرادی تھی ثانیہ مما کو کہ ثانیہ اور محسن کو بھی لے کر آئیں۔ ثانیہ مما نے بجھے بجھے لہجے میں ہامی بھر لی تھی کہ پوچھ کر دیکھیں گی ان سے بھی۔ میرا دل دکھ سے بھر گیا تھا جب مجھے اجنبی ہو کر ان کے لہجے، دکھ، تکلیف کا احساس ہو سکتا ہے تو پھر ان کی اپنی سگی اولاد کو کیوں نہیں؟ اس وقت میں صرف یہی دعا کر سکتا تھا کہ اللہ ان کو عقل سلیم عطا کرے اور اپنی ماں کی قدر بھی۔ سچ کہتے ہیں جس کے پاس جو نعمت ہو اسے اس کی قدر نہیں رہتی۔ کوئی مجھ سے پوچھتا تو۔ میری اپنی سگی ماں کے ہوتے ہوئے بھی مجھے ان سے وہ اپنائیت وہ محبت کیوں نہ مل سکی جس کا میں حق دار تھا۔ دنیا کی ساری مادی چیزیں امی نے میرے لیے سامنے لا کر ڈھیر کر دی تھیں۔ نہ دے سکیں تو بس ایک ماں کی محبت۔

میں انہی سوچوں میں رات تمام کر دیتا کہ میرے فون پر بجنے والے میسج کی بیپ نے میرا دھیان بٹایا۔

امی کا میسج تھا، انہیں مجھ سے کوئی ضروری بات

کرنی تھی کال کرنے کا کہا تھا۔ میرا کوئی موڈ نہیں تھا انہیں کال بیک کرنے کا مجھے پتا تھا انہیں صرف ثانیہ مما اور ان کی فیملی کے بارے میں کریدنا ہوگا۔ یہ جاننا ہوگا کہ میں ان کے ساتھ کس حد تک انوالو ہوں۔

بے دلی سے میں نے فون سائڈ پر ڈال دیا اور لائٹ بجھا کر سونے کی کوشش شروع کر دی۔ پتا نہیں کیوں بار بار وہ سفید فراک اور مسٹرڈ دوپٹا سونے سے پہلے بھی میرے دھیان میں لہرائے جا رہے تھے۔ میں نے اپنے بچپنے پر خود کو ڈپٹا اور آنکھیں موند کے لیٹ گیا۔

☆☆☆

"ثانیہ بیٹا، جمعے کو ولی نے اپنے گھر ڈنر پر انوائٹ کیا ہے۔ تم چلو گی؟"

امی نے ڈرتے ڈرتے مجھ سے پوچھا تھا۔ جیسے میرے سخت ردعمل کے لیے پہلے ہی تیار ہوں۔

"امی، آپ ایسے کیوں بول رہی ہیں۔ آپ کہیں گی تو میں جہنم میں بھی چل لوں گی۔ ایسی ڈری ڈری ہو کر کیوں بات کر رہی ہیں مجھ سے؟"

"وہ۔ تمہیں پسند نہیں ہے ولید، اس لیے میں نے سوچا۔"

"غلط سوچا آپ نے بہت ہی......" میں نے مصنوعی خفگی سے ان کے گلے میں ہاتھ ڈالا۔ "آپ مجھ سے کبھی بھی کچھ بھی کہہ سکتی ہیں۔ ایسے ہی تو نہیں آپ کے لاڈلے کو اس گھر میں رکھنے کا کڑوا گھونٹ بھرا ہے۔ مجھے پتا ہے آپ کی سانسیں رک جائیں گی ان کے بغیر اب جب وہ یہاں آ ہی گیا ہے تو۔" میں نے امی کو دیکھتے ہوئے شرارت سے کہا۔

"بہت بدتمیز ہو تم......" امی کو پھر سے اپنے لاڈلے کی محبت ستانے لگی تھی۔ "وہ کیسے رہے گا یہاں ثانی۔ کیوں کی تم نے ایسی بات؟" امی نے کمزور سے لہجے میں ولید کا دفاع کرنے کی کوشش کی۔

"امی، میری بات سنیں......" میں سنجیدگی سے امی کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبائے عین ان کے سامنے آ کر پنجوں کے بل ٹک گئی تھی۔ "آپ کی محبت اور اس کا خلوص اپنی جگہ۔ لیکن دنیا والے جن میں عشرت مرزا اور شمع مرزا دونوں شامل ہیں کبھی اس عجیب و غریب فلسفے کو تسلیم نہیں کریں گے۔ ایک بار پہلے بھی ہم آپ کو گھر بدر ہوتے دیکھ چکے ہیں۔ میں نہیں چاہتی کل کو شمع بیگم یا ولید کی بیوی آ کر پھر آپ کے ساتھ یہی سلوک کریں۔ لہٰذا اپنے اس ٹوٹے پھوٹے گھر میں پیر جما کر بیٹھیں۔ یہاں کم سے کم ماموں اور نانی کا لنگڑا لولا آسرا تو ہے۔ آپ نے سوچا اپنے جوان جہان بچوں کے ساتھ ایک منہ بولے رشتے کے گھر جا کر آپ کی کیا عزت رہ جائے گی؟ میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ بات منہ سے نکالی تھی امی۔ میں آپ کا دل نہیں دکھانا چاہتی لیکن میں خود کو اور اپنے گھر والوں کو بے مول ہوتے بھی نہیں دیکھ سکتی۔ آپ صبر سے بیٹھیں آپ کے لاڈلے کو اتنی چاہت ہو گی اپنی منہ بولی ماں کی تو سر کے بل چل کر آئے گا۔"

امی ٹھنڈی سانس بھر کر میرا ماتھا چومنے لگی تھیں۔ وہ جانتی تھیں یہ سب حقائق بس منہ سے کہنا نہیں چاہتی تھیں۔ لیکن میں بھی آخر ان کی ہی بیٹی تھی، سمجھدار اور دور اندیش، مجھے مسکرا کر دیکھتے ہوئے ان کے منہ سے نکلا۔

"مجھے پتا ہی نہیں چلا کب میری ثانیہ اتنی بڑی ہو گئی کہ ان سب دنیاوی باتوں اور ان کی باریکیوں کو سمجھنے لگی اور اب ماں کو بھی سمجھائے گی۔"

"آپ میری تعریف کر کے زیادہ مجھے مکھن نہ لگائیں۔ میں جمعے کو پھر بھی آپ کے لاڈلے کے ڈنر پر نہیں جاؤں گی......" میں نے شوخی سے ان کی بات کا جواب دیا۔ "میرا پراجیکٹ ورک رہتا ہے امی اور ڈیڈ لائن بھی قریب ہے مجھے آفس میں لیٹ ہو جائے گا پلیز۔ اور کوئی وجہ نہیں ہے نہ آنے کی۔" امی مجھے دیکھ کر مسکرائی تھیں وہ سمجھ گئی تھیں میں واقعی مصروف ہوں اور کسی اور وجہ سے انہیں نہیں ٹال رہی۔

☆☆☆

میں نے احسن کے کک کو اپنے گھر صبح سے بلا لیا تھا۔ وہ اچھا کک ہونے کے ساتھ ساتھ گھر کے اور کام بھی بڑی خوش اسلوبی سے کر دیتا تھا۔ صفائی ستھرائی تو روز ہوتی ہی تھی۔ لیکن میں چاہتا تھا آج کچھ اسپیشل ہو۔ ثانیہ مما پہلی بار میرے گھر آرہی تھیں۔ تیمور کے ساتھ میرا کانٹریکٹ بھی فائنل ہو گیا تھا بس اب ڈاکومنٹیشن کی رسمی کارروائی کے لیے کل جانا تھا۔ میں نے اپنے فرنشڈ گھر کو رینٹ پر دینے کا سوچ لیا تھا، احسن کی محنت اور مہربانی سے بہت اچھی فیملی بھی مل گئی تھی، جو اگلے ایک ہفتے میں موو آن کرنے کو تیار تھے، کاغذی کارروائی ہو چکی تھی بس اب مجھے بستے باندھنے تھے۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا ثانیہ مما کے گھر جا کر رہنے کا، ثانیہ کی بات ماننے کا تا کہ اسے یہ احساس نہ ہو کہ میں اپنی امارت کا رعب جتا رہا ہوں، میں واقعی ان سب کو اپنی فیملی مانتا تھا لیکن کہتے ہیں نا اجنبی ملک میں اپنی مخلص ثابت کرنے کے لیے آپ گردن بھی کٹا دیں تو بھی لوگ یقین نہیں کرتے، میں گردن کٹانے کو تیار تھا، اس امید پر کہ کبھی تو میری سچائی پر یقین کیا جائے گا۔ میں حقیقتاً آج بہت خوش تھا۔ پاکستان آنے کے بعد سب کچھ اتنا اچھا ہو رہا تھا میرے ساتھ، مجھے لگتا تھا واقعی ثانیہ مما کی دعاؤں کا اثر ہے۔ میں نے سوچا تھا آج ہی انہیں اپنے نئے کانٹریکٹ اور ان کے گھر میں شفٹ ہونے والی دونوں باتوں کا بتاؤں گا۔

"مغرب کی نماز پڑھ کر میں چائے کی پیالی لیے ٹیرس پر نکل آیا تھا، کچھ دیر تازہ ہوا لینے۔ ایک لمحے کو مجھے خیال آیا کیا ہی اچھا ہوتا کہ اگر امی بھی میرے ساتھ اس سب میں شریک ہوتیں۔ پتا نہیں اس وقت وہ کیا کر رہی ہوں گی، کون سی پارٹی کون سے اسپا میں ہوں گی۔ میں کبھی نہیں سمجھ سکا تھا کہ میری سگی ماں بلکہ کسی کی بھی سگی ماں اس کے ساتھ اتنا ان ڈفرنٹ یا غیر جانب دارانہ برتاؤ کیسے رکھ سکتی ہے۔ پاپا کے بعد میں ہمیشہ ایک بورڈنگ سے دوسرے بورڈنگ میں رلتا رہا۔ بڑا ہونے کے بعد یونی ورسٹی کیمپس اور ہوسٹلز میں۔ ہر مہینے ایک تگڑی رقم میرے اکاؤنٹ میں آ جاتی تھی۔ پتا نہیں میرے باپ کی بچپن کی تربیت کا اثر تھا یا کسی کی دعائیں جو میں کسی قسم کے غلط دھندوں میں نہیں پڑا۔

digest library.com

ابھی سب سوچتے میں پتا نہیں کہاں تک جاتا کہ کریم انکل (احسن کا کک) نے آ کر مجھے بتایا کہ گیٹ پر بیل ہوئی ہے۔ میں جلدی جلدی نیچے اتر کر آیا۔ احسن کا ڈرائیور ثانیہ مما اور ان کی فیملی کو لینے گئے تھے، گیٹ کھولا تو باہر ثانیہ مما کی خوب صورت مسکراہٹ والا چہرہ اور حسن کا پرجوش ہیلو۔ سن کر ساری الٹی سیدھی سوچیں میرے ذہن سے نکل گئی تھیں۔ میں نے ثانیہ مما کے پیچھے دیکھنے کی کوشش کی لیکن میری سوچ کے عین مطابق وہ نہیں آئی تھی۔ میرا دل تھوڑا خراب ہوا تھا، مجھے پوری امید تھی کہ وہ ویسے بھی میری شکل دیکھنا کچھ خاص پسند نہیں کرتی اس کے باوجود دل خوش فہم کے گمان۔ میں اس سے اپنے رویے کی معذرت بھی کرنا چاہ رہا تھا، اس دن گاڑی سے اتر کر شاید وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن تیمور کے جرات پر مجھے اتنا غصہ تھا کہ میں اس کی بات سنے بغیر ہی گاڑی آگے بڑھا لے گیا تھا۔ ثانیہ مما شاید میری نظروں کی تلاش کا مفہوم سمجھ گئی تھیں۔

"ثانیہ کے آفس کا کوئی پراجیکٹ چل رہا ہے بیٹا، وہ آج آفس میں دیر تک رکے گی ورنہ ضرور آتی اور محسن کے بھی اوور ٹائم ہی چل رہے ہیں لہٰذا وہ بھی نہ آسکا۔ میں نے ثانیہ سے کہا تھا اگر وہ جلدی فارغ ہو جائے تو گھر جانے کے بجائے سیدھا تمہاری طرف آ جائے۔"

"جی جی بالکل مما، بلکہ میں رحیم انکل کو بول دیتا ہوں وہ اس کے آفس سے پک کر لیں گے اسے اتنی رات میں کیسے آئے گی وہ۔"

میرے منہ سے ہڑبڑاہٹ میں تیز تیز نکلا۔

"ہلکے ہو جائیں ولی بھائی، باجی کا کام ختم ہو گا تو وہ کال کر دیں گی، ٹینشن نہ لیں۔" حسن نے شوخ

مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا تھا۔

اس سے پہلے میں مزید خود کو ایکسپوز کرتا، میں ثانیہ مما اور حسن کو اندر ہال میں لے آیا تھا۔ تھوڑی دیر اندر بیٹھنے کے بعد میں انہیں اپنا گھر دکھانے کے لیے لے گیا تھا، ثانیہ مما تو مستقل ماشاءاللہ پڑھ پڑھ کر پھونک رہی تھیں۔ اور حسن میرے باسکٹ بال کورٹ اور ان ہاؤس جم سے شدید امپریس۔

"یار ولی بھائی، سچ میں ثانیہ باجی ٹانگ نہ اڑاتیں نا میں تو کل ہی آپ کے گھر شفٹ ہو جاتا۔" حسن نے بےچارگی سے منہ بنا کر کہا۔

"ہاہاہا کوئی بات نہیں، میں تمہارے گھر شفٹ ہو رہا ہوں وہاں پر کوئی نہ کوئی سیٹ اپ بنا لیں گے دونوں بھائی، باسکٹ بال اور جم کا۔" میں نے بظاہر سرسری سے لہجے میں کہا لیکن میرا دھیان ثانیہ مما کے تاثرات پر ہی تھا۔

"سچی ولی بھائی۔ آپ رہیں گے ہمارے ساتھ؟" حسن بہت پرجوش ہو گیا تھا۔

ثانیہ مما کے چہرے پر ایک رنگ مسکراہٹ کا اور دوسرا پریشانی کا گزرا تھا۔

"بالکل۔ اگر ثانیہ مما، تمہیں، محسن اور ثانیہ کو اعتراض نہ ہو تو۔" میں نے مسکراتے ہوئے اثبات میں جواب دیا۔

"یوہووو۔ یہ ہوئی نا بات اب آئے گا مزا۔ محسن بھائی اور ثانیہ باجی کے بورنگ جوکس سے جان چھوٹ جائے گی۔" حسن کی چہکار بند ہی نہیں ہو رہی تھی۔

"مما، آپ کو کوئی پریشانی تو نہیں ہو گی نا؟" میں نے ثانیہ مما کے گھٹنوں کے پاس زمین پر بیٹھتے ہوئے ان سے پوچھا۔

"نہیں بیٹا، مجھے کیا پریشانی ہو سکتی ہے۔ لیکن اس چھوٹے سے گھر میں تم کیسے ایڈجسٹ کرو گے۔ کبھی لائٹ نہیں کبھی پانی نہیں۔ ایسے سب مسائل کے ساتھ۔ تم اور ماشاءاللہ تمہارا اتنا بڑا کام۔ سب ملنے ملانے والے تمہارے کہاں اس چھوٹے محلے میں آئیں جائیں گے۔" ثانیہ مما بے ربط انداز میں اپنی پریشانی بتا رہی تھیں۔

"ارے مما۔ میں پہلے بھی آپ لوگوں کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ کوئی چھوٹا بڑا گھر نہیں ہوتا۔ میں ایڈجسٹ ہو جاؤں گا، اور بجلی پانی سب جگہ کے مسئلے ہیں۔ رہے آفس اور میل ملاقاتی تو وہ میرا گھر ہو گا، ملنے والے آفس یا میٹنگ وینیوز میں ملیں گے گھر کیوں آنے لگے۔ آپ ان سب دنیاوی باتوں کو چھوڑ کر بتائیں آپ کو تو کوئی پریشانی نہیں ہو گی نا؟"

"نہیں میرے بچے، میں تو اتنا خوش تھی یہ سن کر ہی کہ اب تم کم سے کم اسی شہر میں ہو گے تو تم سے مل سکوں گی، تم نے تو مجھے سرپرائز ہی کر دیا تھا یہ بات کر کے۔" ثانیہ مما نے میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر گرم جوشی سے دبایا تھا۔

"بس تو ٹھیک ہے۔ مابدولت اگلے ہفتے اپنی شفٹنگ کروا لیں گے۔ احسن کے ہیلپرز مدد کر دیں گے مما، آپ بتا دیجیے گا گھر میں کہاں سامان موو کرانا ہے وہ بھی وہی کریں گے۔ بیکار میں آپ کو اور ثانیہ کو زحمت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے بیٹا، جیسی تمہاری خوشی۔" مما نے مسکرا کر جواب دیا۔

"اب بھرت ملاپ ہو چکا ہو تو ولی بھائی، کھانا بھی کھلا دو۔ قسم سے صبح کا ناشتا کیا ہوا ہے۔ آپ کے ہینڈسم بھائی کی آنتیں قل ھو اللہ پڑھ رہی ہیں۔ صحت خراب ہوئی تو کوئی لڑکی بھی نہیں دے گا مجھے تو۔ آپ کی طرح بینک بیلنس تھوڑی ہے میرا۔" احسن نے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

"صاحب زادے اٹھو سیٹ سے، چلو کچن میں چل کر دیکھیں حالات۔ ٹیبل لگاؤ میں تب تک احسن سے چیک کر لوں اس نے بھی آنا تھا ڈنر پہ۔" میں نے حسن کے کان مروڑتے ہوئے کہا۔

"ایسے یار ولی بھائی۔ وہاں گھر پہ ثانیہ باجی ٹیبل لگواتی رہتی ہیں یہاں آپ۔ بھئی میں جوان جہان لڑکا ہوں کیا آپ لوگوں نے زنانیوں والے

کام میرے ذمے لگا رکھے ہیں۔'' حسن نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

''زنانی کے بچے۔ باہر سب کام خود کرتے رہتے ہیں، چلو عادت ڈال لو۔ یہ کوئی کلاسیفکیشن نہیں ہوتی کہ ٹیبل سیٹ کرنا اور کھانا پکانا صرف عورتوں کا کام ہے۔ اٹھو۔'' میں نے اسے گھسیٹتے ہوئے کہا۔

''مما۔ آپ ایک بار ثانیہ کو فون کرلیں، اگر وہ فری ہوگئی ہو تو میں ڈرائیور بھیج دوں۔''

میں نے اٹک اٹک کر اپنی بات مکمل کی، کہیں ثانیہ مما کو یہ نہ لگے میں ان سے زیادہ ان کی بیٹی میں کیوں دلچسپی دکھا رہا ہوں۔ دل کے چور پکڑے جانے کا خوف چہرے پر آگیا تھا۔ اسمارٹ اور چالاک بزنس مین ولی داوان اپنے الفاظ کے جال میں ہی پھنس رہا تھا۔ ثانیہ مما بیگ سے فون نکال رہی تھیں۔ پیچھے سے حسن کھنکارا۔

''چلیں ولی بھائی، یا ٹیبل بھی ثانیہ باجی سے ہی سیٹ کرواؤ گے۔ اور امی احسن بھائی سے بھی پوچھ لیں وہ بھی فری ہیں تو ولی بھائی دوسری گاڑی انہیں لینے بھی بھجوا دیں گے۔''

حسن کی شوخ آواز اور آنکھوں کی چمک نے مجھے اور نروس کر دیا۔ جھینپ کر میں کمرے سے اس کو ساتھ لیے باہر نکلا تھا۔

''بہت زبان چلنے لگی ہے تمہاری ہاں۔'' میں نے اسے گھور کر دیکھا۔

''جی، جب سے آپ کی آنکھیں اور شاید دل بھی '' کسی پر '' فریز ہوا ہے، ہماری زبان اس کی کمی پورا کرنے کو زیادہ چلنے لگی۔'' اس نے پھٹاک سے جواب دیا۔ میں جز بز ہو کر آگے بڑھا۔

''کیا بات ہے ولی بھائی، شرما رہے ہیں آپ؟'' حسن آج بہت موڈ میں تھا۔

''ارے، میں کیوں شرماؤں گا؟ پتا نہیں کیا بکے جا رہے ہو۔ یہ لو فون ملاؤ احسن کو اور پوچھو کدھر ہے۔'' میں نے پھرتی سے جیب سے موبائل نکال کر اس کے ہاتھ پر دھر دیا۔

معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ حسن نے فون میں احسن کا نمبر سرچ کرنا شروع کیا اور میں پلٹ کر کریم انکل سے کٹلری وغیرہ کا پوچھنے لگا تھا۔ ٹیبل جو لگوانی تھی۔ اتنی دیر میں ڈور بیل ہوئی۔

''چلو۔ احسن آگیا لگتا ہے......'' میں نے حسن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم رکو میں دروازہ کھول کر آتا ہوں۔'' میں اپنا موبائل ٹراوزر کی جیب میں ڈالتا ہوا جلدی جلدی دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔

دروازہ کھولتے ہی میں شاک کی کیفیت میں تھا۔ میرے سامنے احسن کے ساتھ ساتھ امی موجود تھیں۔ اپنے اسی کروفر کے ساتھ جیسا میں انہیں چھوڑ کر آیا تھا ساتھ ہی بڑے بڑے دو سوٹ کیس۔ جنہیں دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا۔

''امی۔ آپ۔ اس وقت ایسے۔ بغیر بتائے۔''

''کیوں مجھے اپنے بیٹے کے گھر آنے کے لیے کسی کی اجازت لینی پڑے گی اب کیا!'' امی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''نہیں ایسی بات نہیں ہے لیکن اگر میں گھر پر نہ ہوتا تو آپ کو دقت ہوتی۔''

''تو میں احسن کی طرف یا کسی ہوٹل میں رات گزار لیتی، اتنی بھی گئی گزری نہیں ہے تمہاری ماں......'' ان کی طمانیت کا عالم قابل دید تھا۔ ''وہ تو اچھا ہوا کہ میں بالکل عین وقت پر احسن کے گھر پہنچی جب یہ تمہاری طرف آنے کے لیے ہی نکل رہا تھا۔''

میں نے گہری سانس بھر کر احسن کو دیکھا۔ پتا نہیں کیوں مجھے وہ ناداں دوست لگنے لگا تھا۔ اس کے چہرے پر بے چارگی تھی لیکن مجھے شدید غصہ آرہا تھا۔ یہ پتا ہونے کے باوجود کہ آج ثانیہ مما ڈنر پر انوائٹڈ ہیں وہ امی کو لیے منہ اٹھائے یہاں کیسے آسکتا تھا؟ کوئی بہانا کر دیتا، کچھ بھی۔ لیکن اب کچھ ہو نہیں سکتا تھا۔ مجھے اس صورت حال سے نمٹنا تھا۔ میں نے امی کے بیگز اٹھا کر اندر رکھے اور انہیں اندر آنے کا کہا۔ احسن میری روڈنس بھانپ گیا تھا اس

لیے خاموشی سے اندر چلا آیا۔

"اصل میں آج ایک پرسنل ڈنر تھا میرا گھر پہ۔ میں ایکسپیکٹ نہیں کر رہا تھا کہ آپ آجائیں گی۔" میں نے نظریں نیچی رکھ کر بات جاری رکھی۔

"ارے تو بیٹا، جاؤ اپنے مہمانوں کو اٹینڈ کرو۔ میں تو ویسے بھی کسی سے ملنے کے موڈ میں نہیں ہوں اتنا تھک گئی ہوں فریش ہو کر سوؤں گی مجھے بس کوئی کمرا دکھا دو۔ کل صبح اٹھ کر دونوں ماں بیٹا ڈھیر ساری باتیں کریں گے۔ مجھے ویسے ہی تم سے کچھ ڈسکس کرنا تھا۔" امی نے میرا گال تھپتھپاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

digest library.com

"رحیم چاچا۔ رحیم چاچا۔" میں نے زوردار آواز میں رحیم چاچا کو بلایا وہ بیچارے دوڑے چلے آئے ایک ہی آواز میں۔

"امی کا سامان گیسٹ روم میں رکھ دیں اور کھانا انہیں۔ وہیں پہنچا دیجیے گا۔"

اس سے پہلے کہ امی وہاں سے اندر جاتیں۔ اندر سے ثانیہ مما انہیں ڈھونڈتی ہوئی باہر آچکی تھیں۔

"ولی بیٹا، میں نے ٹیبل لگوا دی ہے احسن آ۔"

سر پر دوپٹا ٹھیک کرتے ہوئے ان کی نظر دیر سے امی پر پڑی تھی۔ برسوں پرانی ناخوش گوار یادیں ان کے دل و دماغ میں روشن ہو گئی ہوں گی۔ او خدایا میں نے انہیں کس مصیبت میں ڈال دیا تھا۔ امی کے جذبات سے بے خبر میں ثانیہ مما کے پیلے پڑتے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

"بس ہم آ رہے ہیں ثانیہ مما، احسن تم انہیں لے کر اندر جاؤ میں بس آیا۔" میں نے سرعت سے سچویشن ہینڈل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن آل ریڈی دیر ہو چکی تھی۔

"بھئی واہ۔ تو یہاں یہ موجیں چل رہی ہیں۔"

امی کی طنزیہ آواز آنے والے طوفان کا پیش خیمہ تھی۔

"امی، آپ اندر جائیں رحیم چاچا کے ساتھ۔" میں نے حتی الامکان آواز دھیمی رکھی۔

"ارے کیسے اندر چلی جاؤں۔ میرے بیٹے کے گھر میں اس کی کمائی پر اپرے غیرے لوگ موجیں اڑائیں اور میں اندر جا کر بیٹھوں۔ یہ تھے تمہارے پرسنل مہمان جن کے لیے تمہیں ماں کا آنا اتنا کھل رہا تھا۔" امی کی تلخ زبانی ان کے ظاہری حلیے سے کسی طرح میل نہیں کھا رہی تھی۔ سارا ادب آداب وہ سائڈ پر رکھ کر بھول گئی تھیں۔

"ولی بیٹا، میرے خیال سے ہمیں اب چلنا چاہیے بہت رات ہو گئی ہے، اس وقت مناسب نہیں لگ رہا کھانے کے لیے رُکنا۔" ثانیہ مما نے پہلی بار اس سب کے بیچ میں کچھ بولا تھا۔

"بڑی جلدی خیال آ گیا تمہیں جانے کا ثانیہ بیگم۔ تمہیں یہاں آنا ہی نہیں چاہیے تھا لیکن بھئی بہت ہی ڈھیٹ خاندان ہے عشرت مرزا کا کتنا ذلیل کر لو۔"

"امی بس!" میرے صبر کی انتہا ہو گئی تھی۔

ثانیہ مما کی آنکھیں گیلی ہونا شروع ہو گئی تھیں۔

اور امی نے تو کبھی کسی کا لحاظ نہیں کیا تھا پھر یہ تو ثانیہ مما تھیں۔

"آپ کو میرے مہمانوں کی تذلیل کا کوئی حق نہیں ہے۔ یہ میری دعوت پر یہاں آئی ہیں اور معذرت کے ساتھ اس وقت آپ بن بلائی مہمان ہیں۔" میں نے خود کو پرسکون رکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن ولی......" امی نے بولنا چاہا۔

"لیکن ویکن کچھ نہیں امی۔ مجھے میرے گھر اور یہاں کام کرنے والوں کو بلا وجہ شور شرابے اور بدتمیزی کی عادت نہیں ہے۔ مہربانی ہو گی آپ اوپر جا کر آرام کریں ہم کل بات کریں گے۔"

"چلیں ثانیہ مما۔"

"لیکن ولی۔" ان کی آواز لرز رہی تھی۔

"ارے آپ آئیں تو۔"

مجھے اس وقت سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں اپنی ماں کو کیسے سمجھاؤں لیکن وہ زیادتی جو وہ پچھلے کئی سالوں سے عشرت مرزا کے ساتھ پہلے ثانیہ مما اور پھر ان کی اولادوں کے ساتھ کرتی رہی تھیں میں اسے دوبارہ

نہیں دہرانے دے سکتا تھا۔
"میں اندر نہیں جاؤں گی ولید......" پیچھے سے امی کی چیختی ہوئی آواز پھر سنائی دی۔ "تم رہو اپنی دنیا میں مگن۔ میں کسی ہوٹل جا کر رہ لوں گی لیکن اس عورت کے ساتھ ایک چھت کے نیچے ایک لمحہ نہیں رکوں گی۔"
"آپ کی مرضی۔ احسن کا ڈرائیور آپ کو کسی سیف ہوٹل تک چھوڑ آئے گا۔"
اس سے زیادہ منطقی انجام میں نہیں دے سکتا تھا ان حالات کو جو احسن کی مہربانی پیدا ہو چکے تھے۔
"میں آنٹی کے ساتھ خود جاتا ہوں۔" احسن نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس وقت حقیقتاً میں احسن کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔
ثانیہ مما کو لیے میں اندر آیا تو ان کی حالت بہت ابتر تھی۔ وہ بہت ڈر گئی تھیں۔ حسن اس تمام شور شرابے میں سائڈ پر خاموشی سے کھڑا تماشا دیکھ رہا تھا۔ ثانیہ مما کو اندر آتا دیکھ کر انہیں سہارا دے کر اندر لے آیا۔
"بیٹے، میں گھر جانا چاہتی ہوں۔" ثانیہ مما نے پانی پینے کے چند منٹوں بعد مجھ سے کہا۔
"مما، آپ کو کھانا کھائے بغیر نہیں جانے دوں گا میں۔ آپ بھول جائیں یہاں کچھ ہوا تھا۔ آئی ریئلی ریئلی سوری مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا۔"
"ارے بیٹا، اس کی کوئی ضرورت نہیں تمہیں۔ شمع کو ایسے جواب نہیں دینا چاہیے تھا وہ ماں ہیں تمہاری۔"
"مما۔ میں وہ سب بعد میں ڈیل کر لوں گا۔ ماں ہیں اس لیے جانتا ہوں کس طرح اور کب ڈیل کرنا ہے انہیں۔ آپ سب چھوڑیں چلیں کھانا کھانے چلتے ہیں سب ٹھنڈا ہو گیا ہو گا۔"
"شکر ہے ثانیہ باجی نہیں آئی تھیں ورنہ تو گھمسان کا رن پڑا ہوتا یہاں۔"
باہر جاتے ہوئے حسن کی شوخ آواز نے میرے اور ثانیہ مما کے چہرے پر مسکان بکھیر دی۔
واقعی بچت ہو گئی۔ اللہ کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے۔ ورنہ آج تو میں واقعی گیا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں شکرانہ پڑھا۔ امی کو ہینڈل کر سکتا ہوں ایک بیٹے کی حیثیت سے۔ جھانسی کی رانی کا کیا کرتا۔ میں نے گہری سانس بھری اور ٹیبل پر جا کر بیٹھ گیا۔

☆☆☆

گھر والے واقعے کو ہوئے تین روز ہو چکے تھے۔
معاملات انڈر کنٹرول لگ رہے تھے۔ امی سے میں نے دوبارہ بات نہیں کی تھی البتہ احسن ان کی خیر خبر رکھ رہا تھا، وہ ہوٹل میں ہی مقیم تھیں۔ میں انہیں دانستہ چھیڑنا نہیں چاہ رہا تھا۔ ایک چیز کی پریشانی البتہ مجھے ضرور لاحق تھی۔ امی مجھ سے کیا بات کرنا چاہ رہی تھیں؟ کہیں ان کی طبیعت وغیرہ تو خراب نہیں خدانا خواستہ۔ کوئی سنجیدہ یا زیادہ بڑی بات جو بظاہر نہ دکھ رہی ہو؟ میں دل میں ان کی صحت کے لیے دعا ہی کر سکتا تھا اور اپنے واہموں کا علاج میرے بس میں نا تھا۔
میری پیکنگ کا کام شروع تھا۔ میں بہت زیادہ سامان نہیں لے کر جانا چاہتا تھا صرف بنیادی چیزیں فی الحال کے لیے۔ ایک بار ایڈجسٹ تو ہو جاؤں۔

☆☆☆

امی اور حسن، ولی کے گھر سے واپس آتے کے بعد بہت خاموش تھے۔ خاص کر امی۔ میں نے حسن سے بہت اگلوانے کی کوشش کی لیکن وہ بھی ایک میسنا آدمی۔ مجال ہے جو ایک لفظ پھوٹ دے اور والدہ محترمہ سے کچھ پوچھنا گنجے کے سر پر کنگھی کرنے کے مترادف ہی ہوتا۔ یہ منحوس خبر البتہ مجھے دے دی گئی تھی کہ محترم اگلے ایک ہفتے میں قدم رنجہ ہونے لگے ہیں گھر میں مستقلاً۔ اسی سلسلے میں نیچے والے کمرے کی صفائی کرانے آئی تھی میں گھر میں کام کرنے والی آنٹی کے ساتھ، میں تھوڑا حیران بھی ہوئی تھی کہ وہ مان کیسے گیا۔ سچ بات تو یہ ہے کہ شخص امی اور بھائیوں تو کسی بھی قسم کے طعنوں تشنوں سے بچانے اور کچھ اپنے غصے اور ضد میں آ کر میں نے یہ آپشن دے دیا تھا مجھے امید نہیں تھی کہ ولی نامی جونک اس سستے آپشن کو بھی کیش کرا لے گا۔ مطلب حد ہے بھئی پرائی ماں

یہ ایسی بھی کیا محبت۔ ویسے سوچنے کی بات ہے۔ جو شخص ماں کی محبت میں اتنا سب کچھ کر رہا ہے۔ وہ اپنی محبت کی خاطر کیا کیا کر سکتا ہے؟

لیکن یہ میں کیوں سوچ رہی ہوں؟ مائی گاڈ زیادہ فراغت دماغ کو شیطان کا گھر بنا دیتی ہے۔ میں نے اپنے سر پر ہاتھ مارا اور کمرے کا آخری بار جائزہ لینے لگی جو صاف ستھرا اور غیر ضروری سامان سے خالی ہو کر کافی ہوادار اور روشن لگ رہا تھا۔

ہم لوگ رات کا کھانا کھا کر چائے پی رہے تھے۔ آج کافی دن بعد ہم تینوں بہن بھائی اور امی ساتھ گھر میں موجود تھے۔ حسن کی چلبلی باتیں اور محسن بھائی کی دھیمی مسکراہٹ ایک تواتر سے آگے پیچھے چل رہے تھے۔ موقع غنیمت جان میں جلدی سے کیرم بورڈ نکال لائی تھی۔ کل میرا آف تھا اور محسن بھائی کو بھی بی شفٹ میں جانا تھا لہٰذا رات کو لیٹ جاگنے اور ہلا مچانے کا فل موڈ آن تھا گیٹ پر بیل ہوئی تھی حسن بجلی کی تیزی سے گیٹ کھولنے گیا تھا۔

”اسے کیا ہوا؟“ محسن بھائی حیرت سے بولے، پہلی بار بغیر کہے خود سے دروازہ کھولنے گیا ہے۔

”اس کی کوئی خفیہ گرل فرینڈ آئی ہوگی۔“ میں نے ہنس کر جواب دیا۔

”تانیہ۔ بی ہیو! یہ کون سی لینگویج ہے۔“ امی کی تنبیہی نظریں میرے اوپر تھیں۔

”اوپس۔ سوری امی۔“ میں نے جلدی سے ہتھیار ڈالے۔ ہمارے سو کالڈ ماڈرن گھر میں اب بھی ایسی بیہودہ باتوں کا کوئی رواج نہیں تھا خاص کر امی کے سامنے۔ مجھے کبھی کبھی لگتا تھا کہ اگر امی نے آج کل کے اسکول کالج اٹینڈ کر لیے تو شاید ہارٹ اٹیک سے ہی چل بسیں گی۔ میری فضول سوچ کا گلا اسی وقت گھٹ گیا جب محترم ولید صاحب ہمارے چھوٹے فتنے بھائی کے ساتھ کشاں کشاں کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ ولید کو ہمارے بھائی پہلے ہی انوائٹ کر چکے تھے۔ گویا اب اپنے گھر میں انسان انجوائے بھی نہ کرے۔

”یہ کیا آج سے شفٹ ہو گئے ہیں؟ انہیں اگلے ہفتے نہیں آنا تھا۔“ میں نے بدلحاظی سے حسن سے پوچھا۔

”باجی۔ کیا ہو گیا ہے؟“ حسن نے آنکھیں دکھائیں۔

ولید نے ایک نگاہ غلط مجھ پر ڈالی اور بغیر کوئی جواب دیے امی اور محسن بھائی سے ملنے لگا۔ محسن بھائی کے رویے میں کوئی ہچکچاہٹ مجھے نظر نہ آئی وہ کافی خوش اخلاقی سے اس سے ملے تھے۔

چل بھئی تانیہ، جب اس مصیبت کو گھر پر ہی رہنا ہے تو اپنا خون جلانے کا کیا فائدہ۔ ایڈجسٹ ہونے کی کوشش کرتے ہیں اب تو ہر عید شب برات پر یہ سر پر سوار ہی ہوگا تو کیا تو سانس لینا چھوڑ دے گی۔ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر حسن کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میری باری تھی۔ جب حسن صاحب اپنے پیارے ولی بھائی کا گیٹ کھولنے بھاگ گئے تھے۔

”حسن، یہ آئس کریم پلیز فریزر میں رکھ دو گے۔ میں راستے سے گزر رہا تو سوچا لیتا چلوں۔“ ولی نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا بڑا سا شاپر حسن کو تھمایا۔

”ارے واہ! اتنی ساری آئسکریم۔ پانچ لیٹر آئس کریم کا ڈبا دیکھ کر حسن کیا ہم تینوں بہن بھائی میں سے کوئی بھی باقیوں کو عاق کر دے۔“ کون سا فلیور ہے ولی بھائی۔ مجھے چاکلیٹ، چوکو چپس یا چوکو منٹ کچھ بھی چاکلیٹ میں ہو وہ پسند ہے۔ امید ہے آپ وہی لائے ہوں گے۔“ حسن ندیدوں کی طرح ڈبا کھولنے لگا تھا۔

”کرنچ ہے۔“ ولی نے مسکرا کر کہا۔

”کرنچ۔ ولی بھائی ہاؤ بورنگ۔ کرنچ کون کھاتا ہے آج کل کے زمانے میں سوائے تانیہ باجی کے، اولڈ اسکول۔“ میں نے گھور کر حسن کو دیکھا۔

”اسی لیے تو لایا ہوں۔“

مجھے لگا زیر لب ولید نے کہا تھا۔

”جی کچھ کہا آپ نے!“ میں پلٹ کر اسے دیکھا۔

”نا۔ ہاں میرا مطلب میں کہہ رہا تھا فریج میں رکھ دیں تھوڑا پگھل گئی ہے آن داوے۔“

"یہ کیا ہکلے پن کی بیماری ہے آپ کو؟ جب بات کرو اسٹیئر کرتے ہیں۔" میں نے بھی پوچھ ہی لیا۔ پہلے ہمارے گھر ڈنر پر، پھر حلیمہ کی پارٹی پر اب یہاں۔ عجیب بات تھی۔

"ہاہاہا۔ باجی تم اتنا خطرناک طریقے سے انٹرویو لیتی ہو، ولی بھائی بے چارے ڈر جاتے ہیں جواب دیتے میں۔" حسن کا بے ہودہ جواب پھر آیا۔

ولید کا چہرہ لال ہو گیا تھا، محسن بھائی نے اخبار کے پیچھے اپنا منہ چھپا لیا تھا ہنسی چھپانے کے لیے۔ امی ویسے ہی ولید کے آنے پر مسکرا رہی تھیں۔

"حسن، بہتر ہو گا کہ آئس کریم فریج میں رکھ دو اور واپس آ کر گیم کنٹینیو کر لو اگر تمہارے دو روپے والے جوکس کا اسٹاک ختم ہو گیا ہو تو۔" میں نے تڑخ کر جواب دیا۔

"دیکھو ایسے بات کرو گی تو لوگ تو ہکلائیں گے نا۔" حسن جواب دیتے ہی باہر بھاگا۔ میں اپنی چپل اتار کر ہاتھ میں لے چکی تھی۔

"بیٹا۔ تم ان لوگوں کی باتوں کا برا نہ منانا روز کا تماشا ہوتا ہے ان دونوں کا۔" امی اپنے چہیتے کو بتا رہی تھیں۔

"نہیں مما۔" ان سب کے لیے تو میں نے اتنا "خطرہ" مول لیا یہاں آ کر رہنے کا برا کیا منانا۔" ولید صاحب کی شوخیاں باہر آتی جا رہی تھیں۔

محسن بھائی اپنا قہقہہ نہیں روک سکے تھے۔ میں جان بوجھ کر بھی نظر انداز کر گئی۔

ابھی حسن واپس آ کر بیٹھا ہی تھا کہ دوبارہ بیل ہوئی......

"لو اب کون آ گیا؟" حسن نے کوفت سے کہا۔ "باجی، تم جا کر دیکھ لو بھئی، اب میں نہیں جا رہا گیٹ کھولنے، رات کے اس پہر بھی لوگوں کو چین نہیں ہے۔"

"ہاں اب کون سا تمہارا کوئی دلبر جانی گیٹ پر ہو گا جو خود جاؤ گے۔ بہن کو ہی بھیجنا رات کے اس پہر اکیلا گیٹ کھولنے۔"

"او میری ماں، گھر کا دروازہ ہے، کوئی سیاچن کا محاذ نہیں ہے خدا کا خوف کرو ایسے کہہ رہی ہو جیسے جنگ پہ بھیج رہا ہوں۔ بیٹھی رہو جاتا ہوں میں ہی۔"

محسن بھائی ولید کے ساتھ باتوں میں لگ گئے تھے۔ یہ ان دونوں کی پہلی باضابطہ ملاقات تھی۔ امی صوفے پر بیٹھی تسبیحات کر رہی تھیں۔ چند منٹ بعد حسن کی عجیب سی آواز سنائی دی۔

"امی۔ آپ سے کوئی ملنے آیا ہے باہر لان میں۔"

"اس وقت، اللہ خیر۔" امی اٹھی تھیں باہر گیٹ پر جانے کے لیے۔ "کوئی جاننے والا ہے کیا؟ لان میں کیوں بٹھایا اندر لے آتے۔" حسن خاموشی سے ان کے پیچھے نکلا۔

"کون ہے حسن کے بچے۔" میں نے پیچھے سے جا کر پوچھا۔

"آپ خود ہی دیکھ لیں۔"

حسن کی آواز میں کچھ تو عجیب ضرور تھا اور سامنے لان میں نظر پڑتے ہی میرے قدم گویا فریز ہو گئے تھے۔ میری زندگی کی سب سے بڑی لیکن سب سے کڑوی حقیقت ہماری آنکھوں کے سامنے تھی۔ مضمحل، جھکے ہوئے کاندھوں کے ساتھ عشرت مرزا ہمارے گھر کے صحن میں رات کے اس پہر موجود کیا کر رہے تھے۔؟

☆☆☆

امی ہم تینوں کے ساتھ خاموش لان میں کرسیاں ڈالے بیٹھی تھیں۔ ماموں اپنے گھر سے آ گئے تھے محسن بھائی کے بلانے پر اور ہمارے ساتھ ہی بیٹھے تھے۔ نانی شکر ہے کہ نیند کی گولیاں کھا کر سو رہی تھیں ورنہ نجانے کیا حشر برپا کرتیں۔ ولید کو ہم اندر باسم کی کمپنی میں چھوڑ آئے تھے اور شاید یہ بہت ہی اچھا ہوا کیونکہ جو کہانی عشرت مرزا سنا رہے تھے وہ سن کر ولید پر نجانے کیا گزرنے والی تھی اور اس کے تھوڑی دیر پہلے کے موڈ سے ایسا لگ تو نہیں رہا تھا کہ اسے اس سب کا علم ہے۔

عشرت مرزا نے اپنی سو کالڈ دکھ بھری کہانی امی کے سامنے رکھ کر درخواست کی تھی کہ وہ "واپس" آنا چاہتے ہیں۔ اپنی "فیملی" کے ساتھ۔ اور یہ کہ امی اور ہم انہیں معاف کر دیں۔ ان کی دوسری بیوی انہیں کسی تیسرے شوہر کے لیے چھوڑ کر جا رہی تھیں۔

مجھے تو اس ساری بکواس کا مطلب ہی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کون سی فیملی اور واپس آنے کا مطلب۔ امی نے ایک لفظ بھی ادا نہیں کیا تھا۔ میرا خون کھول رہا تھا ماموں بھی امی کی طرح خاموشی سے سن رہے تھے۔

کیا کہتے، بلکہ ہم میں سے کوئی بھی کیا کہتا اس سب پر۔ چند لمحے کی خاموشی کے بعد ماموں گویا ہوئے۔

"عشرت صاحب، رات کافی ہو گئی ہے۔ آپ کی آمد کا شکریہ میرے خیال سے اب آپ کو چلنا چاہیے۔"

"لیکن میں جواب لیے بغیر نہیں جاؤں گا۔"

عشرت مرزا کی خودغرضی آج بھی جوں کی توں تھی۔

ماموں کی نظریں امی کی طرف اٹھی تھیں۔

انہوں نے امی کے سر پر ہاتھ رکھا۔ امی نے ایک نظر ہم تینوں پر ڈالی جیسے پوچھ رہی ہوں کیا میں تم پر بھروسا کر سکتی ہوں۔ تمہاری بنیاد پر بول سکتی ہوں۔

اور شاید اولاد کی نظروں میں موجود کانفیڈنس دیکھنے کے بعد انہوں نے بات شروع کی۔

"میرا نہیں خیال کہ اس سوال کا کوئی بھی جواب دینا میرے یا میرے بچوں کے لیے ممکن ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ آپ کے ساتھ یہ سب ہوا۔ لیکن افسوس سے زیادہ ہم آپ کے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ رہا بچوں کا سوال تو یہ ماشاءاللہ بالغ ہیں پڑھے لکھے ہیں اچھا برا سمجھتے ہیں۔ ایک باپ کی حیثیت سے یہ آپ سے ملتے رہیں گے، آپ کی عزت ان پر فرض ہے، اور میری تربیت کا حصہ بھی۔ مجھے امید ہے یہ مجھے مایوس نہیں کریں گے۔ اس سے آگے کچھ بھی کہنا یا کرنا ہمارے بس سے باہر ہے۔ آپ جہاں سے آئے ہیں ہم سب کے لیے بہتر ہوگا وہیں لوٹ جائیں۔"

واؤ۔ آئی واز امپریسڈ۔ امی نے اتنا اچھا اور جامع جواب دیا تھا اور اس کے بعد اندر کی راہ لی۔

میں ان کے پیچھے پیچھے لپکی۔ پلٹ کر آواز لگانا نہیں بھولی تھی حسن کو کہ "مہمان" کے جانے کے بعد گیٹ بند کر لے۔ مجھے تو خود پہ حیرت ہو رہی تھی اتنے سالوں بعد سگے باپ کو دیکھ کر کوئی جذبات نہیں بیدار ہوئے۔ کوئی سر پہ ہاتھ رکھ دے بابا گلے لگانے والی فیلنگز۔ نو تھنگ۔ ایک طرح سے خوشی بھی تھی اپنے کمپوزڈ رہنے کی اور عجیب بھی لگ رہا تھا۔

"تانیہ......" امی نے ہلکی آواز میں اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"آپ ٹھیک ہیں؟" مجھے تشویش ہوئی تھی۔

"میں ٹھیک ہوں۔ ولی کو کچھ نہ بتانا تمہارے ابا نے جو باتیں کی ہیں اس بارے میں۔"

"امی۔ وہ تو اسے ویسے بھی پتا چلنا ہی ہے ہمارے بتانے نا بتانے سے کیا فرق پڑے گا۔" میں نے کہا تھا۔

"بیٹا۔ یہ اس کا پرسنل معاملہ ہے اس کی ماں کے ساتھ، ہمیں بیچ میں نہیں بولنا چاہیے۔" امی کی بات لوجیکل تھی میں خاموش ہو گئی تھی۔

اندر داخل ہونے سے پہلے میں نے پلٹ کر دیکھا تھا لان میں حسن اور محسن بھائی کرسیوں پر ہی بیٹھے تھے۔ ماموں گیٹ بند کر کے اندر کی طرف آ رہے تھے۔

digest-library.com

☆☆☆

میں عشرت مرزا کو اس وقت ثانیہ مما کے گھر کے لان میں دیکھ کر اتنا ہی شاکڈ رہ گیا تھا جتنا شاید امی کو میرے گھر دیکھ کر ثانیہ مما۔ اب مجھے الجھن ہو رہی تھی کہ امی کس لیے واپس آئی تھیں۔ مجھے انہیں لائٹلی نہیں لینا چاہیے تھا۔ ایسا کیا ہوا ہے کہ پچھلے پندرہ سالوں میں پاکستان کی شکل نہ دیکھنے والے دونوں لوگ یکا یک ہی واپس آ گئے وہ بھی محض چار دن کے وقفے سے؟ اور امی نے عشرت انکل کو اکیلے آنے کیسے دیا یہاں۔

ثانیہ مما اور تانیہ دونوں کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ میں سوچ رہا تھا ان سے پوچھوں کہ معاملہ کیا ہے پھر۔ مجھے لگا اٹس ٹو پرسنل اور میں تانیہ کے ہاتھوں مزید ذلیل ہونے کے موڈ میں نہیں تھا۔

اسے اپر ہینڈ دینا میری مجبوری نہیں خواہش تھی لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نا تھا کہ میں نے اپنا ضمیر اصطبل میں گھوڑوں کے ساتھ سلا دیا ہو۔ میں اسی کشمکش میں تھا کہ ثانیہ مما نے مجھے بیٹھنے کا کہا۔

"بیٹھو ولی بیٹا۔ بس جیسے تمہاری ماما اس دن آئی تھیں ایسے ہی ان کے ابو بھی آج ملنے آ گئے بچوں سے۔" پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ثانیہ مما نے بات بنانے کی کوشش کی تھی۔

ثانیہ کی آنکھوں میں میرے لیے عجب ترحم بھرے جذبات تھے میں بہت کنفیوز ہو گیا تھا۔

"کچھ پریشانی کی بات تو نہیں ہے نا ماما؟" میں نے پھر بھی پوچھا۔

"ارے نہیں بیٹا۔ بالکل نہیں۔ تم بیٹھو۔ ثانیہ جاؤ سب کے لیے چائے بنا لاؤ۔"

حسن اور محسن سنجیدہ چہروں کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔ ان کے ماموں بھی ساتھ تھے جن کا بیٹا باسم پچھلے آدھے گھنٹے میں میرا سر کھا چکا تھا۔ ماموں بھی ثانیہ مما کی طرح بہت اچھے سے ملے۔ اور ثانیہ مما کو بعد میں بات کرنے کا کہتے ہوئے نکل گئے۔

کمرے میں عجیب طرح کی خاموشی تھی۔ جسے حسب عادت حسن نے ہی توڑا۔ چائے آ چکی تھی اور ساتھ ہی ثانیہ آئس کریم بھی ساتھ لے آئی تھی۔ حسن نے حسب معمول اس کی کلاس لینا شروع کی تھی۔ مجھے زیادہ اچنبھا نہیں ہوا اس لڑکی کا دماغ ویسے بھی خراب ہی لگتا تھا مجھے۔ سیدھی حرکت کی توقع رکھی ہی نہیں میں نے کبھی۔ بہر حال میری لائی ہوئی آئسکریم کو میرے سامنے عزت بخشی جا رہی تھی اتنا ہی بہت تھا۔

ٹائم کیسے گزرا پتا ہی نہیں چلا۔ ایک کے بعد ایک کیرم کے میچ اور حسن اور ثانیہ کی نیور اینڈنگ نوک جھوک نے مجھے بھی بھلا دیا کہ ابھی کچھ دیر پہلے کیا ہوا تھا۔ بارہ بجنے کو تھے مجھے صبح آفس بھی جانا تھا۔ میں نے سب کو خدا حافظ کہا اور باہر نکلنے لگا تھا۔ ثانیہ میرے پیچھے پیچھے گیٹ لاک کرنے آئی تھی۔

"ولید...... بھائی سنیں۔"

"ہیں۔" میں حیران ہو کر پلٹا آج سورج نکلا بھی تو پاتال سے۔ زندگی میں پہلی بار نام سے بلایا وہ بھی بھائی کے صیغے کے ساتھ۔

"جی بولیں۔"

"امی بتا رہی تھیں کہ آپ کی مما پاکستان آئی ہوئی ہیں۔" سوالیہ نظریں میرے چہرے پر تھیں۔

"جی۔ جی بالکل۔ تو؟"

"تو یہ کہ آپ اپنی والدہ کو بتا دیجیے گا کہ آپ یہاں رہائش کا ارادہ رکھتے ہیں۔ میں نہیں چاہتی بعد میں امی یا ہمارے لیے کوئی پرابلم کھڑی ہو۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا؟"

الفاظ کڑوے تھے لیکن لہجہ اس بار بہت مختلف تھا۔ میں کچھ دیر کو حیران ہوا لیکن میں اچھی طرح سمجھتا تھا کہ وہ کس خوف کے زیر اثر یہ بات کر رہی ہے۔

"آپ پریشان نہ ہوں۔ میں سب کچھ سورٹ آؤٹ کر کے ہی آؤں گا ثانیہ مما یا آپ لوگوں کو کوئی پرابلم نہیں ہو گی۔" میں نے جواب دیا تھا۔

"بہتر ہو گا کل ہی بل کر بات کر لیں آپ ان سے۔"

کل پر اتنا زور کیوں ہے بھئی کر لوں گا بات میں۔ مجھے چڑ ہو رہی تھی لیکن میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اللہ حافظ۔"

پھر وہی سوفٹ ٹون۔ میں ٹھٹک کر مڑا تھا۔ کچھ تو گڑبڑ ہے یہ جھانسی کی رانی اور اتنی مہربان۔ میں حیرت کے سمندر میں غوطے کھاتا ہوا سا ہلا کر باہر نکل گیا تھا۔

☆☆☆

مجھے زندگی میں پہلی بار ولید وادان سے ہمدردی ہو رہی تھی۔ اس کے ساتھ کیا ہونے والا تھا اس پر افسوس بھی۔ یہاں وہ بظاہر اپنے کام اور کامیابی کی خوشیاں منا رہا تھا اور پرائے گھروں میں فیملی ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا اور وہاں اس کی سگی ماں اس کے سوکالڈ گھر کو بکھیر کر جا رہی تھیں۔ پہلی بار مجھے لگا صرف میں ہی رشتوں کے معاملے میں ادھوری نہیں ہوں۔ ولید وادان بھی اتنا ہی ادھورا، نامکمل اور ترسا ہوا ہے۔ مجھے تو شاید ماں

اور بھائیوں کی مکمل محبت مل گئی۔ اسے تو باپ کے مرنے کے بعد نہ باپ کا سایہ ملا نہ ماں کی محبت۔ میں تو ویسے ہی رشتوں کی ریس میں فرسٹ آچکی تھی اور وہ بیچارہ لوزر۔ آج عشرت مرزا کے آنے کے بعد مجھے شدت سے احساس ہوا کہ میرے پاس میری ماں ہے، مضبوط گھر کی بنیاد ہے تو مجھے اپنے باپ کی اس حرکت سے کوئی ایسا خاص فرق نہیں پڑا لیکن ولید کیا کرے گا۔ اس کا کیا ہو گا؟ ان سوالات کے جواب میرے پاس نہیں تھے لیکن جانے انجانے میں دل کے کسی کونے میں ولید کے لیے جو نفرت کا بازار گرم تھا اب وہاں ہمدردی نے کچھ جگہ لے لی تھی۔

میں نے جاتے جاتے اسی لیے بات گھما پھرا کر یہ اسے باور کرا دیا تھا کہ اپنی والدہ سے جلد ملاقات کر لے۔ بلی نے تھیلے سے باہر تو آنا تھا۔ آج یا کل۔

☆☆☆

میں دوسرے ہی دن صبح ہی صبح احسن سے پوچھ کر مما کے ہوٹل پر موجود تھا۔ میرا ارادہ تھا ان کے ساتھ ناشتا کر کے کام پر جاؤں گا۔ انہیں میری سکسیس اسٹوریز سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا لیکن بہرحال بتانا میرا فرض تھا۔ کل عشرت انکل کو ثانیہ مما کے گھر دیکھ کر میرے والے مزید سوا ہو گئے تھے۔ مما کو میں نے کال ملائی انہوں نے فون نہیں اٹھایا تھا۔ کہیں سو نہ رہی ہوں، میں نے ہوٹل ریسپشن سے روم میں ڈائل کرنے کا کہا تو پتا چلا مما ہوٹل جم میں ہیں۔ میں ویٹ کر لوں۔ میں گہری سانس بھر کر جم ڈھونڈ کر اس کے باہر لاؤنج میں اپنا لیپ ٹاپ لے کر۔ بیٹھ گیا تھا۔ مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا، مما کو باہر آتے دیکھا تو میں جلدی سے ان کے پاس پہنچا۔ ان کی شکل پر مجھے دیکھ کر کوئی خوشی کے آثار نہیں تھے۔ ایز ایکسپیکٹڈ۔ میں نے جلدی سے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔ وقت مل گیا تمہیں ماں سے ملنے کا؟"

"مما، آئی ایم رئیلی رئیلی سوری۔ میری روٹین بہت ٹف چل رہی ہے، آپ جلدی سے فریش ہو لیں۔ میں ناشتے پر سب بتاتا ہوں۔"

"حیرت ہے۔ میرے بیٹے کی روٹین صرف اپنی ماں کے لیے ہی ٹف ہے باقی پوری دنیا کے لیے یہ آلویز اویلیبل۔"

مما کی طنزیہ آواز میں دکھ بھی شامل تھا۔ مجھے ایک لمحے کو افسوس ہوا شاید مجھے اگلے ہی دن مما کے پاس آنا چاہیے تھا لیکن اب دیر ہو چکی تھی اس خیال کے لیے بھی۔ خیر مما کی نیم آمادگی پر میں پھر سے انتظار کی نشست پر بیٹھ گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہم ہوٹل ریسٹورنٹ میں ہی ناشتے کی ٹیبل پر موجود تھے۔ مما کو منانا ایک مشکل کام تھا لیکن بہرصورت ہو گیا۔ ادھر ادھر کی باتیں ان کی دوحہ کی نئی مصروفیات سب سن کر بالآخر وقفہ درمیان میں آ ہی گیا۔ میرے اور مما میں کچھ بھی کامن یا ایسا نہیں تھا جس پر کبھی ہماری بات ہوتی۔ میں بس پاپا کی طرح ان کا ایک اچھا سامع تھا۔ کچھ دیر خاموشی کے بعد مما پھر گویا ہوئیں۔

"ولید بیٹا۔ مجھے تم سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔ میں چاہتی ہوں تم اسے سمجھو اور پلیز کھلے دل و دماغ کے ساتھ۔"

مما کی بات کی شروعات پر میں تھوڑا الجھ گیا تھا وہ کبھی اتنی تمہید باندھ کر بات نہیں کرتی تھیں۔

"ولید۔" "میں عشرت مرزا سے ڈائیوارس لے رہی ہوں۔"

"جی؟" مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا میرے کانوں نے غلط سنا ہے یا کوئی اپریل فول گیم کھیل رہی ہیں مما میرے ساتھ؟

"میں اسی لیے پاکستان واپس آئی تھی تاکہ تم سے بات کر سکوں کیونکہ لاسٹ کال پر تم نے کہا تھا تمہیں یہاں زیادہ ٹائم لگ سکتا ہے۔ دادان کی کچھ زمنی اراضی ہے یہاں جو اس کے ابا کے مرنے کے بعد اس کے حصے میں آئی تھی، اور اب تمہیں ٹرانسفر ہوئی ہے۔ میں چاہتی ہوں میری موجودگی میں تم یہ کام کر لو تاکہ میں......"

میرے ہاتھ سے چمچہ چھوٹ کر پلیٹ میں جا

گرا تھا۔ زوردار چھناکے کی آواز کے ساتھ۔

"ایک منٹ مما۔ آپ کہنا کیا چاہ رہی ہیں؟"

"میں نے بہت الجھن میں آ کر ان سے پوچھا تھا۔ آپ کیا بولے جا رہی ہیں، کون سی ڈائیوارس، کیوں کر رہی ہیں آپ یہ سب۔"

"فکر نہ کرو ولید، تم پر بوجھ نہیں بنوں گی واپس دوحہ چلی جاؤں گی۔"

"مما، آپ کا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا۔ کس قسم کی باتیں کر رہی ہیں آپ۔ مجھ پر بوجھ بننے کا یہاں کیا تذکرہ۔ میں آپ سے اس فیصلے کی وجہ جاننا چاہتا ہوں۔"

میں بہت بے صبرا ہو گیا تھا، کسی حد تک ہسٹریک۔ مما مجھے کوئی وجہ نہیں دے پائی تھیں اپنے اس امر کی بابت سوائے اس کے، کہ وہ کچھ وقت اکیلے گزارنا چاہتی ہیں، یہ ایک بہت عجیب و غریب اور ناقابل بھروسا وجہ تھی اور میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا کیا کہوں، کیا کروں۔ یہ بہرحال مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ میری ماں جس بات پر اڑ جائیں وہ کر کے چھوڑتی ہیں۔ کہیں اسی وجہ سے تو عشرت انکل کل ثانیہ مما کی طرف نہیں گئے تھے؟ یکایک ساری گتھیاں سلجھ گئی تھیں گویا۔

بہت مشکل سے مما کا آدھا سچ ہضم کرتے ہوئے، خود کو کسی صورت سنبھال کر میں واپس گھر آیا تھا اور گھر آ کر میں بیمار ہو گیا۔

☆☆☆

آنے والے کچھ دنوں میں کئی طوفان آئے بہت سی قیامتیں برپا ہوئیں۔ مما اور عشرت انکل کی ڈائیوارس۔ مما کا ادھورا سچ مکمل صورت حال میں مجھ پر عیاں ہونا، ان کے آگے کے ارادے دنیا بھر کے اور خود مما کے ہر طرح کے اعتراضات کے باوجود میرا ثانیہ مما کے گھر شفٹ ہونا۔ عشرت انکل سے کنفرنٹیشن اور ان کا مستقل پاکستان میں اپنے آبائی گاؤں شفٹ ہونے کا فیصلہ۔ ثانیہ کا بدلا ہوا رویہ اور میرا ٹوٹا ہوا کرچی کرچی ہوتا وجود۔

دن مہینے سال ایسے ہی گزرتے رہے تین سال کب بیت گئے پتا بھی نہیں چلا۔ شروع شروع میں کیا خاندان، کیا جاننے والے سب ہی اس چٹپٹی کہانی سے لطف اندوز ہوئے اور پھر آہستہ آہستہ سب بھولنے لگے۔ اس تمام وقت میں ثانیہ مما کی فیملی اور احسن سائے کی طرح میرے ساتھ رہے۔

میرا بزنس پاکستان میں دن دگنی رات چوگنی ترقی کر رہا تھا۔ ثانیہ کو ایم بی اے کی اسکالرشپ مل گئی تھی فن لینڈ میں۔ اور اب وہ دیار غیر میں جا بسی تھی۔ احسن کی شادی ہو گئی تھی، احسن کی وہی جم اور پڑھائی کی روٹین برقرار تھی۔ ثانیہ مما ہم چاروں کو دیکھ دیکھ کر جیتی تھیں۔ مما نے واپس جا کر تیسری شادی کر لی تھی، شروع میں ان کی ناراضی رہی بہت عرصہ پھر اب وہ بھی آہستہ آہستہ روٹین پر آ گئیں۔ چند سو درہم کمانے والے وادان سے شروع ہوا ان کی زیست کا سفر ترقی کے منازل اپنی رفتار سے طے کر رہا تھا اور میں صرف ایک دعا کرتا رہتا تھا کہ کسی معصوم کا حق کھانے کا گناہ میری ماں مزید اپنے سر پہ نہ لے بیٹھیں۔ عشرت انکل بھی کبھی گھر آتے تھے، اپنے بچوں سے ملنے، ایک روٹین کی طرح بس۔

رہا میں تو میرا کیا تھا۔ میں تو خود کسی ٹیم کے بارھویں کھلاڑی کی مانند تھا۔ گو ایک طرح سے ثانیہ مما کے گھر آ کر میں نے وقتی اپنی ایک چھوٹی سی فیملی بنا لی تھی۔ لیکن کبھی کبھی احساس ہوتا تھا کیا ہی اچھا ہوتا اگر مما اور ثانیہ بھی اسی تصویر کا ایک حصہ ہوتے تو کیسا لگتا؟ جانے سے پہلے ثانیہ کا دوستانہ رویہ اور بدلاؤ بہت حوصلہ افزا تھے لیکن وہ آسمانوں میں اڑنا چاہتی تھی اور میرے لیے ہمیشہ سے اس کی خوشی مقدم تھی، ویسے بھی پریکٹیکل لائف کوئی سنڈریلا کی کہانی تو ہوتی نہیں ہے۔ باقی مجھے امید تھی کہ نصیب کے لکھے سے بڑھ کر کچھ حقیقت نہیں اور اسی امید پر میں محنت اور لگن سے اپنے کام میں مشغول ہوں۔ ایک نہ ایک دن میرے رشتوں کے ادھورے پزل بورڈ پر بھی مما اور ثانیہ کے گمشدہ پیسز ضرور فٹ ہوں گے۔ آپ کیا کہتے ہیں؟

☆☆

منشاء محسن علی

قیس جنگل میں اکیلا ہے

پچھلی کا خلاصہ

اماں مہر کے اطلس کے گھر جانے پر پریشان ہو رہی ہوتی ہیں تو عذرا ان کو سمجھاتی ہے کہ چھوٹے بچوں کے دل بھی چھوٹے سے ہوتے ہیں اور مہر دلوں کی حفاظت پر مامور ہے۔

مہر بچوں کو دوبارہ اپنے گھر میں لے آتی ہے۔ اماں مینا کے سر پر ہاتھ رکھتی ہیں۔

مہر اماں سے کہتی ہے کہ اطلس برا ہو گا لیکن اب وہ مجھ سے آنکھیں زمین پر گاڑ کر بات کرتا ہے۔

زرتاب اپنی جیولری اتار رہی ہوتی ہے کہ قیس کا فون آتا ہے۔ زرتاب عذرا کے بارے میں پوچھتی ہے۔ تو قیس جل کر جواب دیتا ہے کہ مہر اور عذرا آج کل فلاحی کاموں میں مصروف ہیں۔

قیس زرتاب کی تعریف کرتا ہے۔

کلثوم ٹنکو سے کہتی ہیں کہ اس کا بھائی لڑائی جھگڑا کرتا ہے اور سب کو ڈرا کر رکھتا ہے۔ جواباً مینا بولتی ہے کہ اطلس بھیا اللہ کے بعد صرف مہر کی سنتے ہیں۔

ٹنکو مہر کو اطلس کا نمبر بتاتا ہے کہ مہر اس کو کال کرے۔

قیس زرتاب سے کہتا ہے کہ عذرا نے اسے پسند کیا ہے اور آخری فیصلہ اس کا ہی ہو گا۔ زرتاب کھڑی کی کھڑی رہ جاتی ہے۔

زرتاب عجی کے گھر رومان کے ساتھ جاتی ہے۔ بیٹھے باتیں کر رہے ہوتے ہیں کہ بجلی چلی جاتی ہے۔

اندھیرے میں سب باتیں کر رہے ہوتے ہیں۔ اندھیرے میں پتا بھی نہیں چلا تھا کہ زرتاب کا ہاتھ کسی کے ہاتھ پر جا پڑا تھا۔ زرتاب خوش ہوتی کہ ارمان نے اس کا ہاتھ پکڑا ہے۔ بجلی کی چمک میں مہر دیکھتی ہے کہ زرتاب کا ہاتھ قیس کے قبضے میں تھا۔

اماں قیس سے کہتی ہیں کہ اب وہ عذرا اور اس کی شادی کرنا چاہتی ہیں۔

قیس جواباً کہتا ہے کہ پہلے وہ عذرا کی شادی کر دیں۔ اماں سمجھتی ہیں کہ وہ سمجھا نہیں اس لیے وضاحت کرتی ہیں کہ وہ عذرا کی شادی اس سے کرنے کی بات کر رہی ہیں۔

قیس صاف انکار کر دیتا ہے۔

پانچویں قسط

بند کمروں اور گھٹے گھٹے ماحول سے عجی کی جان جاتی تھی۔ مگر اس لمحے کیا بات ہوئی تھی کہ وہ کمرے میں بالکل ہی بند ہو کر رہ گئی تھی۔

قیس کا پھونکا ہوا صور ان تینوں عورتوں کو پتھر کر گیا تھا۔

کبھی کام کو ہاتھ نہ لگانے والی مہر نے مینا کے

ساتھ مل کر کھانے کے سارے برتن بجی جان سے سمیٹے تھے۔

ننکو باہر دوڑ گیا تھا اور اب وہ آس پاس پھیلے ہوئے اندھیرے میں بجی کے سورج مکھی کے بیجوں پر دوبارہ سے مٹی برابر کر رہا تھا۔

رات بات تھی۔ رات ذات تھی۔ رات گھات تھی!

اماں کلثوم کو جیسے عجیب سی چپ لگی تھی وہ تو بس ٹکر ٹکر در و دیوار کو دیکھتی رہی تھیں۔ قیس کا کہا گیا جملہ ان پر کستوری محلے کی ساری چھتیں توڑ گیا تھا۔

"میں عذرا سے شادی نہیں کر سکتا۔"

بولنے والے کے لیے بہت آسان تھا شاید یہ سب کچھ جو وہ بول گیا تھا۔ سننے والے اذیت اور پچھتاوے کی لپیٹ میں تھے۔ بند کمرے کے دروازے سے ٹیک لگا کر بیٹھی ہوئی بجی کو جیسے اب حقیقت کی سمجھ بوجھ آئی تھی۔ خود کو فریب دے کر اور سراب کے پیچھے بھاگ بھاگ کر دی جانے والی طفل تسلیاں بیچ چوراہے میں کھلی تھیں۔

وہ اور اماں تو قیس کی محبت میں اندھی اور شودھی ہو گئی تھیں۔

"ارے قیس تو وارث ہے ہمارے گھر کا۔ ہماری خوشیوں کا۔"

اماں کے بولے گئے ایسے جملے ہمیشہ مہر ہی پکڑتی تھی۔ مہر کی پکڑ بھی کافی سخت تھی۔

"صرف گھر کا وارث بنائیں اسے یا پھر بجی کے سر کا۔ ہماری خوشیوں سے اس کو دور رکھیں۔"

ساگ کاٹتی ہوئی اماں نے مہر کی طرف درانتی پھینکی تھی۔

"دفع دور۔ تو تو جلتی ہے قیس سے۔"

اماں کی بات پر وہ تو ایسی لوٹ پوٹ ہوئی کہ تخت سے بھی کئی قدم دور جا گری۔

"ہائے اماں۔ میری پیاری اماں۔ مہر جلے بھی تو کس سے جلے۔ میں تو کبھی سوچوں بھی نا اس بناوٹی انسان کے بارے میں۔ جن کے ماتھے پر ان کے کھوٹ جھلکتے ہوں، میں تو باز آئی بھئی۔"

توبہ توبہ کرتی ہوئی وہ بمشکل اماں کی گرفت سے بچی تھی۔ اماں طیش کے عالم میں نتھنے پھلا رہی تھیں۔ قیس کا کھرا کھوٹا سب انہیں عزیز تھا۔ انہوں نے پرائی اولاد کو خون جگر دے کر پالا تھا۔

"بھائی ہے وہ تمہارا۔ پیار دیا کرو۔ عزت کیا کرو۔"

"دیوتا کو دو پجاری مبارک ہوں۔ ہمیں اس گنتی سے پرے رکھا جائے۔"

"کبھی کبھی لگتا ہے کہ تم میری اولاد ہی نہیں ہو۔" زچ ہو کر اماں جیسے مہر کو دور کرتی تھیں۔ اگلی فٹ سے مقابل آ جاتی تھی۔

"کتنی عجیب بات پر اپنی ممتا کا سرٹیفکیٹ جاری کرتی ہیں ناں آپ۔ کہ میں قیس کو اپنا پیارا راج دلارا بھائی سمجھوں۔ بھاگ بھاگ کر اس کے کام کروں۔ اس کے ہر غلط صحیح کو بجی کی طرح 'جی جی' کر کے برداشت کروں تو پھر آپ کی بیٹی کہلاؤں گی۔ ذرا سوچیے گا ضرور اماں اس بات پر۔ لاکھ ہزار بار۔ کروڑ بار۔"

اماں کے سر پر ایک تقریر جھاڑ کر وہ جھاڑو کھاتی ہوئی اندر گم ہو جایا کرتی تھی۔ اور مزے کی بات کہ اماں نے آج تک اس کی باتوں پر رتی برابر بھی نہ سوچا تھا۔

مہر تو جھلی ہے۔ مہر تو پاگل ہے۔ مشرق کی بات مغرب میں کرتی ہے۔ بھلا اس کی باتوں پر کون سوچے۔ کون سر کھپائے؟؟

اور آج کلثوم کو لگا تھا کہ کاش اس کملی جھلی اور باغی بیٹی کی بات کو سن لیتیں۔ ان کا اپنا خون ان سے کیسے جھوٹ بول سکتا تھا! وہ سمجھ ہی نہ پائی تھیں کہ پرائی اولاد ہمیشہ پرائی ہی رہتی ہے۔ اور اگر نر اولاد ہو تو اس کی پرداش و پرداخت میں چونچلے نہیں ہونے چاہییں۔ وہ یہی تو کرتی آئی تھیں۔

قیس کی سالن کی کٹوری دیسی مرغی کی بوٹیوں سے لبالب بھری ہوتی تھی۔ وہیں دوسری طرف بجی

اور مہر شوربے پی رہی ہوتی تھیں۔

دیسی گھی کے چپڑے ہوئے پراٹھے کھا کر وہ گھر سے نکلتا تھا اور وہ دونوں لڑکیاں چائے سے پراٹھے سرک سرک کھا رہی ہوتی تھیں۔

مہر اور گجی کے بس دو عیدوں پر جوڑے آتے تھے اور قیس کے چاروں موسموں کے الگ الگ سوٹ بنتے تھے۔

مہر اس بات پر ہنگامہ برپا کرتی تھی۔ ہنگامے کرنے میں وہ ویسے بھی ماہر تھی۔

"بیٹیاں ہیں ہم آپ کی۔ ہمارے ناز نخرے اٹھائیں۔ کل کو سسرال جانا ہے، ابھی سے دل میں حسرتیں ڈال دیں گی تو اگلے گھر کیسے گزارے ہوں گے؟"

الگنی سے ریشمی اور جارجٹ کے دوپٹے کھینچ کھینچ کر اتارتے ہوئے اماں کلثوم کی زبان سے پھسل گیا تھا۔

"مجھے نہیں لگتا کہ تمہیں کوئی سسرال بھی ملے گا۔ کیونکہ جیسی تمہاری حرکتیں ہیں۔"

پیچھے گپ چپ سناٹا اور خاموشی چھا گئی تھی۔ مہر پلٹ گئی تھی۔ کھٹ سے سیڑھیوں پر گجی نازل ہوئی تھی۔ مہر کی آنکھیں ساون تھیں۔ اماں کے الفاظ کی حدت سے پر تھے۔

"کاش۔ آپ کو پتا چلے کہ جن کے نصیب میں بیٹے نہیں ہوتے تو اس میں اللہ کی مصلحت ہی ہوتی ہے۔ شکر ہے میرا کوئی سگا بھائی نہیں ہے ورنہ قیس کی طرح وہ بھی میری ہر چیز کا حصہ کھا جاتا۔"

مہر کے لفظ معمولی تو ہرگز بھی نہیں تھے۔ وہ آنسو چھپاتی ہوئی اندر غلام گردشوں میں گم ہو گئی تھی۔

گجی اماں کے پاس آئی تھی۔ جن کے ہاتھوں سے جارجٹ پھسل رہی تھی۔

"کیوں کرتی ہیں اس کے سامنے ایسی باتیں۔؟"

"اس کی سنی ہیں کبھی۔ زہر بھالے میں بجھی ہوئی باتیں۔ سیدھی دل پر وار کرتی ہے۔ شکر کرنا چاہیے اسے کہ سر پر ایک مرد ہے۔ ورنہ اکیلی عورتوں کا اکیلا رہنا آسان ہے کیا۔"

اماں کی آدھی بات منہ میں ہی تھی۔ کہ اندر کھٹ سے ایک بند کھڑکی سے مہر کا سر باہر آیا تھا۔

"قیس جیسے وارث پر نہیں۔ اللہ پر یقین رکھیں میری طرح۔ یاد رکھیے گا جس دن اس ذمہ دار مرد کا بت ٹوٹے گا نا، تب آپ کو اللہ یاد آئے گا۔"

کلثوم تلملا گئی تھیں۔ مہر جھٹ سے کھڑکی بند کر گئی تھی۔ وہ کون ہوتی تھی گناہ ثواب کی بات کرنے والی۔؟ ان کے اور اللہ کے تعلق پر سوال اٹھانے والی۔ بعد میں یاد آیا کہ وہ ان کی سگی اولاد تھی۔ مہر بختیار۔ جس کے اختیار میں صرف اپنی گز بھر لمبی زبان تھی جو قینچی کی طرح چلتی تھی۔ اور سامنے والے کو کاٹ کھاتی تھی۔

وہ جنگ ہفتوں جاری رہی تھی۔ کافی عرصے کے بعد مہر نے خود ہی خود کو سمجھایا تھا کہ وہ گجی اور اماں کے دل سے اس بناوٹی انسان کی محبت کو ختم نہیں کر سکتی تھی۔ بس ایک دن آئے گا جب وہ کھوٹا اترے گا تو سارا جہاں دیکھے گا۔

اور آج وہ دن آ گیا تھا۔

☆☆☆

digest library.com

مینا اور ننکو دونوں باورچی خانے کے فرش پر آلتی پالتی مارے ہوئے بیٹھے تھے۔ مینا نے اپنے اردگرد برتنوں کا ڈھیر سجایا ہوا تھا جسے وہ ساتھ ہی ساتھ صاف بھی کرتی جا رہی تھی۔ ننکو کے چہرے پر گذشتہ واقعے کی تشویش سی تھی۔

"بات سنو تو مینا۔"

"ہاں بولو"

مینا کو یوں مصروفیات سے ہٹایا جانا کافی ناگوار گزرا تھا۔ معصوم ننکو مینا کی مکمل توجہ کا منتظر تھا۔

مینا نے اپنی گونا گوں مصروفیات سے سر اٹھا کر جیسے چھوٹے بھائی کو دیکھا۔

"میں ایک بات سوچ رہا تھا۔"

"اچھا۔ بھلا بتاؤ تو کون سی بات؟"

مینا کو جیسے ٹنکو کے لہجے سے کام کی بات کی بو آئی تھی تو وہ ایک پل کے لیے ٹھٹک گئی تھی۔ سارا کام وام روک کر متوجہ ہو گئی تھی۔

"میں یہ کہہ رہا تھا کہ کیا اب قیس بھیا عجی باجی سے شادی نہیں کریں گے؟۔"

گھر کے دروازے بند کرتی ہوئی مہر اچانک ہی باورچی خانے کی طرف آن نکلی تھی۔ اور ٹنکو کی بات پر جیسے وہیں کھڑے کھڑے جم گئی تھی۔ وہ جو خود کو کام کاج میں حتی الامکان مصروف ظاہر کر کے ان کے سر پر ٹوٹنے والی قیامت سے انجان نظر آئی تھی۔ اب دوبارہ سے سب کچھ زندہ ہو کر کسی آسیب بھوت پریت کی طرح ناچنے لگا تھا۔

مینا نے پھر سے اسٹیل کی پلیٹ اٹھالی تھی۔ جیسے اس کام سے ضروری دنیا میں کوئی کام نہ ہو۔ ٹنکو کے سوال پر چہرے پر جیسے عجیب سی اداسی چھا گئی تھی۔

"مجھے نہیں پتا۔ عجی اتنی اچھی ہیں کہ کوئی بھی ان سے شادی سے انکار نہ کرے۔ مگر پتا نہیں کیوں قیس بھیا نے منع کر دیا ہے۔"

ٹنکو کا جھکا ہوا سر جہاں آنکھوں میں چھوٹے چھوٹے آنسو بھر گئے تھے۔ مینا کی باتوں میں بردباری نظر آتی تھی۔ مہر نے اندر قدم رکھا تھا۔

"کیونکہ قیس تم لوگوں کی عجی باجی کو ڈیزرو ہی نہیں کرتا ہے۔" مہر نے پھر سے ایک "انگریزی" لفظ کا سہارا لیا تھا۔

ٹنکو کی بھیگی آنکھوں سے ننھے منے چشمے چھلک چھلک گئے تھے۔

"ڈیزرو کیا ہوتا ہے۔؟"

سارے عرصے میں پہلی بار مہر کے چہرے پر مسکراہٹ آئی تھی۔

"ڈیزرو بہت خوب صورت لفظ ہے۔ معیار پر پورا اترنا۔ برابری کی بات۔ یوں سمجھو ترازو میں تولو تو ہر بات میں ہماری عجی بہت بھاری ہیں۔ اور وہ قیس۔ وہ ہمیشہ ہلکا ہی رہے گا۔"

مینا برتن بھول بھال گئی تھی۔ مہر نے بھی فرش پر نشست لگالی تھی۔

یہ کیسی بات تھی۔ یہ تو اچھی بات تھی۔ کہ کوئی انکار کر دے۔ کوئی منع کر دے۔ ٹھکرا دے۔ تو کہہ دو۔ جاؤ بھاڑ میں۔ تم تو مجھے ڈیزرو نہیں کرتے!

ٹنکو ہولے سے مہر کی طرف کھسکا تھا۔ جیسے بہت اہم بات کرنی ہو۔

"مہر جی۔ میں آپ کو ایک بات بتاؤں؟۔"

مہر نے سوالیہ نظروں سے ٹنکو کو دیکھا تھا۔

کستوری محلے کا ٹنکو پہلے جھجکا۔ پھر شرمایا۔ اور پھر مسکایا۔!

"اگر۔ اگر۔ عذرا باجی زیادہ اداس ہوئیں۔ یا پریشان ہوئیں کہ ان سے اب شادی کون کرے گا تو۔ آپ انہیں بتا دیجیے گا۔"

مہر نے حیران ہو کر اس چھوٹے لڑکے کو دیکھا۔

چوکھٹ پر کلثوم بھی آن رکی تھیں۔ سامنے ہی سر جوڑے وہ تینوں فرش پر مزے سے بیٹھے تھے۔

"تو۔ آپ ان کو کہیے گا کہ ٹنکو ان سے شادی کرلے گا۔"

وہ سنجیدہ لہجے میں کہی گئی بات۔ وہ چھوٹے سے ٹنکو کی اتنی بڑی بات جیسے مہر کو اس واقعے کی قیامت سے کھینچ لائی تھی۔ اس نے لپک کر ٹنکو کو خود سے لگا لیا۔

"ہاں ہاں مہر جی۔ ٹنکو جب بڑا ہو جائے گا ناں تو ہم عجی باجی کی ٹنکو سے شادی کر دیں گے۔"

مہر روتی تھی۔ مہر ہنستی تھی۔!

اماں کلثوم جیسے کسی کیفیت میں آ گئی تھیں۔

انہیں آج احساس ہوا تھا کہ بے خبری میں مارے جانے والے لوگوں میں صرف ان کا اور ان کی عجی کا نام تھا۔ مہر ہوشیار تھی۔ مہر چالاک بھی تھی۔ وہ کبھی بھی غلط لوگوں پر اپنے جذبات اور احساسات ضائع نہیں کرتی تھی۔

مہر جیت گئی تھی!

بس اب انہوں نے اس شخص کو پرکھنا تھا جو مہر

کی زندگی میں آیا تھا۔
وہ غنڈہ۔ وہ بدمعاش۔ وہ لوفر۔ وہ آوارہ!
زمانے کے سارے کھوٹ اس میں جمع تھے اور اگر وہ بھی ٹنکو اور مینا کی طرح کھرا نکلا تو؟
بس یہیں سے بات شروع ہوئی تھی۔ اطلس کی۔ اور۔ ہوشیار۔ چالاک اور موقع پرست مہر کی۔

☆☆☆

رومان اپنے بڑے گھر کی بڑی سی چھت پر چہل قدمی کرتے ہوئے اس چھوٹے محلے کی چھوٹی سی لڑکی کے بارے میں مسلسل سوچ رہا تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ سوچوں کو جھٹکنے کی تگ و دو میں بھی سلجھا ہوا سا نظر آتا تھا۔
عذرا عرف گجی۔ کتنا عجیب نام تھا۔ شاید بہت زیادہ عجیب۔! جو اپنے گھر کی کیاریوں میں سرسوں اور سورج مکھی کے بیج بویا کرتی تھی۔ اور اس کے سامنے آ کر تڑ تڑ اس کو آئینے دکھایا کرتی تھی۔
"ظاہری بات ہے سورج مکھی کے بیج سے سورج مکھی کے پھول ہی اگیں گے۔ کچنار کے پھول تھوڑی لگیں گے۔"
کتنا دل چاہا تھا اس کا کہ وہ کھرپی لے کر مٹی کریدتی ہوئی گجی کے پاس بیٹھ جائے اور کہے۔
"کیا ہم دونوں مل کر کچنار کے پھول اگا سکتے ہیں۔؟"
شاید وہ تیکھے نقوش والی لڑکی آنکھوں میں بہت ساری حیرانیاں جما کر کھرپی اس کی گردن پر رکھ کر کہے گی۔
"دماغ ٹھیک ہے تمہارا؟ سٹھیا گئے ہو کیا؟ تمہیں کیا لگتا ہے کہ مجھے ایک عام سی مڈل کلاس لڑکی سمجھ کر فلرٹ کرنے آ جاؤ گے۔"
اور وہ دھیرے دھیرے سے اس کے بالوں کے جوڑے سے وہ موتیا کا پھول نکال لے گا جو ٹنکو نے اس کی بے خبری میں اس کے بالوں میں ٹانک دیا تھا۔
رومان کو لگا تھا آسمان سے ایک قطبی ستارہ ٹوٹ کر کستوری محلے کی اس اپسرا کے بالوں میں اٹک گیا تھا۔
رومان بار بار سر جھٹکتا تھا۔ وہ بار بار سامنے آتی تھی۔!!
دماغ کو بھٹکانے کے لیے اس نے زرناب کو فون کیا تھا۔
"سنو۔ کافی پینے چلیں یا پھر لانگ ڈرائیو؟۔"
"دماغ ٹھیک ہے تمہارا۔ کتنا ٹائم ہو گیا ہے۔ سوری مجھے سخت نیند آ رہی ہے"
زرناب نے کال کاٹ دی تھی۔ وہ گہری سانس لے کر آسمان کی طرف نظر اٹھا کر تارے گننا شروع ہو گیا تھا۔ پہلے پہل بورنگ اور پھر اسے انتہائی دلچسپ مشغلہ لگا تھا۔ وہ مزے سے تارے گن رہا تھا اور رات بیت رہی تھی۔ بیتتی جا رہی تھی

☆☆☆

ٹنکو اور مینا کو سلا کر وہ اماں کلثوم کی طرف آئی تھی۔ جو لاؤنج میں ہی ایک طرف جائے نماز پر بیٹھے ہوئے ہوئی تھیں۔ چہرے پر ہزار سوچیں تھیں۔ مہر کو دیکھ کر جیسے چونک گئی تھیں
"وہ ابھی تک دروازہ بند کر کے بیٹھی ہے۔ اس کی خبر لو۔"
مہر اطمینان اور سکون سے سامنے رکھے صوفے پر پیر ٹکا کر بیٹھ گئی تھی۔
"ابھی اسے کچھ مت کہیں۔ جس کا غم ہوا سے اپنے غم کو منانے کے لیے نہیں روکتے۔"
اماں کی نظر بس شاکی تھیں۔ آنکھ سے نا چاہتے ہوئے بھی آنسو ٹوٹ کر گرے تھے۔
"یہ تو ہم سب کا سانجھا غم ہے مہر۔ مجھے قیس سے یہ امید نہیں تھی۔ میں نے تو کبھی یہ فرق نہیں رکھا کہ وہ پرائی اولاد ہے۔ لیکن اس کو دیکھو میری بیس سال کی ریاضت کو ایک جملے میں پورا کر دیا اس نے۔ کوئی ایسے بھی کرتا ہے مہر۔ اس کے دل پر ہاتھ نہیں پڑا کہ عذرا کے سامنے کہہ دیا کہ شادی نہیں کر سکتا۔"
اماں پھپھک پھپھک کر رو رہی تھیں۔ ان کا

روتا بنتا تھا۔ انہوں نے راتیں جاگ کر گزاری تھیں۔ اور اگلے بے مروت نے وہی راتیں ان کے منہ پر دے ماری تھیں۔

مہر نے انہیں بھی رونے دیا تھا۔

کستوری محلے پر اتری ہوئی وہ رات بھاری تھی۔ بہت وزنی۔

"میں کیا جواب دوں گی سب کو۔ کہ جس کو میں نے اپنی بیٹیوں کے نوالے چھین چھین کر پالا آج اسی نے مجھے سب کے سامنے رسوا کر دیا ہے۔"

مہر نے چونک کر ماں کو دیکھا تھا۔ اماں کو اب بھی لوگوں کی فکر تھی۔ لوگوں کے سوالوں کی پرواہ تھی۔!

شاید سب مائیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ وسوسوں کا شکار۔ توہمات میں پڑی لوگوں سے خوف کھاتی ہوئی۔

مہر کی نظریں بند دروازے کی طرف اٹھی تھیں۔ جہاں عذرا عرف عجی جا کر گم ہو گئی تھی۔ تین گھنٹے بیت گئے تھے۔ وہ بلی کی سی چال چلتی ہوئی اس بند دروازے کی طرف آئی تھی۔

"عجی۔"

سرگوشی سناٹے میں دور دور تک گئی تھی۔ چھت پر بھی جہاں وہ ٹہل رہا تھا۔

کسی حد تک پریشان وہ بھی دکھائی دیتا تھا بھلا اتنا اچانک۔ یوں ایسے کہہ دینا بھلا ایسا کہاں ہوتا ہے کہ کسی کو سنبھلے بغیر۔ کوئی موقع دیے بغیر۔ فیصلہ سنا کر سیڑھیاں چڑھ کر اس سارے منظرنامے سے رفوچکر ہو جانا۔!!

وہ جانتا تھا کہ مہر اسے نہیں چھوڑے گی۔ ابھی تو مہر عجی کے دروازے کے سامنے کھڑی تھی۔

"دروازہ تو کھولو۔"

مہر اب دروازہ بجا رہی تھی۔ اندر عجی بیڈ کے سہارے ٹیک لگا کر سارے آنسو خشک کر کے بیٹھی ہوئی تھی۔

"ایک ضروری بات ہے۔ وہ کہہ کر چلی جاؤں گی۔ سچ میں۔ تمہاری قسم"

عجی نے کسی سچ کا۔ کسی قسم کا یقین کھو دیا تھا۔

"تمہارے لیے ایک پروپوزل لے کر آئی ہوں۔"

مہر نے لہجے میں سنسنی بھری تھی۔ عجی نے بے یقین نظروں سے بند دروازے کو دیکھا تھا۔ کہ وہ زندگی کے مشکل دور سے گزر رہی تھی اور اب بھی مہر کو مسخریاں اور لطیفے سوجھ رہے تھے۔

"اچھا لڑکا ہے۔ تھوڑا بہت پیارا بھی ہے۔ کماتا نہیں ہے۔ مگر وعدہ کیا ہے اس نے کہ کچھ وقت کے بعد کمانے بھی لگے گا اور تمہیں رانی بنا کر رکھے گا۔ اور تو اور۔ اسٹامپ پیپر پر لکھ کر دینے کو بھی تیار ہے۔"

کھٹ سے دروازہ کھلا تھا۔ لٹی پٹی ہوئی عجی سامنے کھڑی تھی۔

عجی کی آنکھیں صحرا۔ عجی کی آنکھیں بنجر۔!

مہر کی آنکھیں پانی۔ مہر کی آنکھیں دریا۔!

مہر نے تڑپ کر عجی کو گلے سے لگایا تھا۔

"وہ۔ وہ ٹنکو ہے ناں۔ اس کی سفارش لے کر آئی ہوں۔ سچ میں۔ اس نے کہا ہے وہ تم سے شادی کرے گا۔"

digest library.com

عجی ہنس دی۔ عجی کھلکھلائی۔!

اماں کلثوم جائے نماز چھوڑ کر ننگے پاؤں اس کی طرف دوڑی تھیں

"عذرا۔ میری دھی۔ تو ٹھیک ہے ناں؟"

سامنے کھڑی دھی نے پہلے ہنس کر دکھایا۔ پھر ٹھیک ہو کر بھی دکھایا کہ ماں کو تسلی رہے۔ ماں کے دل کو قرار رہے۔!

"آپ کے سامنے کھڑی ہوں اماں۔ اچھی بھلی۔ ٹھیک ٹھاک۔ اور سچ کہتی ہے مہر، دنیا میں صرف ایک رشتہ تھوڑی ہوتا ہے۔ مرنے والوں پر فاتحہ اور آنے والوں کو خوش آمدید کہتے ہیں۔"

اماں کو لگا تھا مر جائے گی عجی۔ جوگن بن جائے گی۔! مگر یہاں تو یا حیرت۔ سامنے والی اگر صابر تھی تو انتہا کی تھی۔

عذرا نے پلٹ کر مہر کو دیکھا تھا۔

"ایک کپ چائے بنادو گی؟"

"نہیں بری چائے بناتی ہوں پہلے بتا دوں۔" مہر نے بتانا ضروری سمجھا تھا۔ کہ کہیں بعد میں وہ اس کی بنائی ہوئی چائے اپنے پودوں کی کیاریوں میں تھوکتی پھرے۔

نجی نے مہر کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

"آج بری چائے پینے کا دل کر رہا ہے۔"

مہر بری چائے بنانے کے لیے باورچی خانے کی طرف چل دی تھی۔

اماں نجی کو لاؤنج کی طرف لے آئی تھیں۔ دونوں کے درمیان سناٹا بولتا رہا تھا۔ پھر جھجک کر اماں نے نجی کو دیکھا۔

"تم کہو تو میں قیس سے بات کروں؟"

"کیا بات کریں گی؟"

"میں نے پالا ہے اسے نجی۔ اتنا حق تو رکھتی ہوں۔ کہتے ہیں ناں جنم دینے والے سے کہیں پالنے والا بڑا ہوتا ہے۔"

"رہنے دیں اماں۔ اس نے آپ کو چھوٹا کر دیا ہے۔"

عذرا نے ماں کے دونوں ہاتھ چوم لیے تھے۔ وہ جانتی تھی ماں کے دل میں درد کہیں بہت زیادہ ہوگا۔ وہ ماں تھیں۔ ماں کی ممتا کو کئی امتحان لازم ہوتے ہیں۔

کلثوم نے اچانک نجی کے ہاتھ پکڑے تھے۔

"تمہیں ایک بات بتاؤں عذرا۔ مہر کو مت بتانا۔" انہوں نے ڈر کے مارے باورچی خانے کی طرف دیکھا تھا جہاں وہ چائے کا قہوہ بنا رہی تھی۔

وہ چونک گئی تھی۔ حیران ہو کر ان کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ جہاں بے بسی، درد اور جانے کتنے ہی احساسات رقم تھے۔

"بولیں اماں۔ بے فکر رہیں۔ میں مہر کو نہیں بتاؤں گی۔"

اماں کا کلیجہ پھٹ گیا۔ دل پارہ پارہ ہو گیا۔

"نجی۔ اتنا سب ہونے کے باوجود بھی میرے دل سے قیس کے لیے ممتا ختم نہیں ہو رہی۔ محبت کم نہیں ہو رہی ہے۔ میں نے پالا ہے اسے۔ جوان کیا ہے۔ بیٹوں کو جوان کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا نجی۔ اور ماؤں کے دل دریا ہوتے ہیں۔ اولاد کے سو قصور معاف کر دیتی ہیں۔ کل کو اگر میں نے بھی اسے ممتا سے مجبور ہو کر معاف کر دیا تو۔ تو۔ کیا تم بھی اپنی ماں کو معاف کر دو گی ناں؟"

اماں کلثوم ہاتھ جوڑے بیٹھی تھیں۔ عذرا عرف نجی سناٹے میں آگئی تھی۔ ضبط کی انتہا پر پہنچ کر اس نے ماں کا ماتھا چوم لیا تھا۔

ماں تو رو رہی تھی۔ ماں کانپ رہی تھی۔ ماں جھجک رہی تھی۔

"اماں۔ میں نے آپ کو معاف کیا۔ اور آپ کے بیٹے کو بھی۔ میرا اللہ بھی آپ دونوں کو معاف کرے۔"

نجی کیا تھی۔ ظرف کی مکمل تصویر۔ سب کی خاطر اپنی خوشیاں قربان کر دینے والی نجی۔!! جو بیج بوتی تھی۔ پھول لگاتی تھی۔!!

آج عذرا عرف نجی نے اپنے آپ کو مٹی میں بو دیا تھا۔!!

دیکھتے ہیں نجی کے بیج پر کون سے پھول لگیں گے؟

سورج مکھی کے؟ سرسوں کے؟ کچنار کے؟ یا پھر۔۔ محبت کے؟؟

☆☆☆

تالاب والے گھر میں صبح اتر آئی تھی۔

گارڈن میں مالی اپنی اپنی ڈیوٹیاں سنبھال چکے تھے۔ ڈرائیور گاڑیوں پر پانی پھینک رہے تھے۔ ڈرائیو وے کے پاس کچھ نئے گملے رکھے گئے تھے۔ زرتاب زمان تیار شیار ہو کر خوشبوؤں میں مہکتی ہوئی ناشتے کی میز پر آئی تھی۔ مگر ہمیشہ کی طرح ناشتے کی میز اس وقت بھی میدان جنگ کا ماحول پیش کر رہی تھی۔ وہ کسی بھی کرسی پر بیٹھنے کے بجائے وہیں پر ہاتھ باندھے ہوئے کھڑی ہوگئی تھی۔

زینت اور زمان ایک دوسرے کے سامنے

کھڑے ہوئے ایک دوسرے کو مسلسل کوس رہے تھے۔

"کلاس۔ کلاس۔ اسٹینڈرز۔ اسٹینڈرڈ۔ بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہاری کلاس۔ ایک بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری عورتوں کے ساتھ شاپنگ کرنا۔ گھومنا پھرنا۔ پیسے اڑانا۔ یہ ہے تمہاری سو کالڈ کلاس۔ جس میں تم مجھے ہمیشہ شامل نہ ہونے کے طعنے دیا کرتے تھے۔"

زمان کی نظر اب کہیں جا کر پیچھے کھڑی کوئی زی پر پڑی تھی۔ بیٹی کی آنکھوں میں بھی کچھ تھا۔

"تم ایک جاہل عورت ہو اور ہمیشہ رہوگی۔ ہماری سوسائٹی میں یہ عام بات ہے۔ مرد عورت کی دوستی کوئی نئی بات نہیں ہے۔"

"اپنی ویڈنگ اینورسری کا دن کسی دوسری اپنی سے آدھی عمر کی لڑکی سے ساتھ گزارنا۔ اسے ڈیٹ کرنا۔ یہ عام بات نہیں ہے۔"

زینت کے لہجے سے زہر ٹپک رہا تھا۔ منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔

"یہ دیکھیں۔ یہ کیا ہے۔ یہ تصویریں۔ یہ کریڈٹ کارڈ ہسٹری۔ کون ہے یہ لڑکی نیلم؟۔"

"تم ہوتی کون ہو مجھ سے یہ سارے سوال جواب کرنے والی۔ تم سے شادی بے جی کا فیصلہ تھا اور ان کے احترام کی وجہ سے میں خاموش رہا ورنہ میرے لیے کوئی مشکل نہیں تھا کہ تین حرف کہہ کر تمہیں اپنی زندگی سے فارغ کر دیتا۔ تم جیسی عورتوں کے ساتھ یہی کرنا چاہیے۔"

زرناب نے اب کرسی کا سہارا لیا تھا۔ کندھے پر رکھا بیگ اچانک بہت بھاری ہو گیا تھا۔

زینت اور زمان کے جھگڑے کا شور تالاب والے گھر کو مکمل اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا۔

بے جی باہر گملوں کی سیٹنگ کروانا روک کر اندر آئی تھیں۔

ڈرائیور اور باقی ملازمین بھی ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

یہ سرکس اکثر لگا کرتا تھا۔ گھر کے سارے ملازمین بعد میں بھی سب لطیفوں کی صورت میں ڈسکس کیا کرتے تھے۔ اور ان کے یہ لطیفے زرناب خود بھی کئی بار سن چکی تھی۔

زینت نے کانچ کا گلاس توڑا تھا۔

"شرم آنی چاہیے تمہیں اپنی بیٹی کی عمر کی لڑکی سے عشق لڑاتے ہوئے۔"

زینت کی اب کہیں جا کر زرناب پر نظر پڑی تھی۔ زرناب زمان بھی اس جنگ کی لپیٹ میں آ گئی تھی۔ زمان کے حوصلے اچانک جواب دے گئے تھے۔ اس نے آگے بڑھ کر زہر اگلتی ہوئی زینت کو بازو سے پکڑا تھا۔

زمان کی گرفت سے وہ درد سے چلائی تھیں۔ ناخن چبھ گئے تھے۔

زمان نے اونچی آواز میں کہا۔

"ٹھیک کہا تم نے۔ بالکل ٹھیک۔ بیٹی کی عمر کی ضرور ہے وہ۔ مگر بیٹی نہیں ہے میری۔ میرا جو دل چاہے گا کروں گا۔ میں اپنی باقی زندگی تم جیسی نفسیاتی عورت کے ساتھ نہیں گزار سکتا۔ سمجھیں۔"

"تم نے مجھے نفسیاتی کہا۔ تم نے مجھے پاگل کہا۔ میں تمہیں بتاتی ہوں پاگل ہونا کیا ہوتا ہے۔ میں تمہیں بتاؤں کی نفسیاتی ہونا کسے کہتے ہیں۔"

ایک ایک کر کے ناشتے کی میز کی کراکری زینت نے توڑنی شروع کر دی تھی۔ جاپان سے منگوائے گئے مہنگے ٹی سیٹ۔ سب کچھ ٹوٹتا گیا۔ جوس چھلک گئے۔ آبنوسی میز سے جوس ٹپک رہے تھے۔

بے جی زینت کی طرف آئی تھیں۔

"چپ کر جاؤ زینت۔ عورتوں کو یہ سب زیب نہیں دیتا۔"

وہ طیش سے مڑی تھیں۔

"ساری زندگی آپ مجھے چپ کرواتی آئی ہیں۔ زمان کو یہ پسند ہے تو یہ کرلو۔ زمان کو وہ پسند ہے تو وہ کرلو۔ خود کو زندہ درگور کر کے میں نے زمان

صاحب کی خوشی کے لیے خود کو اتنا بدل لیا ہے کہ اب شیشے میں خود کو نہیں پہچان سکتی۔"

زینت اب زرناب کے سامنے آئی تھیں۔

زرناب کا چہرہ دونوں ہاتھوں کے کٹورے میں بھر لیا تھا۔

"یہ۔ دیکھو۔ ادھر دیکھو میری جان۔ تمہاری ماں کبھی بھی ایسی عورت نہیں تھی۔ یہ جو تمہارے سامنے کھڑی ہے ناں۔ یہ تمہاری ماں نہیں ہے۔ تمہاری ماں کو تو تمہارے باپ نے اور تمہاری بے جی نے کب کا مار دیا ہے۔ زندہ درگور کر دیا ہے۔"

زمان اپنا کالر ٹھیک کرتا ہوا بے جی کے پاس آن رکا تھا۔

زری کی سلگتی نظریں باپ پر تھیں۔ پھر ماں پر آن رکی تھیں۔ جو واقعی پاگل پاگل سی نظر آتی تھیں۔

زرناب نے جھک کر فرش پر پڑی ہوئی تصویر اٹھائی تھی۔

وہ زمان کی نیلم کے ساتھ مسکراتے ہوئے گلے میں بازو ڈالے کھنچی گئی تصویر تھی۔

زمان نے زینت کی طرف اشارہ کر کے ماں کو مخاطب کیا تھا۔

"بے جی۔ اسے کسی اچھے سائیکالوجسٹ سے چیک کروائیں۔ اور اگر ہو سکے تو دو تین ہفتے کے لیے کسی پاگل خانے رہنے کے لیے بھیج دیں۔"

"میری ماں پاگل نہیں ہے۔"

تالاب والے گھر نے پہلی بار زرناب زمان کی وہ اونچی آواز سنی تھی۔ نوکروں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"شرم آنی چاہیے آپ کو یہ سب کرتے ہوئے۔ مجھے شرم آ رہی ہے آپ کو اپنا باپ کہتے ہوئے۔ بس کر دیں آپ لوگ۔ خدا کے واسطے بس کر دیں۔"

وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے وہیں فرش پر گرتی چلی گئی تھی۔

زمان کچھ سیکنڈ رکنے کے بعد وہاں سے نکل گیا تھا۔

بے جی زرناب کے پاس آئی تھیں

"زرناب بیٹا۔ دیکھو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"کب ٹھیک ہوگا؟ کیسے ٹھیک ہوگا؟ جھوٹ بولتی ہیں آپ۔ بچپن سے جھوٹ بولتی آئی ہیں آپ۔ اب کچھ ٹھیک نہیں ہوگا۔ کبھی نہیں۔"

کچھ فاصلے پر بیٹھی ہوئی زینت نے بازو سے کپڑا ہٹایا تھا۔

بازو کے گوشت میں زمان کے ناخن کھب گئے تھے اور ان سے خون رس رہا تھا۔ دونوں ماں بیٹی کی نظریں ملی تھیں۔ قیامت بیت گئی تھی۔

ہائے ہائے۔ وہ لمحہ۔ ہائے ہائے وہ دکھ۔!

جھٹکے سے بے جی کے بازو پرے کرتی ہوئی زرناب زمان باہر کی طرف بھاگی تھی۔

ایک اور طوفان تالاب والے گھر کو لپیٹ میں لینے کے لیے تیار تھا۔

digest library.com

سورج مکھی کے پھولوں والے صحن میں صبح چپکے سے آ کر بیٹھ گئی تھی۔ کیونکہ رات کے واقعات کے بعد صبح کے دل میں بھی کئی ڈر آ کر بیٹھ گئے تھے۔ باورچی خانے میں برتنوں کا شور معمول کی طرح سنائی دے رہا تھا۔ صحن میں بنائی گئی کیاریوں میں پانی بھی نظر آ رہا تھا۔ ہوں یوں لگتا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا یا پھر بہت کچھ ہو گیا تھا۔

معمول کے مطابق فیس کو وقت پر استری شدہ کپڑے مل گئے تھے۔ آج کے دن پہننے والے بوٹ بھی پالش ہو کر اپنی جگہ پر پڑے ہوئے لشک رہے تھے۔

وہ تیار شیار ہو کر سیڑھیاں کھٹ کھٹ کرتا ہوا نیچے آیا تھا۔ ٹائی کی ناٹ ابھی بھی نہیں باندھی گئی تھی کیونکہ یہ کام بھی عذرا کیا کرتی تھی۔ جب وہ ٹائی کی ناٹ لگانے میں جھنجلانے لگا تھا تو فقط اس کی خاطر مجی نے انٹرنیٹ سے ٹائی کی ناٹ لگانا سیکھی تھی۔ وہ

محبت کے لیے کوششیں کرنے والوں میں سے تھی اور اگر اس جیسیوں کو بھی محبت راس نہ آئے تو بندہ کیا کہے محبت کو۔ یہی کہ اے محبت تیری ایسی کی تیسی!

ہزار کروڑ شکوے محبت کے نام۔!!

اربوں کھربوں حوصلے عجی کے نام۔!!

ناشتے کی میز خستہ پراٹھوں سے سجی ہوئی تھی۔ وہی روز کا اہتمام تھا۔ قیس خاموشی سے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا تھا۔ عجی ہوا کے جھونکے کی طرح آئی تھی اور اس کے سامنے بھاپ اڑاتا ہوا چائے کا کپ رکھ کر جانے لگی تھی کہ پھر کچھ خیال آنے پر جاتے جاتے واپس پلٹ آئی تھی۔

"سر اونچا کرو۔ ٹائی کی ناٹ لگا دوں۔"

وہ حیران پریشان سا سر اونچا کیے بیٹھا رہا تھا۔ عجی نے مزے سے ٹائی کی ناٹ لگائی تھی اور تعریفی نظروں سے اسے دیکھا۔

"دیکھا۔ سیٹ ہو گئی ہے۔ اتنی سی دیر لگی ہے۔ اب تم خود سیکھ لو ٹائی کی ناٹ لگانا۔"

سامنے پڑی چائے کی بھاپ آخری سانسوں پر تھی۔

"خود کیوں سیکھ لوں؟"

"میں ہر روز تھوڑی یہ کام کروں گی۔ کوئی تو میرے بعد ہونا چاہیے ناں جو تمہارے کام کرے۔ ورنہ خود ہی کر لیا کرو۔"

"تم کہیں جا رہی ہو کیا؟"

وہ چونکا تھا۔ سامنے کھڑی لڑکی کے اعتماد اور پرسکون لہجے نے جیسے اسے زبردست انداز میں چونکایا تھا۔

"ہاں۔ جا رہی ہوں۔"

گفتگو طول پکڑتی جا رہی تھی۔ تو وہ سامنے ہی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی تھی۔

سامنے پڑی پلیٹ میں ٹکو اور مینا بسکٹوں کا چورا چھوڑ کر گئے تھے۔ اب وہ وہی بسکٹوں کا چورا مزے سے پھانک رہی تھی۔

"شادی کر رہی ہوں ناں۔"

ٹھنڈی چائے پیتے ہوئے قیس کو اچھو لگا تھا۔ عجی کی بات نے جیسے اسے سنانے میں دھکیلا تھا۔

"دماغ ٹھیک ہے تمہارا؟ کیا کہہ رہی ہو تم۔"

"سارے حواس ٹھکانے پر ہیں۔ بے فکر رہو۔ تم نے ہی تو کہا تھا اماں سے کہ پہلے عذرا کی شادی کر دیں تو میں نے بھی تمہاری ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے اماں سے کہہ دیا ہے کہ جو بھی پہلا رشتہ آئے ہاں کہہ دیجیے گا۔"

اگلی جیسے اپنے سکون اور پراعتماد انداز سے سامنے والے کو چوٹ پہنچانا چاہتی تھی۔ مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ چوٹ کھانے والوں میں سے تھی۔ بھی بار بار بس چوٹ کھا رہی تھی۔

"کیوں خود کو نقصان پہنچا رہی ہو۔ باز آجاؤ عذرا۔ تمہیں کوئی بہت اچھا انسان مل جائے گا۔ یوں سمجھنا میں تمہارے قابل تھا ہی نہیں۔"

نرگسیت پسند شخص نے پہلی بار کوئی خود کو یہ کہنے پر مجبور کیا تھا۔

مہر موقع واردات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے چوکھٹ میں آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

"ٹھیک کہہ رہا ہے قیس۔ یہ تمہارے قابل نہیں ہے۔ ہیرے کے ساتھ کوئلہ بھی جچتا ہے بھلا۔ زیرو سے ضرب کھاؤ گی تو زیرو ہو جاؤ گی لڑکی۔"

مہر کے پاس ہر مرض کا توڑ تھا۔ اور قیس کے تو ہر مرض کی دوا اچھے سے جانتی تھی۔ قیس نے جل کر اسے دیکھا۔

"تم ہمارے معاملات سے دور رہو مہر۔"

مہر تو خوب ہنسی تھی۔ دونوں ہاتھوں سے تالی بھی بجائی تھی۔

"ہمارے معاملات۔ قیس میاں طبیعت تو ٹھیک ہے؟ کہو تو کستوری محلے کے طبیب کے پاس لے جاتی ہوں۔ اب آپ ہمارے نہیں رہے قیس اعجاز صاحب۔ اب آپ صرف اماں کے پالتو بیٹے ہیں اور بس۔"

لفظ "پالتو" ایک چابک تھا۔ قیس کو زناٹے دار تھپڑ کی طرح سرخ کر گیا تھا۔ وہ کرسی کو ٹھوکر مار کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"سمجھتی کیا ہو تم خود کو۔ بہت لمبی زبان ہے تمہاری۔"

"میری زبان لمبی ہے قیس بھیا۔ آپ کے تو ہاتھ لمبے ہیں۔ کہیں سے کہیں پہنچ رہے ہیں۔"

مہر کا لہجہ کچھ جتاتا ہوا تھا۔ جیسے وہ سب جانتی تھی۔

قیس ٹھٹک گیا تھا۔ کہیں وہ اس کی زی کی طرف متوجہ ہونے والی کوششوں کی بھنک تو نہیں پا گئی تھی۔؟

"کیا کہنا چاہ رہی ہو تم؟" وہ آتشی بھٹی کی طرح سلگتا ہوا مقابل آ گیا تھا۔ دونوں ہی آمنے سامنے کھڑے تھے

"بات پھیلے گی تو دور تلک جائے گی۔"

وہ گنگناتی ہوئی وہاں سے نکل گئی تھی۔ بجی آنکھوں میں کرب لیے برتن سمیٹ رہی تھی۔ وہ بائیک کی چابی اٹھا کر باہر نکلا تھا تو تب ہی پیچھے پیچھے ٹفن تھامے کلثوم باہر آ گئی تھیں۔

"ٹفن لیتے جاؤ بیٹا۔"

وہ کلثوم کو دیکھ کر رک گیا تھا۔ کلثوم چپ رہ کر بھی جیسے بول رہی تھیں۔ وہ ہولے ہوتے [illegible] کران [illegible] آیا تھا۔

"مجھے معاف کر دیں۔ مجھے شاید بہت پہلے ہی آپ کو سب سچ سچ بتا دینا چاہیے تھا۔ آپ جانتی ہیں ناکہ مجھ میں اور عذرا میں بہت فرق ہے۔ سوچ میں۔ زندگی گزارنے کے انداز میں۔ کوئی بھی مماثلت نہیں ہے ہم دونوں میں۔"

کلثوم نے آنکھ اٹھا کر اسے دیکھا۔ جو نفع نقصان کی طرح ناپ تول کر جملے بول رہا تھا۔ اونچے قد کا وہ جوان لڑکا جس کو انہوں نے دن رات کاٹ کر جوان کیا تھا۔ جس کو دیکھنے کے لیے انہیں سر اٹھانا پڑتا تھا۔

بھیگی آنکھیں شیفون کے دوپٹے سے صاف کرتے ہوئے وہ جیسے بمشکل بول پائی تھیں۔

"میں نے تو کبھی فرق نہیں رکھا بیٹا، اپنی تینوں اولادوں میں۔ باقی جانتی ہوں رشتوں میں دل کی مرضی نہ ہو تو نہیں جوڑنے چاہئیں۔ پیوند تو ٹاٹ میں لگتے ہیں۔ رشتوں میں تو جوڑ لگتے ہیں۔ یہاں تو بات جوڑ توڑ سے بھی کہیں آگے نکل گئی ہے۔ خیر۔ تم آرام سے دفتر جاؤ۔ ایک دو روز تک حالات معمول پر آ جائیں گے۔"

مدھم لہجے میں آنسو صاف کرتے ہوئے اور ٹفن بائیک پر لٹکا کر کلثوم واپس پلٹ رہی تھیں

"کیا پکایا ہے آج چچی؟"

"تمہاری پسند کے کریلے گوشت ہیں۔ رات بھی تم نے نہیں کھائے تھے تو ٹفن میں رکھ دیے ہیں، دفتر میں کھا لینا۔" ہدایات دیتے سر ہلاتے ہوئے وہ واپس پلٹ گئی تھیں۔

کھڑکیوں کے پاس کھڑی بجی کے ہونٹ آج بھی آیت الکرسی پھونکنا نہیں بھولے تھے۔ وہ ٹفن سیٹ کرتا ہوا بائیک لے کر نکل گیا تھا۔

جیسے ہی عذرا پلٹی تھی سامنے ہی کھرپی لے کر ٹنکو کھڑا تھا۔

"بہت برے ہیں ناں قیس بھیا۔"

"نہیں۔ وہ تو بہت اچھے ہیں۔ بری تو میں ہوں۔"

ٹنکو کو یہ بات ذرا بھی پسند نہیں آئی تھی۔ وہ تیزی سے بجی کی طرف آیا۔

"نہیں۔ نہیں۔ آپ تو بہت اچھی ہیں۔ پیاری بھی۔ آپ فکر مت کریں کہ آپ سے کوئی بھی شادی نہیں کرے گا۔ میں ہوں ناں۔"

وہ یقین دہانی عذرا کو ہنسا کر رہ گئی تھی۔

"سچ میں؟ تمہاری اماں مجھے بہو بنانے پر راضی ہو جائیں گی کیا؟"

"ہاں ناں۔ بالکل ہو جائیں گی۔ وہ بیمار ہیں اسپتال سے آ جائیں گی تو میں بات کروں گا۔"

وہ بردبار سا شخص بنا ہوا اپنا پروپوزل اداس لڑکی

کے سامنے رکھ رہا تھا۔

بجی نے اس کے بال بگاڑے تھے۔

"ابھی تم بہت چھوٹے ہو ٹنکو۔ کمبخت دل کے معاملات سے انجان۔ اللہ تمہیں کسی ایسے صدمے کے حوالے نہ کرے کبھی۔"

وہ وہیں صوفے سے ٹیک لگائے بیٹھی رہی تھی۔ کسی بھی کام کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ اماں اور مہر نے بھی اسے وہیں بیٹھا رہنے دیا تھا۔ دل کی چوٹ بھرنے میں وقت لیتی ہے۔ آہستہ آہستہ دھیرے دھیرے کھرنڈ جمتے ہیں۔ مگر دل کے خسارے اور زیاں کا احساس دل کے کسی چور خانے میں پھر بھی زندہ رہتا ہے!!

☆☆☆

اطلس بدمعاش پہلی بار محبوب کے در پر آیا تھا۔ ماتھے پر پسینے پھوٹ پڑے تھے۔ بار بار ہاتھ مسلتا تھا۔

پورے پچیس سے تیس منٹ وہ دستک کے لیے پر تولتا رہا تھا اور پھر دھیرے سے وہ دستک دروازے سے ہوتی ہوئی اماں سے کسی بحث میں الجھی ہوئی مہر تک پہنچی تھی اور وہیں وہ بحث ادھوری چھوڑ کر ٹھہری گئی تھی۔

چند ہی لمحوں کے بعد وہ دروازے کے پاس موجود تھی۔ اس نے دھیرے سے پوچھا۔

"کون ہے۔؟"

اطلس کا دل دھڑک دھڑک گیا تھا۔ وہ سامنے آتی تھی تو احترام سے نظریں زمین سے لپٹ چمٹ جاتی تھیں۔ اب بولی تھی تو بدمعاش کے پسینے چھوٹ گئے تھے۔

"میں ہوں۔"

وہ ہلکی سہمی اور زیادہ گھبرائی ہوئی آواز مہر تک پہنچی تھی تو اس نے دھیرے سے در وا کر دیا تھا۔

وہ سامنے ہی کھڑا تھا۔ نظریں چراتا ہوا۔ جیسے آنکھ اٹھائے گا تو پتھر ہو جائے گا۔

اطلس نے جھٹ سے پھل فروٹ والا تھیلا آگے بڑھایا۔

"یہ لے لیں جی۔ آپ کے لیے"

مہر نے ہاتھ آگے نہیں بڑھایا تھا۔ وہ سامنے کھڑے لڑکے کو سر سے لے کر پاؤں تک بغور دیکھ رہی تھی۔ تھوڑا بہت گھور بھی رہی تھی۔

"تمہارے کان کی بالی کہاں گئی؟۔"

اطلس کے کان اس دھاتی بالی سے آزاد تھے۔ جو اکثر وہ پہنے ہوئے کستوری محلے کے تھڑوں پر نظر آیا کرتا تھا۔

"جی۔ وہ تو اتار کر پھینک دی ہے۔" اس نے معصومیت سے آگاہ کیا تھا۔

"کہاں پھینکی ہے؟" اگلی پریشان نظر آئی۔

"گلی کے کوڑے دان میں"۔ وہ مزے سے بتا رہا تھا۔ مہر کو اس کے دماغی توازن پر تھوڑا شک ہونے لگا تھا۔

وہ جیسے کسی طالب علم کی طرح اپنی استانی کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا۔

"اور تمہارا وہ مفلر کہاں ہے؟ جو تمہارے گلے کی زینت بنا ہوتا تھا؟" اسے اب نئی فکر لاحق ہوئی تھی۔

"وہ بھی اتار کر پھینک دیا ہے"۔ وہ مزید معصومیت سے بتا رہا تھا۔

مہر شدید حیران نظر آتی تھی۔ وہ تو واقعی کوئی پاگل اور دیوانہ نظر آتا تھا۔

"کیوں کیا ہے تم نے یہ سب؟" اب پوچھ پڑتال اس نے شروع کر دی تھی۔

پہلی بار وہ آنکھیں اٹھی تھیں۔ چار ہوئی تھیں۔ محبت کے چشمے تھے جو ابل ابل کر گرتے تھے۔

"آپ کی وجہ سے۔ آپ کو یہ سب اچھا نہیں لگتا تھا ناں۔"

ایک پل کو لگا تھا کہ گھر کے صحن میں بجی کے بوئے گئے سورج مکھی کے بیج پھوٹ پڑے تھے۔ اندر سے اماں کی آواز آئی تھی۔

digest library.com

"کون آیا ہے مہر؟"

"اماں۔ مہمان آیا ہے۔"

"تو اندر لے آؤ۔ باہر کیا سوال جواب لینے کھڑی ہو گئی ہو۔"

مہر ایک طرف ہٹ گئی تھی۔ وہ چپ چاپ کھڑا رہا تھا۔ جیسے اسے اس اعزاز کی توقع نہ تھی۔

"میں۔ اندر۔ کیسے؟"

"مہمان ہو تم۔ مہمانوں کی عزت کی جاتی ہے۔ بیٹھک میں بٹھایا جاتا ہے۔ چائے شربت سے تواضع کی جاتی ہے۔"

وہ جیسے ہنس کر بول گئی تھی۔

وہ دھیرے سے سر ہلاتا ہوا اندر آیا۔

"اماں کیسی ہیں اب؟"

"بہتر ہیں۔ گھر لے آیا ہوں۔ کشمیرن بوا ہیں ان کے پاس۔ میں نے سوچا آپ کا شکریہ ادا کر آؤں اور مینا ٹنکو کو بھی لے آؤں۔ دونوں نے بہت تنگ کیا ہو گا ناں آپ کو۔"

مہر نے پلٹ کر گھور کر اسے دیکھا تھا۔ دونوں بیٹھک میں داخل ہو گئے تھے۔ وہ سامنے کرسی پر سمٹ کر بیٹھ گیا تھا۔ ہاتھ میں تھاما ہوا پھل فروٹ کا تھیلا بھی سامنے رکھ دیا تھا۔

"شکریہ اپنے پاس رکھو۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں"۔

کچھ دیر بعد اماں کلثوم کی معیت میں مینا ٹنکو بھی وہیں آ گئے تھے۔ دونوں دوڑ کر بھائی سے لپٹ گئے۔

وہ شدت سے دونوں کے ہاتھ اور پیشانی چوم رہا تھا۔ اطلس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ کلثوم نے غور سے اس لڑکے کو دیکھا۔

بال تازہ تراشے ہوئے دکھائی دیتے تھے جیسے ابھی حجام کی دکان سے آ رہا ہو۔ کانوں میں پہنی گئی بالی کے نشان ابھی بھی تازہ تھے۔ قمیص کے کف بند تھے۔ خود پر عطر چھڑک کر آیا تھا۔ بیٹھک میں مردانہ خوشبو پھیل گئی تھی۔

"تمہاری اماں کیسی ہیں اب۔؟"

رسمی سلام دعا کے بعد اماں نے پوچھا اور وہ تفصیل سے انھیں بتانے لگا۔ بار بار نظریں چراتا تھا۔ وقفے وقفے سے محبت پاش نظریں بہن بھائی پر ڈالتا تھا۔

تب ہی چائے کی ٹرے سجائے نجی کے ساتھ مہر اندر داخل ہوئی تھی۔ ٹنکو اطلس کی گود میں گھسا جا رہا تھا۔

"آپ کو پتا ہے نجی باجی بہت اچھی ہیں۔ آپ سے بھی زیادہ اچھی۔"

وہ ہولے سے مسکرایا تھا۔ مہر نے ٹنکو کو گھورا تھا

"کل تک تو میں سب سے اچھی تھی۔ اور آج نجی باجی کیسے سب سے اچھی ہو گئیں۔"

مہر نے چائے بنا کر پیش کی تھی۔ وہ چائے کا کپ تھامے چھوٹی چھوٹی چسکیاں لیتا رہا تھا۔ کلثوم نے ایک بار بھی اسے مہر کو گھورتے نہیں دیکھا تھا۔

"کیا کرتے ہو تم؟ کوئی کام وام؟"

کلثوم نے پہلا سوال کیا تھا۔ نجی اور مہر کی نظریں آپس میں ٹکرائی تھیں۔

"جی۔ اب سے شروع کروں گا۔"

"کتنا پڑھے لکھے ہو؟"

"جی۔ بارہویں پاس ہوں۔"

"کلرک تو لگ ہی جاؤ گے۔ ذرا ہاتھ پیر مارو۔ بیمار ماں کا ساتھ ہے۔ چھوٹے بہن بھائی ہیں ان کا بھی مستقبل بھی سنور جائے گا۔"

"جی۔ ضرور۔ کوشش کروں گا۔"

کلثوم کو محلے والوں کے سارے القاب جھوٹے لگے تھے۔

سامنے بیٹھا ہوا وہ لڑکا کہیں سے بھی تو بدمعاش، لوفر اور آوارہ نظر نہیں آتا تھا۔

اس بار کلثوم نے سنبھل کر اپنی دونوں بیٹیوں کو دیکھ کر سوال داغا۔

"اماں تمہاری بیمار رہتی ہے۔ بہن بھائی کو بھی دیکھ بھال کی ضرورت ہے۔ تو میرا مشورہ ہے کہ شادی کر لو"۔

چائے کا آخری گھونٹ حلق میں پھنسا تھا۔ اسے ایک دم اچھو لگا تھا۔ مہر کو کھانسی ہونا شروع ہو گئی تھی۔ گجی نے بمشکل مسکراہٹ چھپائی تھی۔

لوفر نے پہلی بار گڑبڑا کر سامنے بیٹھی ہوئی مہر کو دیکھا۔ مہر نے روٹھے روٹھے انداز میں اماں کو دیکھا۔

"ایسے کیسے شادی کرلے۔ ابھی عمر ہی کیا ہے اس کی۔ پہلے اپنی تعلیم مکمل کرے گا۔ بے شک پرائیویٹ پڑھ لے ساتھ کوئی چھوٹی موٹی نوکری کر لے۔ بعد میں تعلیم پوری کرنے کے بعد کوئی بڑی نوکری کر کے بڑا آدمی بن جائے۔"

وہ مہر کے خواب تھے۔ وہ اطلس کی تعبیر تھے۔

وہ بس بول رہی تھی۔ وہ بس دیکھ رہا تھا۔

عذرا نے دونوں کو دیکھا تھا اور پہلی بار عذرا عرف گجی کو خبر ہوئی تھی کہ ایک بار مہر نے [illegible] کہا تھا۔

"محبت ہو تو دکھائی دیتی ہے۔ محبت ہو تو سنائی دیتی ہے۔"

اطلس کی محبت دکھائی دیتی تھی۔

مہر بختیار کی محبت سنائی دیتی تھی۔

گھاٹے میں صرف عذرا بختیار رہی تھی۔ اس کی محبت تو گونگی بہری تھی۔ جس کے پاس بولنے کے لیے زبان نہیں تھی اور نہ ہی سننے کے لیے کوئی سماعتیں۔

☆☆☆

نیلم ریسیپشن پر بیٹھی ہوئی للی کے خوشبودار پھولوں کی خوشبو سانسوں میں اتار رہی تھی۔ زمان نے اسے یہ بکے ہر روز بھجوانا معمولات میں فرض کر لیا تھا۔ ابھی بھی وہ مسکراتے ہوئے زمان کو شکریہ کا ٹیکسٹ ٹائپ کر رہی تھی۔ جب زرناب زمان سخت غصے کے عالم میں دفتر میں داخل ہوئی تھی۔ ہیل کی کھٹ کھٹ سے دفتر کا فرش گونج رہا تھا۔ اس کے انداز و اطوار سے بھی لگتا تھا جیسے وہ سخت غصے کے عالم میں وہاں آئی تھی۔

پچھلے کچھ عرصے میں وہ پل پل موڈ بدلتی تھی۔ زمان اور زینت کی زندگی کے سارے مسئلے ان کی اولاد کے سامنے آئے تھے۔ ابھی بھی وہ سخت غصے اور طیش کے عالم میں نیلم کے سر پر پہنچی تھی۔

دفتر کے مین دروازے سے باہر کی ڈیلی گیشن کے مہمانوں کو لے کر قیس اندر داخل ہو رہا تھا۔ سامنے ہی زمان صاحب بھی چلتے ہوئے آ رہے تھے۔ تبھی سارے میں ایک زوردار تھپڑ کی گونج سنائی دی تھی۔ زرناب کے مارے گئے تھپڑ نے نیلم کو اپنی جگہ سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ زرناب زور زور سے چیخ رہی تھی۔

"کیسی لڑکی ہو تم۔ کیا ملے گا تمہیں کسی کا گھر برباد کر کے۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں تم جیسی لڑکیوں کو۔ دولت کے لیے کر رہی ہو ناں تم یہ سب۔ یہ لو۔ یہ بھی لو۔ کتنی دولت چاہیے تمہیں۔ سب رکھ لو۔"

زی نے اپنے ہینڈ بیگ کی زپ کھول کر نوٹوں کی گڈیاں نکال نکال کر نیلم کی طرف اچھالنی شروع کر دی تھیں۔

آس پاس کا سارا منظر جیسے فریز ہو گیا تھا۔ سارا سٹاف ہکا بکا کھڑا تھا۔ نیلم کے چہرے پر بے عزتی کے احساس سے سرخی چھا گئی تھی۔ زمان دوڑ کر وہاں پہنچا تھا۔

"پاگل ہو گئی ہو تم۔"

"ہاں۔ پاگل ہو گئی ہوں میں۔ اور میری ماں کو بھی۔ آپ نے اس لڑکی کے ساتھ مل کر ہماری زندگی برباد کی ہے۔"

"جسٹ شٹ اپ۔ ہوش میں آؤ۔ کیوں تماشا بنا رہی ہو [illegible] اور میرا بھی۔"

"تماشا تو آپ بناتے آئے ہیں ڈیڈ۔ ہمارا۔ ہمارے خاندان کا [illegible]"

"ابھی کے ابھی جاؤ تم یہاں سے۔ گھر جاؤ۔ ڈرائیور۔ ڈرائیور۔"

زمان چیخ چیخ کر ڈرائیور بلا رہا تھا۔ زرناب کی نظر للی کے پھولوں والے بکے پر پڑی تھی۔ اس نے وہ بکے اٹھا کر فرش پر دے مارا تھا۔ للی کے پھول دور دور تک بکھر گئے تھے۔ زرناب جیسے غرائی تھی۔

"آپ بھیجتے ہیں ناں ہر روز اس کو فلاور بکے۔ آج تک آپ نے میری ماں کو تو کوئی پھول نہیں بھیجے۔ آپ نے تو اپنی ویڈنگ اینورسری بھی بھلا دی۔ آپ ایسا کیسے کر سکتے ہیں ڈیڈ۔ کیسے

وہ بھی اس دو ٹکے کی لڑکی کی خاطر۔ آخر کیا رشتہ ہے آپ کا اس کے ساتھ۔؟"

وہ چیخ رہی تھی۔ اونچا اونچا بول رہی تھی۔ لہجہ رندھ گیا تھا۔ آنسو لکیر کی صورت بہنا شروع ہو گئے تھے۔

قیس آس پاس لگنے والی بھیڑ کو ہٹا رہا تھا۔

تب ہی نیلم ڈیسک سے نکل کر ٹشو سے منہ سے بہنے والا خون صاف کرتی ہوئی سامنے آئی تھی۔ زرناب کے مارے گئے تھپڑ نے اسے کافی نقصان پہنچایا تھا۔ منہ سے نکلنے والا خون۔ عزت نفس پر لگنے والی چوٹ۔!

"میں بتاتی ہوں تمہیں کہ ہمارا کیا رشتہ ہے۔ یہی جاننا چاہتی ہو ناں تم۔"

زرناب شاک کی کیفیت میں تھی۔ نیلم پلٹ کر سامنے آئی تھی۔ زمان جیسے ٹھہر گیا تھا۔ نیلم کو باز آنے والی نگاہوں سے دیکھا۔

"نیلم۔ مت کرو۔ خاموش رہو۔"

نیلم نے زمان کا ہاتھ پرے جھٹکا تھا۔ للی کے پھول نیلم کے جوتوں سے کچلے گئے۔ دفتر کے لوگ تماشائی تھے۔

"بیوی ہوں میں زمان کی۔ نکاح کیا ہے ہم دونوں نے۔"

دفتر کی سیلنگ جیسے زرناب زمان عرف زی پر گری تھی۔ وہ پورے قد سے گری تھی۔ حواس ساتھ چھوڑ رہے تھے۔ سارا وجود کانپنا شروع ہو گیا تھا۔

"جھوٹ۔ جھوٹ بول رہی ہو تم۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔"

وہ طیش سے اٹھی تھی۔ اس نے نیلم پر تھپڑ برسائے تھے۔ زمان نے جھٹکے سے زرناب کو نیلم سے دور کیا تھا۔ زرناب حواسوں میں نہیں تھی۔ وہ ڈیسک سے جا لگی تھی۔

"ٹھیک کہہ رہی ہے نیلم۔ بہت ہو گیا۔ بیوی ہے یہ میری۔ تمہاری ماں نے اور تم نے مجھے مجبور کیا ہے یہ سب کرنے پر۔ اور مجھے کوئی پچھتاوا نہیں ہے اس فیصلے پر۔ مجھے لگتا ہے کہ ہم تینوں کے لیے بہتر ہوگا کہ جو فیصلہ میرے لیے بیس سالوں سے مشکل تھا اسے آج اور ابھی آسان کر لیتا ہوں۔"

زمان کو سب بھول گیا تھا۔ رشتے ناتے۔ دنیا دفتر۔ لوگ سب کچھ۔!!

وہ مرد تھا۔ غیظ و غضب میں پڑا ہوا۔

سامنے نیلم جیسی ترغیب دیتی ہوئی عورت تھی۔

جس کی ایک ہی رٹ تھی کہ آر یا پار؟

نیلم یا پھر زینت؟

دور تالاب والے گھر میں ایک للی کا جوڑا ڈوب گیا تھا۔

سب حیران تھے۔ ایسا کیسے ہو سکتا تھا؟

زینت نے فون کان سے لگایا تھا۔

دفتر کے تماش بینوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔ نیلم کے چہرے پر فاتحانہ چمک تھی۔

زمان کی زبان سے سرسراتے ہوئے سانپ جیسے جملے نکلے تھے۔ جنہوں نے تالاب والے گھر کی مالکن کو ڈس لیا تھا۔

"میں زمان ملک پورے ہوش و حواس میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔ طلاق دیتا ہوں۔ طلاق دیتا ہوں۔" زمان کا لہجہ سخت سے سرد ہوتا گیا۔

آس پاس کھڑے لوگ سرعت سے وہاں سے غائب ہو گئے تھے۔

نیلم نے زمان کا بازو تھاما تھا اور ہیل کی ٹک ٹک سے زی کے دل پر نشان کھبوتی ہوئی باہر نکل گئی تھی۔

تالاب والے گھر میں بیٹھی زینت سر پیٹ رہی تھی۔ رو رہی تھی۔ کرلا رہی تھی۔

قیس دوڑتا ہوا زی تک پہنچا تھا۔ زرناب زمان ڈیسک سے دفتر کے فرش پر منہ کے بل گری تھی۔ زی قیس کے بازوؤں میں جھول گئی تھی۔ قیس ایمبولینس کو کال کرنے کے لیے چیخ رہا تھا۔

رشتوں کے جوڑ عجیب جگہ پر آ کر ٹوٹ گئے تھے۔

رشتے پل صراط ہوتے ہیں۔ ایک جھٹکے سے ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں

ہائے ہائے زرناب۔ وائے وائے زرناب!

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

☆☆

صباحت رفیق

ادھوری محبت

یہ پیرس کی ایک کہر آلود شام تھی۔ سردی کی خنکی میں لپٹی ہوئی، جیسے کوئی یاد کسی رگ میں جا ٹھہری ہو۔ دریائے سین کے کنارے زرد روشنیوں کی لمبی قطاریں لمحہ لمحہ پانی کے بہاؤ میں ایسے لرزتی تھیں... جیسے یادیں دل کے کسی گوشے میں ہلکورے لیتی ہوں۔

عمار اور ماہرہ، چپ چاپ ساتھ چل رہے تھے۔ بیچ میں خالی فاصلہ تھا، جسے کبھی ہاتھوں نے پاٹا تھا اب خاموشیوں نے گھیرا تھا۔

"تمہیں کچھ کہنا ہے؟" عمار کی آواز نرم تھی، مگر اس کے اندر کوئی تھکن ٹوٹ رہی تھی، جیسے کسی خواب کے ٹوٹنے کی آواز ہو۔

ماہرہ رکی، اس کی سانسیں ذرا تیز ہوئیں۔ وہ آہستگی سے بولی، جیسے لفظوں کو لبوں تک آنے میں بھی ہچکچاہٹ ہو۔ "ہاں... شاید آخری بار۔"

دونوں ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔ خاموشی ان کے بیچ یوں اتری، جیسے پیرس کی فضا بھی ان کے درمیان سے گزر رہی ہو — بے آواز، مگر محسوس ہونے والی۔

ماہرہ نے آسمان کی طرف دیکھا۔ بادلوں میں چاند چھپا ہوا تھا، جیسے اس کے دل کی بھی کوئی خواہش دل ہی میں کہیں چھپی بیٹھی ہو۔

"تم جانتے ہو عمار؟" اس نے اپنی نظریں چاند کی اوٹ سے ہٹائے بغیر کہا۔ "محبت کبھی مکمل نہیں ہوتی، بس مکمل محسوس ہوتی ہے۔ ہم اسے پوجتے ہیں، جیسے کوئی مقدس حقیقت ہو، لیکن سچ تو یہ ہے کہ محبت انسانوں میں ہوتی ہے۔ اور انسان مکمل نہیں ہوتے۔"

عمار نے دھیرے سے کہا، آواز اس کے اندر گونجی۔ "میں تمہیں کبھی پوری طرح نہیں سمجھ سکا، ماہرہ۔ شاید... میں تم سے تمہاری کمزوریوں کے ساتھ محبت نہیں کر سکا۔ میں چاہتا تھا کہ تم وہ بنو، جو میرے دل میں بسا ہوا ایک خیال ہے۔"

ماہرہ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس نے تھوڑی دیر کے لیے اپنی پلکیں بند کیں اور پھر دھیرے سے کہا۔

"اور میں... میں تمہیں ایک سائبان سمجھتی رہی۔ خود سے بچی، خوف زدہ، تمہارے بازوؤں میں چھپنے والی... میں بھول گئی تھی کہ مرد بھی بکھرتے ہیں۔"

☆☆☆

ان کی شادی کو ایک سال گزر چکا تھا۔ دو ملک، تین بار شفٹنگ، ماہرہ کا ابھی تک اولاد نہ ہونے کا ڈپریشن، عمار کی نوکری کا تناؤ... زندگی ایک تھکا دینے والا اسفر بن چکی تھی۔

ایک وقت تھا، جب وہ اکٹھے رات کو کافی بناتے، چھت پر بیٹھ کر پیرس کی روشنیوں میں خواب بنتے تھے۔ مگر پھر وقت بدل گیا۔

دونوں نے ابتدا میں بہت سمجھوتے کیے، لیکن رفتہ رفتہ وہ چھوٹے سمجھوتے بھی زخم بننے لگے۔ عمار چاہتا تھا کہ وہ دونوں ہر رات ایک ساتھ کھانا کھائیں — وہ اس ایک وقت کو دن بھر کے فاصلے کم کرنے کا ذریعہ سمجھتا تھا۔ مگر آفس سے واپسی میں اکثر دیر ہو جاتی۔

ماہرہ ہر شام دسترخوان پر خاموشی سے بیٹھی اس

digest library.com

کا انتظار کرتی، بھوک کے ساتھ، تنہائی کے ساتھ۔ ایک روز وہ تھک ہار کر صرف اپنے لیے کھانا منگوا بیٹھی — اور اتفاق سے عمار اس دن جلدی آ گیا۔

ماہرہ نے فوراً اس کے لیے بھی کھانا الگ کر دیا کہ مل کے کھا لیتے ہیں لیکن عمار نے اس بات پر اتنا غصہ کیا کہ وہ اس کے بغیر ماہرہ بھی کچھ نہیں کھاتا تو وہ کیوں اکیلی اس کی غیر موجودگی میں کھا رہی تھی۔

یہ بات ماہرہ کے دل سے نہیں نکلی کہ اس نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ وہ بھوک سے نڈھال تھی، اگر اکیلے منگوا کے کھا لیا تو کیا غلط کیا؟ جبکہ اس کے آنے میں ابھی بھی تین گھنٹے باقی تھے۔

لیکن نجانے اسے کیا ہوتا جا رہا تھا کہ وہ بدلتا جا رہا تھا۔ اب تو اس کی صفائی کے طریقے پر بھی اعتراض کرنے لگا، یہاں تک کہ وہ یہ کہنے لگا۔

"تمہیں کچھ بھی ٹھیک سے نہیں آتا۔"

جب ماہرہ کوئی کام کرتی، وہ ٹوک دیتا، "ایسے نہیں، ایسے کرو۔"

اور ماہرہ کے دل میں ایک صدا گونجتی رہتی — "اگر تم نے سب کچھ خود ہی کرنا ہے تو مجھے کیوں چنا تھا؟"

ماہرہ چاہتی تھی کہ گھر کی صفائی، ستھرائی، گھر کو سنوارنا، عورت کی ذمہ داری ہوتی ہے اس میں مرد کو مداخلت نہیں کرنی چاہیے مگر عمار کی مسلسل مداخلت نے اس سے وہ احساسِ ملکیت بھی چھین لیا۔

بات چھوٹی چھوٹی الجھنوں سے بڑھ کر، ایک

دوسرے سے خفا رہنے تک پہنچ گئی۔اور پھر وہ دونوں ہی تھک گئے۔

"میں سارا دن تنہائی سے لڑتے تھک جاتی ہوں، تم میرے لیے وقت نہیں نکالتے، عمار!" ماہرہ نے چیختے ہوئے کہا، آنکھوں میں نمی اور دل میں گلہ۔

"اور میری کام کر کے سارا دن کمر ٹوٹ جاتی ہے، تم میری تھکن کم کرنے کے بجائے اسے مزید بڑھا دیتی ہو، ماہرہ!"

عمار نے تھکے ہوئے لہجے میں پلٹ کر جواب دیا، جیسے وہ ہر دن کے اختتام پر خود کو ملبے میں دبا محسوس کرتا ہو۔

پھر... دن گزرتے گئے، یہ نوک جھوک روز کے جھگڑے میں بدلی، اور پھر بیچ میں ایک بے رنگ خاموشی حائل ہو گئی۔

آج... وہ لمحہ تھا جہاں دونوں نے فیصلہ کر لیا تھا۔

طلاق کا فیصلہ!

☆☆☆

"میں نے وکیل سے بات کر لی ہے..."

ماہرہ نے سر جھکا کر دھیرے سے کہا، جیسے اعتراف کرتے ہوئے اس کا دل ٹوٹ رہا ہو۔ "طلاق کے پیپر آج آ گئے ہیں۔ بس سائن کرنا باقی ہیں۔"

یہ سن کر عمار نے گہری سانس لی، پلکیں جھپکیں اور وقت جیسے لمحہ بھر کو ساکت ہو گیا۔

"کیا واقعی؟ ہم یہاں تک آ گئے؟" اس کی آواز میں بے یقینی تھی، جیسے وہ کسی بھیانک خواب سے بیدار ہو گیا ہو۔

"ہاں... ہم وہ بن گئے ہیں جو صبح کے بعد چائے کا کپ ادھورا چھوڑ دیتے ہیں۔" ماہرہ کی آواز میں خالی پن تھا، جیسے وہ سب کچھ کہہ کر بھی خالی رہ گئی ہو۔

عمار ہلکا سا مسکرایا، مگر آنکھیں نم تھیں۔

"پتا ہے ماہرہ، تم ہمیشہ میری راتوں کی وہ دعا رہی ہو، جو میں نیند سے پہلے مانگتا تھا۔"

اس کی مسکراہٹ میں ایک شکست خوردہ محبت تھی، جو وقت کے ہاتھوں ہار گئی تھی۔

ماہرہ نے آنکھیں موند لیں، لب تھرتھرا گئے۔

"اور تم... میری بارش میں بھیگی صبح کی پہلی کرن تھے۔"

تب ہی ان کی باتیں سنتی ایک بوڑھی فرانسیسی عورت آہستہ آہستہ قدم رکھتی ان کی طرف آئی۔

"معاف کیجیے گا، کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟"

اس نے نرمی سے کہا، جیسے وقت کی کوئی گواہ، اچانک اس لمحے کا حصہ بننے آئی ہو۔

دونوں نے بیک وقت اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ خاموشی سے بیٹھی، اور آسمان کی طرف دیکھ کر بولی۔

"محبت کو بچانے کے لیے اکثر انا قربان کرنی پڑتی ہے۔"

ماہرہ اور عمار نے ناسمجھی سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں بھی کبھی کسی سے یوں ہی ناراض ہوئی تھی، اور پھر..." اس کی آواز رک گئی، آنکھیں بھیگ گئیں۔ "پھر؟"

عمار نے نرمی سے پوچھا۔

"وہ میرے واپس آنے کا انتظار کرتا رہا... لیکن وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا۔" اس کی آواز میں وہ خالی پن تھا جو عمر بھر کے پچھتاوے میں اتر آتا ہے۔

"مطلب؟"

ماہرہ نے دھیرے سے پوچھا۔

"وہ میرا انتظار کرتے کرتے... اس دنیا سے دوسری دنیا چلا گیا۔ میں نے بہت دیر کر دی... میں نے بہت دیر کر دی۔" وہ عورت نم آنکھوں کے ساتھ آخری جملہ دہراتے ہوئے وہاں سے اٹھ کر چل دی۔

ماہرہ نے اس ابدی جدائی کا سوچ کر خوف

سے جھرجھری لی۔ عمار نے ہاتھ بڑھایا، اور ماہرہ کا گود میں رکھا ہاتھ نرمی سے چھوا۔

"ابھی بھی وقت ہے، ماہرہ۔ تم چاہو تو ہم... واپس پلٹ سکتے ہیں۔" اس کی آواز میں وہ امید تھی جو ٹوٹے خوابوں میں بھی جھانکتی ہے۔

ماہرہ نے آنکھیں بند کرلیں، پلکوں کے نیچے لرزتی نمی کو چھپاتے ہوئے۔

"واپس تو سب پلٹ سکتے ہیں، عمار... مگر کیا ہم اپنی انا کو پیچھے چھوڑ سکتے ہیں؟"

"محبت میں انا نہیں ہوتی، بس کمیونی کیشن کی کمی ہوتی ہے۔ اور ہم دونوں نے بات کرنا چھوڑ دیا تھا۔" عمار نے ماضی کے کرب کو لفظوں میں سمیٹا۔

"کیونکہ ہم ایک دوسرے کو سننے کے بجائے، ایک دوسرے کو بدلنے لگے تھے۔" ماہرہ کی آواز جیسے آئینہ بن گئی ہو۔

دونوں کی نظریں ملیں، وقت ایک لمحے کے لیے تھم سا گیا۔

"تو کیا... ہم اپنے رشتے کو ایک اور موقع دے کے دیکھیں؟" عمار نے نرمی سے پوچھا۔

"ایک شرط پر..." ماہرہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"کیا؟" عمار نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔

"کہ تم مجھے میرے ادھورے پن کے ساتھ قبول کرو گے۔"

عمار نے مسکرا کر اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔

"اور تم مجھے، میرے خاموش دکھوں کے ساتھ؟"

ماہرہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ دونوں ایک عرصے بعد کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔

چاند اب بادلوں سے باہر آ چکا تھا۔ دریا کے پانی پر چاندنی تھرکنے لگی تھی۔

☆☆☆

گھر آ کر ماہرہ نے اپنے سارے کاغذات، وہ پیپرز جن پر "ڈائیورس" کا لفظ درج تھا، شعلے میں پھینک دیے۔ عمار اسے دیکھ رہا تھا، لبوں پر خاموش تحسین۔

"تم کچھ کہو گے نہیں؟" ماہرہ نے پلٹ کر پوچھا، آنکھوں میں ہلکی سی شرارت اور ایک گہری سنجیدگی۔

"کہوں گا... زندگی میں پہلی دفعہ تو تم نے کوئی ڈھنگ کا کام کیا ہے۔ آج اس کا مکمل خراج تحسین پیش کروں گا، اگر تمہاری اجازت ہوئی تو۔" عمار نے مسکرا کر جواب دیتے آخر میں اپنی آنکھ دبائی۔

ماہرہ ایک دم اس کی طرف بڑھی، اور پہلی بار کئی مہینوں بعد، اس نے عمار کے سینے سے لگ کر رونا شروع کر دیا۔

"میں تھک گئی تھی، عمار!" اس کی سسکیوں میں برسوں کی تھکن سموئی ہوئی تھی۔

"تم [illegible] ہے۔" عمار نے نرمی سے کہا، اور اپنی بانہوں میں اس کے وجود کو سمیٹ لیا۔

ماہرہ نے اپنا سر اٹھا کے بھیگی آنکھوں کے ساتھ اسے محبت سے دیکھا۔ عمار نے اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو صاف کیے۔

"ماہرہ، محبت کوئی ڈراما نہیں، یہ ایک طویل عبادت ہے۔ جس میں سجدے تھکن سے بھرے ہوتے ہیں، مگر ثواب... دائمی سکون ہوتا ہے۔"

ماہرہ کے چہرے پر روشنی اتر آئی۔ اسے یہ بات سمجھ میں آ گئی تھی۔

"کیا ہم دوبارہ وہ کافی بنا سکتے ہیں؟ ٹیرس پر بیٹھ کر... بس تم اور میں... اور بیرس؟" اس نے مسکرا کر پوچھا۔

عمار نے ہنستے ہوئے سر ہلایا۔

"ہاں، لیکن اس بار... کافی میں ایک چمچہ محبت زیادہ ہوگی۔"

وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

☆☆

digest library.com

ثنا زیبا الطاف ہاشمی

digest library.com

سکینہ چاچی کے آنے کی دیر تھی اور رمشا کے آنسو تھے کہ سارے بند توڑ کر بہہ نکلے نہ سوچا نہ سمجھا سارا دل کا حال کہہ ڈالا۔ جب کوئی سننے والا ملتا ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے ہم نہیں جانتے کہ سامنے والا کون ہے پھر بھی بہت کچھ کہہ جاتے ہیں۔

"آنٹی جیسا ظالم اس دنیا میں کوئی دوسرا نہیں ہوگا بھی اپنے کپڑے پریس کرواتی ہیں۔ بھی سسر جی کے اور تو اور نند جی کا روز کا دوپہر کا کھانا بھی یہیں سے جاتا ہے چاچی، میرا تو دل توڑ دیا میری ساس نے۔ کسی کی بچی کو چلوا پنی بیٹی نہ سمجھو تو کم از کم انسان ہی سمجھ لو۔ مجھے تو کسی نے انسان ہی نہیں سمجھا۔ کل مما کو کال کی تو کہنے لگیں آہستہ آہستہ وہ تمہیں سمجھیں گے اور تم انہیں سمجھو گی تو مسائل حل ہوں گے۔ ہر گھر کے اپنے طور طریقے ہوتے ہیں، گھر کو" اپنا گھر" بنانے میں وقت لگتا ہے۔"

رمشا کے ہونٹ کانپتے اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ کوئی کوئی دل ہوتے ہیں، جو بہت نازک ہوتے ہیں سادہ بھی اور معصوم بھی رمشا کا دل تو بہت ہی سادہ اور مانوس تھا اور ایسے دلوں کا اس چلتر دنیا میں کوئی کام نہیں ہوتا۔

"نہ بیٹا تمہاری ماں کو کیا پتا دنیا داروں کا! صبر کرتے کرتے بھلے بندے کی جان نکل جائے۔"

سکینہ نے دوسرا بڑا بسکٹ اٹھا کر بڑے چائے کے مگ میں ہلکا سا ڈبویا، گری چیک کی اور چھوٹے دہانے کے منہ میں رکھ لیا۔ تنگ سی پیشانی، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، خشک اور بنجر تھیں۔

"کل تو حد ہی ہو گئی نند صاحبہ کا سوٹ بھی استری کروایا مجھ سے اور پھر ان کے دوپہر کے کھانے کے لیے سلاد تک کٹوا لی۔ کیا میرا دوپہر سونے کو جی نہیں چاہتا۔ کاٹ کاٹ کے پیاز آنکھیں سرخ ہو گئیں میری اور پھر جب کھیرے کاٹنے تو کہنے لگیں کہ "رمشا بیٹا، آدھے سے زیادہ کھیرے تو تم کھا گئی ہو۔" اب کوئی ایک آدھ میں نے بھی کھا لیا تو کون سا حشر برپا ہو گیا۔" اس کے حلق میں آنسو پھنس گئے تھے بولنا محال ہو رہا تھا۔" کتنا چھوٹا منا سا دل ہے آنٹی کا۔ یہ بات سچ ہے کہ مجھے ٹماٹر اور کھیرے پسند ہیں مگر جب بھی یہ دونوں آئٹم گھر سے ختم ہوتے ہیں آنٹی مجھے ہی شکی نظروں دیکھ رہی ہوتی ہیں۔"

اتنا کہہ کر اس کے آنسوؤں میں تیزی آ گئی تھی اور سکینہ کے چائے پینے میں بھی۔

یہ سچ ہے کہ بہو کبھی بیٹی نہیں لگ سکتی۔ مگر ایک اچھا انسان کہیں بھی اپنی جگہ بنا لیتا ہے۔ ایسا ہی بہوؤں کے لیے بھی ہے کہ وہ اگر اچھی ہوں گی تو ہر جگہ چاہی جائیں گی۔ اگر سسرال والے نہیں بھی چاہیں گے تو اللہ تو ضرور ہی ساتھ دے گا۔ اور یہی بات رمشا نے نہیں سمجھی۔

ساجد اس سے پیار کرتا تھا اور پیار میں ایسے چھوٹے موٹے امتحان تو آتے ہی ہیں۔ نند ایک دن کھانا لے جائے گی۔ دو دن بنوا لے جائے گی مگر ایک نہ ایک دن اپنے گھر پکائے گی ہی اور رہی کپڑے پریس کرنے کی بات جب انھوں نے اپنا پلا پلایا بیٹا گھر سمیت تمہیں دیا ہے۔ تو نند کے کپڑے بھی پریس نہ کرو گی۔ ہو کیا جائے گا اتنے سے کام میں؟

مگر سکینہ اس وقت اس کے کان میں کھسر پھسر کر رہی تھی جو رمشا مسکرا مسکرا کر سنے جا رہی تھی ایک آگ تھی سکینہ کے اندر جو رمشا کے اندر اس نے انڈیل دی تھی۔

☆☆☆

"رمشا! ایک کپ چائے۔" آنٹی نے اپنے کمرے سے ہی آواز لگائی تھی۔

آج سستی بہت تھی اور کام والی نے بھی شاید چھٹی کر لی تھی باہر اچھا خاصا سویرا اچیل رہا تھا مگر رمشا کی طرف سے جواب غائب تھا۔

"رمشا! ساجد چلا گیا؟" انہوں نے اٹھ کے چپل پہنی اور سیدھی بیٹے کے کمرے میں آ گئیں جہاں چپس کے کافی سارے ریپر بکھرے ہوئے تھے۔ اور چاکلیٹ بار بھی کھا کر ڈسٹ بن میں پھینکنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ رمشا بیڈ پر بے خبر پڑی سو رہی تھی۔ صبور خاتون کو اتنا اندازہ تو ہو ہی گیا تھا کہ وہ جاگ رہی ہے بس سوتی بننے کی کوشش کر رہی ہے۔

"لاپروا لڑکی۔ چلو خیر میں اپنا ناشتا بنا لیتی ہوں۔ یہ اپنا بنا لے گی۔ پہلے تو فوراً جواب دیتی تھی آج سوتی بن گئی۔"

فریج سے مٹن نکال کر پریشر کوکر میں پکانے رکھ دیا تھا۔ کہ دوپہر کو ہادیہ آتی ہوگی۔ اس کا بیٹا بیمار تھا اسے لے کر ہاسپٹل جاتی تو واپسی پر کھانا ماں کے گھر سے لے جاتی۔ بچے چھوٹے تھے اور میاں اسلام آباد میں ہوتا تھا تو ماں کے گھر سے ہی آسرا تھا

جاتا۔ شرکو خون کی شدید کمی تھی۔ آنکھوں کے گرد حلقے اور دن بدن سوکھتا جارہا تھا۔ ہادیہ شدید پریشان تھی اس کے لیے۔

دوپہر بھی عجب سے حلیے میں آئی اور چپ چاپ ادرگرد دیکھنے لگی۔ اسے کھانے میں سلاد پسند تھی تو مجبور خاتون نے فریج میں سے کھیرے نکالنے چاہے جو رمشا پہلے ہی نمک لگا کر کھا گئی تھی۔ پہلے ایک آدھ کھائی تھی اور آج سارے ہی اکٹھے کھا لیے۔ بات ساری احساس کی ہوتی ہے جب رمشا کو احساس ہی نہیں تھا تو کچھ کہنے سے کیا فائدہ۔ انہوں نے کچھ نہیں کہا بس چپ ہو گئیں۔

شام ساجد لے اس کی فیورٹ آئس کریم دے کر خاموشی سے چلا گیا۔

"آج نہ کسی نے کپڑے استری کروائے نہ سلاد کائی.......واہ سکینہ چاچی۔"

ابھی واہ کی ہی تھی کہ مما کی کال آ گئی انہوں نے رمشا کی خوب کلاس لی۔

"تم ایسی تو بالکل نہیں تھیں۔ سچ سچ بتاؤ کس نے تمہیں ایسا کرنا سکھایا۔ اچھے خاصے گھر کے پرسکون ماحول کو خراب کر کے رکھ دیا۔"

رمشا کو بتانا ہی پڑا کہ وہ سکینہ چاچی تھیں۔ جن سے مشورہ لیا تھا، دل کا حال کہا تھا۔

"تمہیں پتا ہے رمشا، ایک مثبت سوچ کا مالک انسان ہی صحیح مشورہ دے سکتا ہے، وہ سکینہ جیسی عورتیں جن کا ذہن منفی ہی سوچ رکھتا ہے تمہیں شر پسندی کے سوا اور دے ہی کیا سکتی ہے؟ اس کے گھسے نے دماغ میں جو تھا وہی اس نے تمہارے دماغ میں ڈال دیا۔ اور تم نے وہ زہر اپنے گھر میں پھیلا دیا۔ دیکھو میری جان، اس نے تو اپنے شوہر کے ساتھ نباہ کیا ہی نہیں۔ خود بھی اپنی ان ہی حرکتوں کی وجہ سے طلاق لے کر بیٹھ گئی۔ وہ کیا جانے شوہر سے وابستہ لوگوں کو کیسے برداشت کرتے ہیں۔ سسرال میں کیسے کبھی خاموش تو کبھی بولنا پڑتا ہے۔ تم تھوہر کے درخت سے عرقِ گلاب کی توقع کر رہی ہو۔ بیٹے تو نے گھر میں رہنے والی بدحال عورت جو زندگی سے کچھ حاصل نہیں کر سکی۔ جس کی ہر کوشش بےکار گئی وہ تمہیں کیسے درست مشورہ دے سکتی ہے۔"

مما کو سکینہ پر بےحد غصہ آ رہا تھا جاہل عورت نے رمشا کو بھی جاہل بنا دیا۔ اب رمشا خاموش اور نادم تھی۔

"پتا ہے میری جان جو لوگ اپنی زندگی اپنے ہاتھوں برباد کرتے ہیں اس طرح کے لوگوں سے دور رہنا چاہیے۔ ان کے پاس مایوسی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ وہ صرف اندھیرے پھیلا سکتے ہیں۔ روشنی ان کے پاس کبھی نہیں ہوتی۔ جاؤ اور فوراً ساس سے معافی مانگو اور گھر کا ماحول خوش گوار رکھو۔ ان کا مسئلہ پیسہ نہیں ہے۔ ان کا مسئلہ جذباتی سہارا ہے۔ چھوٹا سا بچہ ہے۔ وہ بیمار ہے اور تمہیں ذرا شرم نہیں آئی۔ میں نے تمہاری یہ تربیت نہیں کی تھی!"

رمشا نے فون رکھ دیا تھا اور سوچ رہی تھی کہ ہمارے والدین سے زیادہ اس دنیا میں ہمارا کوئی خیر خواہ نہیں ہو سکتا۔ مائیں بیٹیوں کا ہمیشہ بھلا ہی چاہتی ہیں۔

سامنے سے آنٹی چلی آ رہی تھیں۔

"سوری آنٹی۔ صبح میرا بی پی لو تھا تو میں نے کھیرے کھا لیے۔"

"کوئی بات نہیں بیٹا۔"

پھر رمشا نے آنٹی کے کہنے سے پہلے ہی ہادیہ جو تقریباً اسی کی ایج کی تھی کا لنچ باکس تیار کر دیا تھا۔ سلاد میں کھیرے تو نہیں تھے مگر چقندر، ٹماٹر، پیاز، لیمن وغیرہ۔ باقی سارا کچھ تھا۔

ماحول آہستہ آہستہ معمول پر آ رہا تھا۔

شکر ہے کہ مما کی کال آ گئی ورنہ تو سب برباد ہو جانا تھا۔ گیٹ کی کی ہول سے اس نے سکینہ چاچی کو آتے دیکھا تو فوراً ہی پیچھے ہٹ گئی۔

"برباد لوگ بربادیوں کے سوا کسی کو کچھ نہیں دے سکتے۔ میں ان سے اب کبھی مشورہ نہیں لوں گی۔"

☆☆

فیس سیرم مختلف اجزاء سے بنا ہوتا ہے جو جلد کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے خاص طور پر منتخب کیے گئے ہیں۔ یہاں کچھ عام اجزاء کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

ہائیلورونک ایسڈ: خشک جلد کی نمی کو بڑھانے اور ہائیڈریٹ کرنے میں مدد کرتا ہے۔ اور جھریوں کو کم کرتا ہے۔

ریٹینول: جلد کی تشکیل کو میں مدد کرتا ہے اور جھریوں کو کم کرتا ہے۔

پینتھنول: جلد کی نمی کو برقرار رکھتا ہے اور جلد کی بحالی میں مدد کرتا ہے۔

نیاسنامائیڈ: جلد کی چمک کو بہتر بناتا ہے اور داغ دھبوں کو کم کرتا ہے۔ آئلی، پگمنٹیشن، ہائپر پگمنٹیشن سب کے لیے بہترین ہے۔

وٹامن سی سیرم: اینٹی آکسیڈنٹ کے طور پر کام کرتا ہے۔ جلد کی چمک کو بڑھاتا ہے اور داغ دھبوں کو کم کرتا ہے۔ ایکنی والے اس کو استعمال نہیں کریں۔ یہ دن میں لگانا بہتر ہے۔

فیس سیرم کے استعمال کا طریقہ

چہرہ صاف کریں: سب سے پہلے اپنے چہرے کو ایک اچھے کلینزر سے صاف کریں تاکہ جلد کی سطح پر موجود گندگی اور چکنائی دور ہو جائے۔

ٹونر لگائیں: اگر آپ ٹونر استعمال کرتے ہیں، تو اسے کلینزر کے بعد لگائیں۔ یہ جلد کے مساموں کو تنگ کرتا ہے اور سیرم کے جذب ہونے میں مدد کرتا ہے۔

سیرم کی مقدار لیں: اپنی انگلیوں پر دو تین قطرے لیں اور چہرے اور گردن پر ہلکے ہاتھوں سے لگائیں اسے اوپر کی طرف سے لگانے کی کوشش کریں تاکہ جلد کی چمک میں بہتری آئے۔

موئسچرائزر لگائیں: سیرم کے بعد اپنی جلد کی ضروریات کے مطابق ایک اچھا موئسچرائزر استعمال کریں تاکہ نمی بند نہ ہو۔

یاد رکھیں سیرم کو روزانہ صبح اور شام استعمال کرنا بہترین نتائج کے لیے موزوں ہے۔

گھریلو سیرم

وٹامن سی سیرم: 50ml ناریل کا تیل یا بادام کا تیل۔ ایک چائے کا چمچ چقندر پاؤڈر، ایک کھانے کا چمچ آملہ پاؤڈر، ایک چائے کا چمچ شتاوری پاؤڈر، ایک چائے کا چمچ پوشیرا یا ونیور پاؤڈر، ایک چٹکی ہلدی۔ 10ml تلسی کا تیل۔ ناریل کے تیل کو ہلکا سا گرم کریں اور چوبیس گھنٹوں کے لیے اس میں تمام خشک اجزاء ملا کر رکھ دیں پھر اس میں آخر میں تلسی کا تیل ملائیں۔ اور چھان کر شیشے کی بوتل میں بھر لیں۔ دو قطرے روزانہ چہرے پر لگائیں۔

ریٹینال سیرم: بکوچی آئل کے پانچ قطرے ایک کھانے کے چمچے ایلوویرا جیل میں ملائیں کچھ قطرے روز ہپ (Rose hip) آئل کے ملائیں اور رات کو لگائیں۔

ہائیلورونک ایسڈ: فریش ایلوویرا جیل ایک پتے میں سے نکالیں اور اس میں ایک چائے کا چمچہ شہد کا ملائیں اور روزانہ رات کو لگائیں۔

ایکسفولیشن: ایکسفولیشن کے لیے کچا دودھ دو کھانے کے چمچے اور پانچ قطرے لیموں کا رس ملائیں اچھی طرح ملائیں۔ کاٹن سے چہرے پر دس منٹ کے لیے لگائیں۔ اور ہلکے گرم پانی سے صاف کریں۔

گرمی کا سیرم: روز آئل پانچ کھانے کے چمچے، پانچ کھانے کے چمچے عرق گلاب، دو کھانے کے چمچے اورنج آئل، چار دو سو گرام کے وٹامن E کے کیپسول۔ ان کو اچھی طرح ملائیں۔ ایکنی ہو تو تین قطرے ٹی ٹری آئل کے ملا لیں، اس کو ایک رات کے لیے رکھ لیں۔ اس کو میک اپ سے پہلے لگائیں بہت اچھی فنشنگ آتی ہے بیس کی۔

سستا سیرم: ایک چمچہ تل کا تیل، ایک چمچہ کھوپرے کا تیل چار لونگ، ایک چمچہ باجرہ اور گیہوں۔ ان سب کو چولہے رکھ کر پکائیں۔ ابال آجائے تو چھان لیں۔ پھر اس میں ایک cocotangy کیپسول ملا لیں۔ سیرم کو ہمیشہ شیشے کی بوتل میں رکھیں۔

☆☆

digest library.com

ریڈ ساس پاستا

اجزاء:

میکرونی	تین سو گرام (ابال لیں)
شملہ مرچ (کٹی ہوئی)	ایک کپ
گاجر (کٹی ہوئی)	ایک کپ
گوبھی (کٹی ہوئی)	ایک کپ
سویا ساس	ایک کھانے کا چمچہ
سرکہ	ایک کھانے کا چمچہ
بون لیس چکن (ابال لیں)	آدھا کلو
نمک	حسب ذائقہ
چکن تندوری مسالا	ڈیڑھ کھانے کا چمچہ
چکن تکہ مسالا	ڈیڑھ کھانے کا چمچہ
پانی	ایک کپ
پسی کالی مرچ	ایک کپ
کیچپ	ایک چائے کا چمچہ
تیل	آدھا کپ

ترکیب:

ایک برتن میں تیل گرم کریں۔ اب اس میں شملہ مرچ، گاجر، سویا ساس، سرکہ اور نمک شامل کر کے اچھی طرح مکس کر لیں۔ اور پانچ منٹ پکائیں۔ ابلی ہوئی چکن میں تندوری مسالا، تکہ مسالا، لال مرچ اور کالی مرچ شامل کر کے اچھی طرح مکس کر لیں۔ اس میں ایک کپ پانی شامل کر کے اور کیچپ شامل کر کے تھوڑی دیر پکنے دیں۔ اس کے بعد میکرونی شامل کر کے اچھی طرح ملائیں اور پھر گرم گرم پیش کریں۔

☆☆

ٹوئسٹ کسٹرڈ

اجزاء:

بریڈ سلائس	چھ عدد
ونیلا کسٹرڈ پاؤڈر	تین کھانے کے چمچے
پانی	آدھا کپ
چینی (کریمل کے لیے)	ایک چوتھائی کپ
دودھ	آدھا کلو
چینی	پانچ کھانے کے چمچے

ترکیب:

آدھا کپ پانی میں کسٹرڈ اچھی طرح ملائیں۔ بریڈ سلائس کے بلینڈر میں چورا بنا لیں۔ کیک کے پین میں کریمل کی چینی ڈالیں اور ہلکی آنچ پر رکھ دیں۔ چمچہ نہیں چلانا۔ جیسے ہی براؤن کلر آئے پین کو چولہے سے ہٹا لیں اور پین کو ہلا کر کریمل بنا لیں۔ ایک پین میں دودھ ڈالیں اور اس میں کسٹرڈ ملا لیں پھر اس میں تھوڑا تھوڑا کر کے بریڈ کا چورا ڈالیں، چمچہ مستقل ہلاتے رہیں۔ جب آمیزہ گاڑھا ہو جائے تو چینی ملا دیں۔ چینی تھوڑی دیر پکائیں اور پھر کریمل والے پین میں کسٹرڈ ڈال دیں اور تھوڑا سا شیپ کریں۔ ایک بڑے برتن میں پانی ابالیں۔ اس میں اسٹینڈ رکھ کر کسٹرڈ کا پین رکھ کر ڈھک دیں اور بیس سے پچیس منٹ تک بیک کریں۔

☆☆

یہ مون سون کی بارشیں ......!

بہار کے بعد گرمی کا موسم آتا ہے۔ اس موسم میں سورج کی تپش بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔

سخت گرمی کے بعد مون سون کی بارشوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے تو لوگ اپنی تمام تکالیف بھلا کر رحمت خداوندی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

لیکن اس بات کو بھی مد نظر رکھنا چاہیے کہ اس بارش سے کئی طرح کی بیماریاں بھی جنم لیتی ہیں۔ مثلاً اس موسم میں آپ کی اسکن پر خارش، Viral Fever، ڈینگی، یرقان جیسی بیماریوں میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ آپ اس موسم میں جراثیم کو خود سے دور رکھیں۔ کچھ ایسی احتیاطی تدابیر اور ٹوٹکے آپ کو بتانے جا رہے ہیں، جن سے آپ ہر بیماری سے دور رہ سکتے ہیں۔

☆ ابلا ہوا پانی اس موسم کا لازمی جز ہے اور ابلے ہوئے پانی کو زیادہ دن نہ رکھیں۔ جلد استعمال کریں۔ اس موسم میں کیڑے مکوڑے زیادہ نظر آتے ہیں۔ ان سے بچنے کے لیے لوبان کی یا لیسن گراکی دھونی دیں۔

☆ جو سبزیاں پتوں والی ہوں، ان کو اچھی طرح سے دھو کر استعمال کریں۔

☆ مون سون میں ملیریا بہت عام بیماری ہے۔ اس کے لیے بہت آزمودہ نسخہ بتاتی ہوں۔ تلسی کے پتے 8-10 عدد ایک کپ پانی میں ابال کر قہوہ بنا کر پینا ہے۔ دن میں ایک بار استعمال کریں۔

☆ ہرمل بیج کی دھونی دیں۔

☆ لیموں کے خشک چھلکے 5-6 پیس لیں اور پاؤڈر بنالیں اور اس میں معمولی سا نمک ملا کر ایک چائے کا چمچ صبح وشام پانی سے لے لیں۔

☆ یرقان جیسی بیماری بھی اس موسم کا حصہ ہے۔ پپیتا چھلکوں اور بیج سمیت سکھالیں۔ اچھی طرح سکھا کر اس کو پیس کر پاؤڈر بنالیں۔ شہد کے ساتھ صبح وشام ایک چائے کا چمچ استعمال کریں۔

☆ اس موسم میں جلد بھی متاثر ہوتی ہے، جس سے خارش، ایلرجی اور ایگزیما جیسی تکالیف شروع ہو جاتی ہیں، اس کے لیے نسخہ ہے، اللہ نے چاہا تو ضرور فرق ہوگا۔

☆ چرائتہ، دماسہ، ہم وزن لے کر پاؤڈر بنالیں۔ ایک کپ گرم پانی میں ایک چمچ پاؤڈر ملا کر چھان کر پئیں، دن میں 2 مرتبہ۔

☆ نزلہ وزکام اور سینے کے جکڑن کو ختم کرنے کے لیے: سرسوں کے تیل میں لہسن کو جلا لیں، پھر اس میں کلونجی ڈال کر اس کو تھوڑا پکائیں، پھر اسے بوتل میں بھر کر رکھ لیں اور روزانہ اس تیل کو بچے کے سینے پر اور پیر کے تلوؤں پر مالش کریں۔

☆ جسمانی درد کو دور کرنے کے لیے:

سونٹھ آدھا چمچ، گرم دودھ ایک کپ، کالی مرچ چٹکی سے کم، زیتون کا تیل ایک چائے کا چمچ۔ گرم دودھ میں یہ اجزا شامل کر کے پی لیں۔ ان شاء اللہ درد میں فرق محسوس ہوگا۔

سورج کی تپش کی وجہ سے سر میں درد ہوتا ہے۔

سورج کی تپش کی وجہ سے High BP Low BP & ہوتا ہے اور بہت چکر آتے ہیں۔ ایسے افراد جن کا بی پی لو ہوتا ہے، وہ ORS کا زیادہ استعمال کریں۔ ایسے افراد جن کا بی پی ہائی ہوتا ہے، وہ سات کڑی پتہ روزانہ کھائیں صبح نہار منہ اور ثابت دھنیا ابال کر پئیں۔ گرمی میں اکثر بچوں کو ہیضہ کی شکایت ہو جاتی ہے۔ اس کے لیے پودینہ دس پتیاں، بڑی الائچی ایک عدد اور میٹھا سوڈا چاول کے دانے کے برابر ان سب کو ملا کر کھانے کے بعد چبا کر کھائیں۔

☆☆

شعاع عمیر

کرن کرن خوشبو

digest-library.com

القرآن

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

٭ یہ قیامت کے دن (اپنے گناہوں کا) پورا بوجھ اٹھائیں گے اور کچھ بوجھ ان کے (گناہوں کے (جنہیں اپنی جہالت کی وجہ سے گمراہ کرتے ہیں۔ سن لو کیا ہی برا بوجھ اٹھاتے ہیں)

(سورۃ النحل......25)

حدیث نبوی

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"میرے پاس گزشتہ رات خواب میں دو آدمی آئے۔ انہوں نے کہا کہ جسے آپ نے دیکھا کہ اس کا جبڑا چیرا جا رہا تھا وہ بڑا ہی جھوٹا تھا، جو ایک بات کو لیتا اور ساری دنیا میں پھیلا دیتا تھا۔ قیامت تک اس کو یہی سزا ملتی رہے گی۔

(صحیح البخاری 6096)

تکبر

فرعون ٹیکنالوجی اور سائنس میں ہم سے بہت آگے تھے۔ یہ سات ہزار میل سات سو کلو میٹر دور سے ایک کروڑ پتھر مصر لائے۔ ہر ایک پتھر 25 سے 28 سوٹن وزنی تھا۔ یہ دن میں تھا اور یہ پہاڑ سے چوڑائی میں کاٹا گیا تھا۔ یہ پتھر صحرا کے مین درمیان 170 میٹر کی بلندی پر لگائے گئے۔ قدیم مصر آرکیٹیکٹ نے آٹھ ہزار میل ایسا ڈیزائن بنایا جو ہر طرف سے بند بھی تھا۔ لیکن بندش کے باوجود اندر اور ریت کی [illegible] آتی تھی۔ اندر کا درجہ حرارت بھی باہر کے ٹمپریچر سے کم تھا۔ ان لوگوں نے آٹھ ہزار میل لاشوں کو محفوظ کرنے کا طریقہ بھی ایجاد کرلیا۔ یہ خوراک کو ہزار سال محفوظ رکھنے کا طریقہ بھی جان گئے تھے۔ قاہرہ کے علاقے جیزہ کے بڑے اہرام میں تئیس لاکھ بڑے پتھر ہیں۔ ابوالہول دنیا کا سب سے بڑا ون پیس اسٹرکچر ہے۔ اور یہ لوگ جانتے تھے شہد دنیا کی واحد خوراک ہے جو کبھی خراب نہیں ہوتی۔ اہراموں میں پانچ ہزار سال پرانا شہد نکلا اور یہ مکمل طور پر استعمال کے قابل تھا۔

یہ لوگ کمال تھے پر ان میں یہ خرابی تھی کہ یہ تکبر کرتے تھے اور اسی لیے ان لوگوں نے اللہ کو یکتا ماننے سے انکار کیا۔ اللہ تعالیٰ کو تکبر پسند نہیں چنانچہ یہ پکڑ میں آ گئے اور عبرت کا نشان یوں بنے کہ آج تک نشان عبرت ہیں۔

تربیت

تربیت اسے کہتے ہیں۔

ایک عالم نے ایک شاگرد کا واقعہ سنایا جو اپنے استاد کی طرح کسی درسگاہ میں استاد بن گیا تھا۔ استاد بننے کے بعد جب وہ اپنے اس استاد سے ملنے گیا اور اس کو بتایا کہ آپ کی وجہ سے آپ کی طرح میں بھی استاد بنا ہوں۔

استاد نے پوچھا، وہ کیسے؟

اس نے بتایا کہ ایک دن میں نے اپنے ہم جماعت کی گھڑی چرائی تھی، آپ نے دروازے بند کر کے تلاش کا کہا تھا۔ مجھے لگا کہ آج میں پھنس گیا۔ تب آپ نے فرمایا کہ سب آنکھیں بند کر لیں۔ آپ نے سب بچوں کی تلاشی لی ان کی

آنکھیں بند تھیں۔ آپ نے گھڑی میری جیب سے نکالی اور مجھ سے بعد والوں کی بھی تلاشی لی۔ تب میں نے عزت نفس اور زندگی کا سبق سیکھا تھا۔

استاد کی آنکھوں میں اجنبیت دیکھ کر شاگرد نے پوچھا۔ استاد محترم، آپ مجھے کیسے بھول گئے؟

استاد نے جواب دیا، کیونکہ میں نے بھی اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔

زندگی کیا ہے؟

دوستوفسکی	:	جہنم
سقراط	:	یہ مصیبت ہے
ارسطو	:	یہ دماغ ہے
نطشے	:	یہ طاقت ہے
فرائیڈ	:	یہ موت ہے
مارکس	:	یہ مادی جبلت ہے
ڈارون	:	سروائیول کی جدلیات ہے
پکاسو	:	یہ آرٹ ہے
گاندھی	:	یہ محبت ہے
شوپن ہاور	:	یہ تکلیف میں ہے
رسل	:	یہ مقابلہ ہے
اسٹیو جابز	:	یہ ایمان ہے
آئن اسٹائن	:	یہ علم ہے
اسٹیفن ہاکنز	:	یہ امید ہے
کافکا	:	یہ انجام ہے

خصلت

علامہ بن خلدون نے مقدمہ لکھا:

عربی لوگ اونٹ کا گوشت کھاتے ہیں تو ان میں غیرت اور سختی پیدا ہوئی۔

ترکی لوگ گھوڑے کا گوشت کھاتے ہیں تو ان میں درندگی اور طاقت آئی۔

فرنگی انگریز سور کا گوشت کھاتے ہیں تو ان میں بے غیرتی پیدا ہوئی۔

اور سیاہ فام بندر کا گوشت کھاتے ہیں تو ان میں رقص و سرور کا شوق پیدا ہوا۔

ابن قیم رحمتہ اللہ فرماتے ہیں!

ہر وہ شخص جو کسی مخصوص جانور سے مانوس ہے وہ اس کی طبیعت اور خصلت کو اپنا لیتا ہے۔ اور اگر وہ اس کا گوشت کھائے تو یہ مشابہت مزید بڑھ جاتی ہے۔

ہم آج کے دور میں زیادہ تر برائلر مرغی کھاتے ہیں۔ اس لیے ہم نے اس سے چہچہاہٹ (بے معنی بول چال) بزدلی، گردن جھکانا، نہ اڑنا اور زیادہ باتیں کرنا سیکھ لیا ہے۔

سارا دن کرتی کیا ہو؟

جج نے عورت سے پوچھا۔ "تم نے اپنے شوہر کا سر دو حصوں میں کیوں کاٹ دیا؟"

عورت نے کہا: جناب جج صاحب، میں کالج کی سب سے ذہین طالبہ تھی اور وہ میرا ٹیچر تھا۔ اس نے مجھ سے محبت کا دعویٰ کیا اور وعدے کیے کہ میں تمہیں تحقیق کرنے دوں گا۔ تمہیں آگے پڑھاؤں گا۔ ہر چھوٹی بڑی بات میں تمہارا ساتھ دوں گا۔ میں نے دل سے کہا واقعی اللہ بہت مہربان ہے۔

مگر شادی کے بعد نہ مجھے میری تحقیق یاد رہی، نہ خواب۔ سارا دن احمد، محمود، ابراہیم اور فاطمہ کو سنبھالتی رہتی۔ ایمان کو دودھ پلاتی تھی۔ محمود کا ڈائپر بدلتی تھی، احمد کا ہوم ورک کرواتی تھی۔ فاطمہ کو حساب سمجھاتی تھی، بچوں کو چپس بنا کر دیتی تھی۔ رات کے کھانے کے لیے سینڈوچ بناتی تھی، پورا گھر صاف کرتی تھی۔ گندے کپڑے دھونے ڈالتی تھی۔ فریج صاف کرتی تھی۔ پیاز کاٹتی تھی۔ گوشت کو مسالے لگا کر رکھتی تھی۔ کپڑے استری کرتی تھی بچوں کے اسکول بیگ تیار کرتی تھی۔ فاطمہ کی شکایت پر اسکول فون کرتی تھی۔

اور پھر وہ مرحوم صوفے پر بیٹھا خارش کرتے ہوئے انگلیاں چٹخاتا ہوا مجھ سے کہتا، نادیہ یہ تو بتاؤ تم سارا دن کرتی کیا ہو؟

مجھے پتا ہی نہ چلا کہ میں کب ہاتھ میں چھری لیے جو میں نے پیاز کاٹنے کے لیے اٹھائی تھی اس کے سر پر مار کر دماغ نکالنے کی کوشش کی کہ دیکھوں اس کے دماغ میں چل کیا رہا ہے؟"

عدالت میں ایک سناٹا چھا گیا۔ جج صاحب چپ بیٹھے تھے وہ بالکل پتھر سے ہو گئے تھے اصل میں سماعت سے پہلے وہ بھی اپنی بیوی سے فون پر یہی پوچھ چکے تھے کہ یار، تم دن بھر کرتی کیا ہو۔

کسی مرد کو یہ بے وقوفی نہیں کرنی چاہیے کہ اپنی بیوی سے پوچھ بیٹھے تم سارا دن کرتی کیا ہو؟

انمول موتی

☆ایک بیج بغیر آواز کے باہر نکلتا ہے لیکن ایک درخت زبردست آواز کے ساتھ زمین پر گرتا ہے تباہی آواز رکھتی ہے اور تخلیق خاموشی، یہ خاموشی کی طاقت ہے، خاموشی سے جئیں (کنفیوشس)

☆بحث کے دوران پرسکون رہیں کیونکہ لہجے کی تلخی غلطی کو عیب اور سچائی کو بداخلاق بنا دیتی ہے۔

(جارج ہربرٹ)

☆جب جنگ چھڑتی ہے تو لوگ کہتے ہیں یہ ایک حماقت ہے اور یہ زیادہ دیر جاری نہیں رہ سکتی۔ جنگ حماقت تو ہو سکتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ فوراً ختم بھی ہو جائے گی۔ حماقت اپنی مرضی چلانے کی طاقت رکھتی ہے (البرٹ کامیو)

☆"میں ٹھیک ہوں" ایسا تو اجنبیوں سے کہا جاتا ہے جہاں تک ہمارے پیاروں کا تعلق ہے تو ہم انہیں اپنے گلے سے لگا کر روتے ہیں۔

(لیو دوروسٹیفسکی)

خون کی الٹی

کرسمس کے دوران کراچی سے ایک فیملی چھٹیاں منانے کینیڈا گئی ہوئی تھی۔ اس میں ایک جوڑا، ان کے دو بچے اور اس شخص کا باپ بھی شامل تھا۔ انہوں نے مونٹریال جانے کے لیے ایک کار کرائے پر لی۔ ہائی وے 401 پر ایک کینیڈین خاتون ان کے پیچھے ایک کار میں مناسب فاصلے پر تھی۔

اچانک کینیڈین خاتون نے دیکھا کہ سامنے والی گاڑی میں بیٹھا بوڑھے شخص کا سر پچھلی سیٹ کی کھڑکی سے باہر نکلا، اسے خون کی الٹی ہو رہی تھی۔

خاتون نے فوراً 911 پر کال کی۔ بہت جلد ایک ہیلی کاپٹر ایمبولینس نمودار ہوئی۔ چند میٹر آگے اتری۔ کچھ دیر میں تربیت یافتہ عملہ بوڑھے کو اسٹریچر پر ڈال کر ہیلی کاپٹر کی جانب لے گیا۔ مکمل ICU تھا۔ سارا چیک اپ کیا گیا اور آدھے گھنٹے کے بعد اس شخص کو دوبارہ سفر کے لیے فٹ قرار دے دیا گیا۔

ایمرجنسی خدمات کے لیے اس گاڑی والے آدمی کو 2500 کینیڈین ڈالر کی پرچی کاٹ کر دے دی گئی۔ جو شہر پہنچ کر لازمی جمع کروانے تھے۔

صدمے کی حالت میں اس شخص نے اپنے والد صاحب سے کہا۔

"ابا جی! پان کھا کر باہر تھوکنے کی کیا ضرورت تھی؟

دلچسپ معلومات

☆چین میں سب سے زیادہ سونا نکالا جاتا ہے۔

☆یورینیم اور پلاٹینیم دو ایسی دھاتیں ہیں جن کی قیمت سونے سے بھی زیادہ ہے۔

☆دنیا کی سب سے بڑی فوج چائنا کی ہے۔

☆نارتھ کوریا میں نیلے رنگ کی جینز نہیں پہن سکتے۔

☆سوڈیم کو اگر پانی میں ڈالا جائے تو وہ جلنے لگتا ہے۔

☆پاکستان کو سب سے پہلے ایران نے تسلیم کیا تھا۔

☆☆

بشریٰ محمود

یادوں کے دریچے سے

فوزیہ ثمر بٹ کی ڈائری میں تحریر

حبیب احسن کی غزل

فلک سے ٹوٹے ستارے کا دکھ سمجھتے ہو؟
خود کو اپنی ذات سے ہارے کا دکھ سمجھتے ہو؟

شجر لگانے پہ دریا نے ایک بات کہی
تم ہی تو ہو جو کنارے کا دکھ سمجھتے ہو

تمہیں حساب پہ ہے کتنی دسترس لیکن
محبتوں میں خسارے کا دکھ سمجھتے ہو؟

ہمارے ہنسنے پہ تم رو دیے، تو [illegible]
دلوں کو چیرتے آرے کا دکھ سمجھتے ہو

ہمارا اس سے بچھڑنے کا دکھ سمجھ لوگے
سحر سے ڈرتے ستارے کا دکھ سمجھتے ہو؟

پھنسی ہوئی ٹریفک کی بھیڑ میں وہ جہاں
وہاں کے سرخ اشارے کا دکھ سمجھتے ہو؟

فرخندہ سلیم کی ڈائری میں تحریر

احمد فراز کی نظم

اگر یہ سب کچھ نہیں

ملے تو ہم آج بھی ہیں لیکن
نہ میرے دل میں وہ تشنگی تھی

کہ تجھ سے مل کر بھی نہ بچھڑوں
نہ آج تجھ میں وہ زندگی تھی

کہ جسم و جاں میں ابال آ جائے
نہ خواب زاروں میں روشنی تھی

نہ میری آنکھیں چراغ کی لو
نہ تجھ میں ہی خود سپردگی تھی

نہ بات کرنے کی کوئی خواہش
نہ چپ ہی میں خوب صورتی تھی

مجسموں کی طرح تھے دونوں
نہ دوستی تھی نہ دشمنی تھی

مجھے تو کچھ یوں لگا ہے جیسے
وہ ساعتیں بھی گزر گئی ہیں

کہ جن کو ہم لازوال سمجھے
وہ خواہشیں بھی تو مر گئی ہیں

جو تیرے میرے بدن کی حدت
کو آخرش برف [illegible] ہیں

محبتیں شوق کی [illegible]
سے کھائیوں میں اتر گئی ہیں

وہ قربتیں وہ جدائیاں سب
غبار بن کر بکھر گئی ہیں

اگر یہ سب کچھ نہیں تو بتلا
وہ چاہتیں کدھر گئی ہیں

☆☆

digest library.com

کچھ موتی چنے ہیں ...... ادارہ

عاجزی

ملازمت کے ابتدائی دنوں میں مجھے دوسرے بوڑھے پرانے لوگوں کے علاوہ اپنے ایک بزرگ رفیق کار حاجی احمد حسین صاحب سے بڑی مدد ملی تھی۔ حاجی صاحب 1947ء میں اپنی میعاد ملازمت ختم کر چکے تھے، مگر نوزائیدہ مملکت پاکستان کی ضروریات کے تحت انہیں پنشن سے نوکری پر بلا لیا گیا تھا۔ ایک روز دفتر آیا تو اپنے کمرے کی طرف بڑھنے کے بجائے حاجی صاحب کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ سوچا انہیں پوچھتا چلوں۔ کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا حاجی صاحب کاغذ کے ایک پرزے پر اپنا نام خوشخط لکھ رہے ہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی دلچسپی ہوئی۔ حیرانی ہوئی کہ نام لکھنا اور دستخط کی مشق کرنا لڑکوں بالوں اور نوجوان افسروں کا مشغلہ ہے، انہیں اس کی کیا طلب ہو گئی۔

میرے چہرے پر سوالیہ نشان دیکھ کر حاجی صاحب مسکرائے اور بولے۔

"یہ میرا روز کا معمول ہے۔ کام شروع کرنے سے پہلے اپنا نام کاغذ کے ایک ٹکڑے پر لکھ کر اسے ردی کی ٹوکری میں پھینکتا ہوں اور کہتا ہوں لو احمد حسین تم تو گئے ردی کی ٹوکری میں۔ اسی کے ساتھ تمہاری انا، تمہاری خواہشیں، تمہارے تعصبات اور خوف سب ردی برد ہو گئے اب کام شروع کرو بے ریائی، بے غرضی اور احساس فرض کے ساتھ۔"

(محمد ابن الحسن سید...... جام سفال)

روک ٹوک

مرنا حقیقت ہے لیکن اس گٹھڑی کو تو پھینکا جا سکتا ہے یار۔ انسانوں میں رہنا ہے تو سوسائٹی کا حصہ بن کے رہنا ہے۔ معاشرہ کو پابندیاں لگاتا ہے چلو سمجھ میں آتی ہے کہ اس طریقے سے چلیں گے تو ٹھیک گزر جائے گی۔ لیکن وہ روک ٹوک تو ختم کی جا سکتی ہے جو اپنے ہی دماغ کے اندر ہے جس کا شکار ہم زبردستی اپنے آپ کو کرتے ہیں۔ جیسے آپ کا ایک اصول ہے رات دس بجے سو جانا ہے اور صبح چھ بجے اٹھنا ہے۔ اب کوئی فیملی فنکشن ہے یا دوستوں کی پارٹی ہے آپ جتے ہوئے ہیں کہ بھائی تو دس بجے سوئے گا۔ جہاں گل اور آپ غث، اس میں لچک کیوں نہیں ہو سکتی ؟ عادت بنی ہوئی ہے؟ اصول بنا ہوا ہے؟ او کے، تو دوسروں کا کیا قصور ہے جو اس سے متاثر ہوتے ہیں، بیوی، بچے، دوست یار جو آپ کے ساتھ ہلا گلا کرنا چاہتے ہیں تھوڑی دیر جاگ لیں گے تو آپ کی ہار ہو جائے گی؟ سبحان اللہ کیا اصول ہے اور کیسا مقابلہ ہے جو اپنے آپ سے ہے! یہی چیز ہم تھوڑی سے پھیلا لیں تو اسے انا کا نام دیا جا سکتا ہے یعنی اپنے اصولوں کی بانسری بجا کر خود اس پر رقص کرنا ہے اور خود ہی اپنے آپ کو داد دیتی ہے اور اپنی ہی زندگی (بلکہ آس پاس والوں کی بھی) لسی بنا دیتی ہے۔

(حسنین جمال...... داڑھی والا)

سزا

دلوں سے ہجرت کرنے والے اپنا بوریا بستر ساتھ نہیں باندھتے وہ اس امید پر دل سے نکلتے ہیں کہ نئی جگہ پر انہیں پہلے سے بہتر جگہ ملے گی لیکن ہوتا یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو اکثر جھونپڑی ہی میسر آتی ہے جس کی چھت وقفے وقفے سے ہونے والی پچھتاوے کی بارش میں ٹپکتی رہتی ہے۔

واجد ابرار...... آب زدہ

☆☆

مُدیرۂ کرن

نامے میرے نام

فرزانہ امین...... فیصل آباد سمندری

امید ہے کہ تمام قارئین خیریت سے ہوں گے الحمد للہ میں بھی ٹھیک ہوں۔ کرن باقاعدگی سے پڑھ رہی ہوں اور باخدا اب اتنی فرصت نہیں ہوتی کہ تبصرہ کر سکوں۔ اس بار جس شخصیت کی وجہ سے خط لکھ رہی ہوں اس شخصیت کا ذکر کرتے ہوئے میرا دل ود ماغ عجیب کیفیت میں ہے۔ لفظ ساتھ نہیں دے رہے کہ بات کیسے شروع کروں کیسے اپنے غم کو بیان کروں آہ "سائرہ رضا" میری ہر دل عزیز مصنفہ، میرا پسندیدہ ناول "سرسوں کے پھول" کی لکھاری اس دار فانی سے رخصت ہو گئیں۔ یہ بات تسلیم کرنے کو نہ دل مانتا ہے نہ دماغ۔

سائرہ رضا جیسی مصنفہ کا اردو ادب سے بچھڑنا یقیناً بہت بڑے خسارے کا باعث بنا ہے اردو ادب کا ایک حسین شاہکار ہم میں نہیں رہا، یہ بات کافی اذیت ناک ہے۔ سائرہ رضا نے اپنی والدہ کی زندگی پر جو شاندار انداز میں لکھا تھا پڑھ کر ایسا لگا کہ گویا انہوں نے اپنی ماں کی محبت کا حق ادا کر دیا۔

سائرہ رضا کی وفات کا سن کر مجھ سمیت میری بہنیں رنج و غم میں مبتلا ہو گئی تھیں۔ ان کی وفات کا سن کر انٹرنیٹ پہ ان کا مکمل انٹرویو دیکھا تو دل مزید چھلنی ہو گیا۔ آپی کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ ان کے کتنے بچے تھے اور ان کی عمریں کیا ہیں اور ان کے ہسبنڈ میرا خیال آرمی پرسن ہیں (اگر میں غلط نہیں تو) ؟؟؟ اللہ پاک پیاری سائرہ کی مغفرت فرمائے، لواحقین کو صبر جمیل و اجر عظیم عطا فرمائے اور بچوں پر اپنی رحمت کا سایہ عطا فرمائے آمین۔

ایک بہن نے پوچھا تھا کہ سمندری شہر ہے یا ملک؟ تو عزیز بہنا یہ فیصل آباد کی تحصیل ہے اور یہ ایک شہر کا نام ہے...... تقسیم سے پہلے یہاں تین مندر تھے تو اسی نسبت سے "سہ" مندری بن گیا یعنی تین مندروں والا شہر...... بعد میں سمندری کہلایا۔ باقی مکمل ناول اچھے ہیں "تاش گھر" اچھا لگنے لگا ہے باقی تبصرہ پھر کبھی ان شاء اللہ۔

ج: فرزانہ امین ! سائرہ رضا کی اچانک وفات نے سب ہی کو غم زدہ کر دیا ہے۔ وہ نہ صرف ایک اچھی مصنفہ تھیں بلکہ ایک اچھی خاتون بھی تھیں۔ ہنسنے بولنے والی۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے آمین۔

آپ نے ان کی اولاد کے بارے میں پوچھا ہے تو سائرہ رضا کی تین بیٹیاں ہیں اور ان کے شوہر کا آرمی سے تعلق نہیں ہے۔

فرخندہ سلیم...... ملتان

اپریل کے افسانے پر باتیں باقی تھیں تو شازیہ ستار کا عید مبارک افسانہ خاصا دلچسپ تھا جس میں چلتری پھپھو کا آخر میں منہ دیکھنے والا تھا اور ایسے کردار بھی واقعی ہوتے ہی ہیں۔ تنزیلہ آصف کی "محبت اور جنگ" پڑھ کر مزا آیا اور ہیروئن کی خواہش کافی انوکھی تھی جس نے خوب اپنی رقیب کو باولی دلہن تیار کر کے بدلہ لیا اور پھر اس کے کلیجے میں ٹھنڈ پڑی۔ عقیلہ ہاشمی کا افسانہ "سنجوگ" بھی تعمیری موضوع پر تھا اور واقعی نصیب تو اللہ ہی بناتا ہے مگر نسرین جیسی لومڑی صفت عورتیں لڑائیاں کرانے میں استانیاں بنی ہوتی ہیں مگر اس کا کام یہاں نہ چلا اور پھر گھر سے دفع ہو گئی اچھا ہے۔ حنا

خالد محمود کا افسانہ ''قرض'' ٹاپ پر تھا جو بہت ہی بامقصد تھا جس میں بھابھی اور نند کا رشتہ کتنا دیسی گھی کی طرح کتنا اچھا اور خالص دکھایا گیا اور زینب کا کردار مثالی رہا۔ سب ایسا سوچیں تو ساس بہو نند دیگر فساد اور تو تکار کا خاتمہ ہی ہو جائے گا۔

حمیرا شفیع کا افسانہ ''بھابھی'' کافی دلچسپ و مزاحیہ تھا جسے پڑھ کر خوش گوار یت ہوئی اور دوست کا نسخہ کام آ گیا۔

مئی کے شمارے میں تحریروں کی بات کریں کہ پچھلے ماہ بس سلسلوں پر باتیں کی تھیں تو ادھار تھا تبصرہ تو صائمہ نور کا افسانہ ''چائے چاہیے۔'' کافی منفرد مگر دلچسپ انداز میں لکھا گیا تھا۔ منو بے چاری سسرال میں چائے کی ہی منتیں کرتی رہی ویسے افسانہ پڑھ کر مزا آیا کہ میں خود چائے کی [illegible] قسمت ہوں نہ پیوں تو صبح نہیں ہوتی اور نیند [illegible] کے لیے اور ڈائجسٹ پڑھتے ہوئے چائے ہو تو کتنا اچھا لگتا ہے بڑا سا کپ چائے کا۔ شازیہ ستار کا ہلکا پھلکا افسانہ ''سالگرہ مبارک'' پڑھ کر بھی خوش گوار سا تاثر قائم ہوا کہ قدرے منفرد انداز میں شریر سا افسانہ تھا۔ کاش سارے مرد ایسے ہی اپنے بچوں کی ماؤں کو سالگرہ مبارک کہیں اور چھوٹی چھوٹی خوشیوں کا خیال کریں۔ تحریر قانتہ کی ہو اور اصلاحی نہ ہو ایسا ہو ہی نہ جائے تو ''راز زندگی'' نئی سوچ دیتا افسانہ تھا کہ ہمیں ہر حال میں شکر کرنا چاہیے اور واقعی اچھے بچے بھی کسی نعمت سے کم نہیں ورنہ تو اکثر بچے ماؤں کا جینا حرام کرتے ہیں۔ اسما نوشین کا افسانہ ٹاپ پر تھا جو بہت پسند آیا جس میں منتوں سے شوہر کی دو نمبری پر اس کو لعنت دی کہ بیوی کے لیے اور قانون اور اپنی سگے رشتے کے لیے اور قانون بنائے تھے۔ مگر ڈھیٹ نسل کے ہوتے ہیں ایسے شرمندہ ہو کر بھی اپنی غلطی نہیں مانتے ہاں ہم غلط ہیں۔ حفیظہ کنول دین کا ناولٹ ان کے مخصوص خالص انداز میں تھا وہیں دوسرے ملک کی جو منظر کشی کی گئی یہ بہت پسند آئی اور پلاٹ بھی عمدہ تھا۔ اسمانی کا ناولٹ بس ٹھیک تھا جو اکثر اداس سی تحریریں لکھتی ہیں اور معاشرتی سی بھی دیتیں۔

سعدیہ عمیر جن کا خواتین میں سلسلے وار شروع ہوا ہے ان کا طویل ناول ''لویزہ'' طویل تحریروں میں ٹاپ پر تھا کہ الفاظ کی بنت، پلاٹ، مکالمے اور خاص کر ناول جو ہیروئن تھی۔ بہت ہی پیارا تھا بہت خوب۔

اب جون کے شمارے کی یادیں تو جون کے کرن کا سرورق بہت ہی بکواس تھا کہ دل کیا اسے آئی کی جنی ہوئی انگریز ماڈل کا منہ توڑ دوں اور سرورق عید کی مناسبت سے ہونا چاہیے تھا۔ ادارے کو سرورق پر سوچنا چاہیے کہ تینوں شماروں میں سرورق کا معیار بہت خراب ہو گیا ہے سوری۔

اس بار شبنم ثانی تھیں جو اچھی لگیں کہ ساس بہو [illegible] پسندیدہ ہے کہ سسرالی ماحول میں ہم [illegible] کی ہوتی ہے کہ اٹھائیس سال تو شادی کو ہو گئے اور [illegible] سوشل میڈیا سے متعلق اہم پیغام دیا گیا تھا [illegible] اچھا ہو رہا ہے ایمل کو داد ہے [illegible] جواب [illegible] لکھنے کی کہ مجال ہے ایک ماہ بھی جو دلچسپی کم ہوئی ہو ناول کی۔ ایمل اب اس طرح لکھتی رہنا۔ ام طیفور کو میرا اسلام اور محبت جو ''کنوا کر دل و جان'' کو اس قدر عرق ریزی سے لکھا ہے۔ ماضی کا پلاٹ اور دل کرے ہے حرافہ سنبری کے کھانے میں چوہے مار گولیاں ملا دوں۔ ام طیفور کا ایک کرن میں دو قسط کا ناول تھا ''من آ جزم من بے قصم'' جو میرا پسندیدہ ترین تھا جس قدر غضب کی منظر کشی رائٹر نے کی۔

فرح بخاری کی نوریا کے گرد گھیرا تنگ ہو رہا ہے اچھا ہے اسی قابل ہے۔ اور میران کا کردار بہت پسند مجھے ہے۔ فشا محسن علی کا انداز تحریر مجھے بہت پسند ہے کہ منفرد ہے ان کا ناول بھی کافی

digest library.com

دلچسپ ہے جو بہت منفرد سا ہے۔ ام اقصیٰ کا اپنا ہی دلکش سا منفرد انداز ہے اور گل نین کی دکھ بھری طویل کہانی ام اقصیٰ کی زبانی بہت ہی خوب رہی جس میں گل نین کے شوہر کو جہاں دونوں ہاتھوں سے لعنت دی وہیں آخر میں اس کے پوتے کا کردار اور کہانی پسند آئی۔ صائمہ نور کا بھی طویل مکمل ناول اپنے منفرد سے انداز کی وجہ سے بے حد پسند آیا کہ ناول کا نام بہت ہی منفرد سا تھا اور منظر کشی دوسرے ملک کی بہت ہی خوب تھی جسے پڑھ کر لگا میں بھی لیچی کے ساتھ ہوں اور پلاٹ کے اعتبار سے بھی اچھا تھا۔ کرن میں ایسی ہی ڈیسنٹ سی منظر کشی والی رومانٹک تحریریں اچھی لگتی ہیں خیر صائمہ کو تو شعاع میں بھی میں نے بہت پڑھا ہے۔

جون کے شمارے میں نجمی آصف کا افسانہ "یوٹیوب" بہت ہی اصلاحی تھا آج کی نوجوان نسل کے لیے جو ان کم بخت موبائلوں کو ہی ہر مسئلے کا حل سمجھتی ہیں جب کہ اصل چیز تجربہ ہوتا ہے۔ حنا خالد کے افسانے کا ہیرو تو بہت ہی اچھا نیک اور دیسی گھی کی طرح خالص تھا جس نے اپنی مینٹل اماں کو غلط بات پر روکا اور اپنی محبت کو عزت کا آنچل سر پر پہنا دیا خیر اچھا منفرد افسانہ رہا۔ مہوش اسد کا افسانہ "نیت" بہت ہی اہم موضوع پر تھا جو ہر ایک کے لیے ضروری ہے پھر نیت پر ہی اعمال کا دارومدار ہوتا ہے کہتے ہیں نا۔ عنبرین ابدال کا افسانہ بہت ہی پسند آیا جو حقیقت سے کافی قریب تر تھا جس میں مسئلہ اچھے سے حل ہوا اور دونوں بہنوں کو سکون بھی ملا۔ ویسے مجھے عنبرین کے طویل ناولز کا انتظار ہے کہ یہ بھی بہت اچھا لکھتی ہیں۔ افسانہ "قربانی" بھی آمنہ بانو کے قلم سے اہم موضوع پر اصلاحی سوچ دیتا تعمیری افسانہ تھا جو عید کی مناسبت سے بہت اچھا رہا اب باقی سلسلوں پر اگلے ماہ بات کروں گی کہ پہلے ہی تبصرہ اتنا زرا فے جتنا لمبا ہو گیا ہے۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
بہنوں کے لیے خوب صورت ناولز

دل ایک گلشن

رضیہ جمیل

چلمن

نادرہ خاتون

نسیم سحر قریشی

دست کوزہ گر

فوزیہ یاسمین

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے
مکتبۂ عمران ڈائجسٹ
37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

ج: فرخندہ! ٹائٹل عید کی مناسبت سے کیسے دیتے۔ عید کے بھی دس دن بعد قارئین کے ہاتھ میں پہنچ ہوگا۔ گرمی جب تک ہے جب تک سادہ ٹائٹل ہی دیکھنے کو اچھے لگتے ہیں۔

اقصیٰ شہزاد تنہر گنگ

ناول کو دیکھ کے گرمی کا اثر کم محسوس ہوا۔ کہ ناول پسند آئی۔ حمد و نعت کے بعد "تاش گھر" پڑھا کہ "عارف موتی" کا انٹرویو پہلے بھی پڑھ چکے ہیں۔ "تاش گھر" میں جہاں اگلے ماہ آخری قسط نے دل خوش کیا وہیں سانول کی موت نے دکھی کر دیا۔ آپی کیا سانول کو مارنا ضروری تھا؟ ایمن اور رحمانی کو ویسے ہی سبق سکھا دیتیں۔ مطلب کسی اور طریقے سے۔ پتا نہیں کومل اور بسمائی کے ساتھ کیا ہوگا؟ جتنا انہوں نے غلط کیا ہے مجھے نہیں لگتا ان کے ساتھ بھی اتنا غلط ہو۔ شاہ سن کا انجام بھی کچھ اچھا نہیں ہوگا۔ "یوٹیوب" میں تو خود اس خوش فہمی میں تھی کہ جب سر پہ پڑے گی تو نیٹ سے دیکھ کے کرلیا کروں گی۔ اس کا مطلب ہے کھانا پکانا شروع کر دوں۔ اور کشف کی ساس تو پھپھو تھیں۔ کچھ رعایت کر گئیں جبکہ اپنے ساتھ تو کوئی ایسا سین نہیں ہاہاہا..... "گل نین" ام اقصیٰ کا مکمل ناول اچھا تھا۔ گل نین کے ساتھ بہت برا ہوا۔ شوہر تو تھا ہی بے وفا بیٹوں نے بھی اکیلا چھوڑ دیا۔ "اصل میں سود پیارا ہوتا ہے" ایسے ہی تو نہیں کہتے۔ ویسے اینڈ میں ذکی اللہ کو اپنی ماں سے معافی مانگ لینی چاہیے تھی۔ "عزت کا آنچل" افسانہ اچھا تھا۔ حبیبہ تو صائم کو ہی بے وفا سمجھ رہی ہوگی۔ لیکن اسے نہیں پتا کہ صائم نے اس سے کیا ہوا وعدہ ہی پورا کیا ہے۔ "ہمارے مسئلے" ہر گھر کی کہانی۔

"محفل وفا" اف اللہ میں ایسے ہی اظہر کی قسمت پہ افسوس کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ تو بالکل اچھا ہوا ہے۔ لیکن اس کے کیے کی سزا رمشین کو نہ ملے۔ کیا پتا ابراہیم چاچا اس لیے میران کے پاس گئے ہوں۔ میران اور رمشین کے نکاح کے لیے..... ایسا ہو جائے تو اچھا ہے۔ "نیت" مہوش اسد کا افسانہ اچھا لگا کہ مینہ جیسے بھی اوروں کی مدد کر رہی تھی اس کی نیت تو اللہ ہی جانتا تھا۔ "چیری بلاسم" یہ ناول مجھے بہت پسند آیا۔ عمران کا کردار بہت اچھا لگا۔ آپی ایسے رومانٹک ناول دیا کریں۔ گل رخ نے بہت برا کیا خدیجہ کے ساتھ۔ "قیس جنگل میں اکیلا ہے" رومان کے ساتھ زرتاب نہیں عذرا کا جوڑ بنتا ہے...... اور قیس تو ہے ہی لالچی۔ "قربانی" یہ افسانہ بھی اچھا تھا۔ شکر ہے آخر میں خالدہ بیگم کا رویہ زینب کے ساتھ اچھا ہو گیا۔ "کرن کتاب" بیوٹی باکس پسند آیا۔ "اس ماہ کی سبزی" مجھے تو آلو بہت پسند ہیں۔ "کرن کرن خوشبو" پسند آیا۔ "تا ہے میرے نام" ماہ رخ بلند۔ اللہ کا شکر ہے میں بالکل ٹھیک ہوں تم سناؤ۔ اور پیاری بہنا، لوگوں کی باتوں پہ دھیان نہ دیا کرو۔ لوگوں کا تو کام ہی باتیں کرنا ہے۔ جب آپ کے ابو آپ کے ساتھ ہیں تو کس بات کی ٹینشن...... باقی سب کیسی ہیں محاریب حرم دیکم۔ تمہارا نام بہت اچھا ہے کیا مطلب ہے اس کا۔ ثناء آپی السلام علیکم۔ کیسی ہیں آپ ...... کیا مصروفیات ہیں؟ کوشی کنول اپنے بھیجو کو تو میں نے کئی بار دیکھا ہوا ہے۔ میں تو کسی اور کی بات کر رہی تھی (فرخندہ سلیم نہیں آپ کو کیا کہہ کے بلاؤں) اللہ تعالیٰ آپ کو صحت کاملہ عطا فرمائے آمین۔

اقصیٰ شہزاد! کچھ تھوڑا بہت آپ کو پکانا ضرور آتا ہو یا پکاتے دیکھ رکھا ہو جب ہی آپ یوٹیوب سے مستفید ہو سکتی ہو۔ کیونکہ کھانے میں سب کی پسند ایک سی نہیں ہوتی۔ کوئی کم مرچیں کھاتا ہے کوئی زیادہ کسی کو کھٹاس چاہیے ہوتی ہے کوئی کم کھٹاس والے کھانے پسند کرتا ہے۔ تو یوٹیوب سے بھی دیکھ کر بھی آپ کو مرچ مسالے گھر والوں کی پسند کے مطابق ہی ڈالنے ہوتے ہیں۔

☆☆